آثارِ اقبال

حقائق اقبال پر مشہور اہلِ قلم کے مقالات کا

بصیرت افروز مجموعہ

مرتبہٗ

غلام دستگیر رشید

ایم۔ اے (عثمانیہ)

ادارہ اشاعت اردو

حیدرآباد (دکن)

قیمت تین روپیہ
بارہ آنہ کلدار

قیمت چار روپیہ
چار آنہ سکہ عثمانیہ

طبع اوّل ← ایک ہزار

ماہ ستمبر سنہ ۱۹۴۴ء

↓

پروپرائٹر

سیّد عبدالرزاق

مطبوعہ

رزاقی مشین پریس۔ حیدرآباد

(دکن)

فہرست

گزارش	محمد اقبال تسلیم گاہندری	۷
اِقبال کا شاہین زادہ	محمد بہادر خاں مرحوم	۱۴
اقبال کی زندگی	ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم	۱۵
علامہ اقبال کی خدمت میں چند لمحے	" عاشق بٹالوی	۳۵
سر اقبال دے نال میل	حامد علی خاں	۴۵
اِقبال کے علمی جواہر ریزے	پروفیسر خواجہ عبد الحمید	۵۳
یوم اِقبال	مولانا اسلم جیراج پوری	۸۵
ڈاکٹر اقبال	پروفیسر محمد مجیب	۹۱
اقبال (حیات اور شاعری)	پروفیسر عبد القادر سروری	۹۹
کلام اِقبال کا تحلیلی مطالعہ	غلام محمد بی۔ اے (عثمانیہ)	۱۴۹

اقبال اور حدیثِ جبر و قدر	ڈاکٹر میر ولی الدین صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ	۱۶۳
اقبال حضور رسالت میں	سید وحید اللہ وحید	۱۹۳
تعلیمات اقبال	مولانا محمد علی مرحوم	۲۰۳
اقبال در حضور آدم	غلام دستگیر رشید پروفیسر نظام کالج	۲۰۹
فلسفۂ بیخودی	پروفیسر رشید احمد صدیقی	۲۱۳
نظم اقبال پر ایک اجمالی تنقید	محمد مشتاق علی خاں	۲۴۳
اقبال اور وطنیت	شاہد حسین رزاقی ایم اے	۲۹۱
اقبال اور معاشیات	علامہ اقبال رح	۲۹۹
محفلِ میلاد النبی اور اقبال	علامہ اقبال رح	۳۰۵
عقیدۂ توحید اور اقبال	مولانا نذیر الحق	۳۱۰

گزارش

کیا سچی بات کہی تھی علامۂ اقبال نے کہ

"بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"

اہلِ چمن کی اِنتہائی بدنصیبی ہوتی اگر" دیدہ ور کے نغموں کو بھول جاتے۔ لیکن اہلِ چمن نے علامۂ اقبال کے نغموں کو نہیں بھلایا۔ اور شاید کبھی نہیں بھلا سکیں گے۔ اب تک اِقبال کی زندگی اور ان کے افکار پر اِتنا لکھا جا چکا ہے کہ اِقبال کا مطالعہ کرنے والا کئی درجن کتابوں کا محتاج ہو گیا۔ جناب غلام دستگیر صاحب رَشید ام۔ اے لکچرار نظام کالج کا

ہم سب پر احسان ہے کہ انھوں نے ایسے مضامین کو جن کے بغیر اقبال کو اچھی طرح نہیں سمجھا جا سکتا یکجا کر دیا۔

اب ایک کتاب آثار اقبال کے ذریعہ آپ کو تقریباً کئی مشاہیر اہل قلم کے رشحات قلم سے واقفیت ہو سکتی ہے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اب تک اقبال پر اس سے جامع اور مفید کتاب نہیں لکھی گئی۔ انتخاباتِ مضامین کے لیے فاضل مرتب کا نام ضمانت ہے کہ اس میں صرف جواہرات ہیں سنگریزے نہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری کتابیں فکر اقبال اور ذکر اقبال ہیں۔ فکر اقبال میں علامۂ اقبال کے حکمت و فلسفہ کے بنیادی موضوعات پر بلند پایہ مفکرین کے مباحث و مضامین درج ہیں۔

(چوہدری) محمد اقبال سلیم گاہندری

ستمبر ۱۹۴۴ء

شمع کی طرح جئیں بزم گہِ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اَغیار کو بینا کر دیں

اقبالؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حریف بادہ پیما کی یاد میں

حسب معمول ۲۵ر جون ۱۹۴۴ء اتوار کے دن شام کو "بیت الامت" (دولتکدۂ بہادر یار جنگ مرحوم) میں درس اقبال کی حکمت آموز اور دلسوز صحبت جاری تھی "حلقۂ اقبالؒ کے بانی اور حکمتِ اقبالؒ کے شیدائی" قائدِ ملت لسان الامت بہادر خاں مرحوم، جن کی سراپا جہاد زندگی خود۔ ع

"درس او اللہ بس باقی ہوس"

کے مصداق تھی۔

اپنی ہی کو پُراور خذف کو دُر کرنے والی شرکت سے اس بیں ؎

پختہ سازد صحبتش ہر خام را　　　تازہ غوغائے دہد ایام را

کا رنگ پیدا کر رہے تھے۔

جب میں مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق" کی جلال آفریں نظم "حکمتِ کلیمی" کے اِس شعر ؎

مردِ حق افسون ایں دیر کہن　　　از دو حرف ربی الاعلیٰ شکن

سے آگے بڑھنے لگا تو فرمایا "رشید صاحب! یہ مقامات جلد گزرنے کے نہیں ہیں۔ آج یہیں ٹھہر جائیں" میں نے کہا "بہت خوب!"

آہ! کسے خبر تھی کہ یہ "مردِ حق" دو ایک ہی گھنٹوں کے اندر اِس دیر کہن کے افسوں کو توڑ کر اپنا ترانۂ عشق شعر اقبال سناتے ہوئے "ربی الاعلیٰ!" سے جا ملے گا اور تعلیم اقبال کا یہ پیکر عمل اپنے "حریفانِ بادہ پیما کو ؎

غیرتِ او برنتابد حکمِ غیر　　　قصرِ سلطاں در نگاہش کہنہ دیر

کے مظاہرات سے تا قیامت محروم کردے گا!

"آثارِ اقبال" کو اس کی "حکم غیر کو نہ برداشت کرنے والی "غیرتِ حق" اور سراپا پیامِ انقلاب نگاہ کی یاد سے منسوب کرتا ہوں کہ پیرِ مغاں حافظ کا حکم ہے ؎

چو با جیب نشینی و بادہ پیمائی
بیاد آر حریفانِ بادہ پیما را

دلریش
رشید

یارانِ نکتہ دان کے لیے

"رمز آشنائے روم و تبریزؒ" "برہمن زادہ" اِقبالؒ کا کلام ایک بے کراں سمندر ہے جس میں اضطرابِ موج و سکونِ گہر کے "دونوں جہان" جلال و جمال پوشیدہ ہیں۔ اس کا ہر نقش ایک "دلیل راہ" ہے اور اس کا ہر حرف "ایک دفترِ معنیٰ" وہ ایسا صاحبدل ہے جو اِنسان کے "وحدتِ مدّعا" کو بلند اور محکم تر بناتا ہے اور اس مدعا کی تکمیل کرنے والے "حلقۂ آئین" کو مضبوط تر کرتا ہے۔ اس کی "مئے ناب" کے ایک ساغر سے محفل کی محفل رنگین ہو جاتی ہے۔ حکمتِ اِقبال ہر خام کو پختہ بناتی ہے اور زمانہ کو ایک نیا اِنقلاب بخشتی ہے۔ اس کا پیغام "رگ تاک" میں "آگ" اور

"کفِ خاک" میں "جانِ پاک" پیدا کرتا ہے۔ اس کی نظر نگہبانِ فطرت اور اس کا ضمیر خلّاقِ ملّت ہے۔

شعرِ اقبال کا کوئی ایک موضوع لیجیے۔ اس عنوان سے متعلق ان کے مختلف تصوّرات اور احساسات ہیں لیکن ان میں سے سب کے سب یا اکثر ایک ہی جگہ نہیں مِلسکتے۔ مختلف وجوہات اور اعتبارات سے ان احساسات و نظریات کا اظہار مختلف نظموں میں بلکہ اس سے بھی زیادہ مختلف کتابوں میں ہوا ہے۔ اگر ہم کسی ضرورت سے بھی چاہیں کہ ایک ہی موضوع پر ان کے نظریات وحسیات کا یکجا مطالعہ کریں تو مشکل درپیش ہوتی ہے۔ مختلف موضوع سے متعلق منتخب مقالات کی طلب اور ان کی قدر و قیمت ایسے ہی موقع پر محسوس ہوتی ہے۔ گلستان میں بھی "چشمِ تنگ" کثرتِ نظارہ سے وا ہوتی ہے لیکن اپنے اپنے ڈرائنگ روم میں گلدستے بھی "جنتِ نظر" سے کم نہیں ہوتے۔

جس طرح اقبالؒ کا ہر شعر اور ہر خیال ایک تازہ اندازِ نظر پیدا کرتا ہے، اسی طرح ہر اہلِ نظر اپنی اپنی صلاحیت اور مناسبت سے "گلستانِ اقبال" کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور اس کا علم "جلوۂ حیرت" اور اس کا عشق، عمل پر مزید قدرت پاتا ہے۔ اِقبال کے "بادۂ تند" سے اہلِ ذوق نے اپنے اپنے کئی جام بھرے ہیں۔ ہر جام "بعنوانِ نو" پیش کیا ہے۔ کئی کاغذی

میخانے آباد کر رکھے ہیں۔ یہ سالہا سال کے اخبارات اور رسالوں کے اوراق پر پھیلے ہوئے ہیں۔ "حریفان بادہ پیما" کو بر وقت ان کا پتہ نہیں چلتا۔ اہم تالیفات کے ظہور اور قبول کا بڑا سبب یہی ہے۔

جب کبھی کسی پُر مغز اور نفیس مقالہ کا ذکر اہل ذوق سے کیا جاتا ہے تو فوراً سوال ہوتا ہے "بھائی ذرا ہمیں بھی دیکھنے کے لیے دیجیے" اب مرغی اور انڈے کا چکر شروع ہوتا ہے۔ جس نے پڑھا اس مضمون کی خوبی کا بولتا اِشتہار بن گیا۔ جس کسی نے سُنا اس نے مکالمہ کو مطالبہ سے بدلا۔

"آثار اقبال"، "فکر اقبال" یا "ذکر اقبال" جیسی تالیفات کی ترتیب و اِشاعت کا اصلی مقصد اِسی نوعیت کے مطالبات کے ایک وسیع حلقہ کی تعمیل و تکمیل ہے۔

اِس کتاب کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کئی مضمون ایسے ہیں جو آپ کو ترجمانِ حقیقت کی صحبت میں پہنچا دیتے ہیں۔ وہاں آپ ان کے اقوال، ملفوظات ارشادات اور لطائف سے مستفید ہوتے ہیں۔

بزمِ ادب و حکمت میں اس دورِ جام کے آپ تک آنے کی ذمہ داری جناب سیّد عبد الرزاق صاحب اور جناب اِقبال سلیم صاحب گاہندری کے مستعد

ہاتھوں پر ہے ایسے ہی مستعد اشاعتی اداروں کی بدولت
ہم کتنے اہل علم و صاحبانِ قلم کے گروہ سے یکجا ملاقات کر لیتے
ہیں جس کی تعریف حضرت حافظ رح کے الفاظ میں یہ ہے ؎

خوش میدہد نشان جلال و جمالِ یار
خوش میکند حکایت عزو وقار دوست

نیاز کیش
غلام دستگیر رشید
ایم۔ اے

اِقبال کا شاہین زادہ

محمد بہادر خاں مرحوم قائدِ ملت کی وہ تقریر جو انھوں نے ایک سال اپنی زبان بندی کے بعد ۲۱ر اپریل ۱۹۳۹ء کو یومِ اقبال کے موقع پر کی۔

میرے نالے فضائے حیدر آباد سے کچھ اس طرح ناآشنا ہو چکے تھے کہ مجھے یاد بھی نہ تھا کہ آج تقریر کرنی ہے۔ آج سے ڈیڑھ سال قبل علامۂ اقبال کی زندگی میں اقبال کے تصورِ مومن کو پیش کر کے خود ان سے داد حاصل کی تھی اور آج ان کے اِنتقال کے بعد مختصراً اپنا تحفۂ عقیدت ان کی سرمدی اور ابدی دعاؤں کی امید پر پیش کر رہا ہوں۔

اقبال کے پیام کا سب سے نمایاں حصہ مسلمان کی خودی کو بیدار کرنا ہے۔ اپنے

پورے کلام میں انھوں نے اسی چیز کو بہ انداز مختلف پیش کیا ہے۔ اس کے لیے انھوں نے جو تشبیہیں اختیار کیں ان میں سب سے زیادہ نمایاں شاہین اور شاہین زادہ کی تشبیہ ہے وہ جتانا چاہتے ہیں کہ مسلمان کرگس خاکی نہیں بلکہ شاہین بلند پرداز وفضا پیما ہے اقبال کے کلام کا رنگ شاہ بازی سکھاتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ مسلمان کا مقام صحبت مرغ چمن نہیں بلکہ وسعت ارض وسما ہے۔

اِس سلسلہ میں انھوں نے فطرت انسانی کے بہت سے پوشیدہ گوشوں کو نمایاں کیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان جب محنت ومشقت کے بغیر رزق حاصل کرنے لگتا ہے اور اس کا عادی بن جاتا ہے تو اس کی بہت سی ایسی صلاحیتیں اس سے چھن جاتی ہیں جن پر اس کی باعزت انفرادی واجتماعی زندگی کا مدار ہے ان انسانی صلاحیتوں میں سب سے ضروری اور اہم صلاحیت انسان کی شجاعت اور اس کا جذبۂ عزت نفس ہے اور مفت خوری کا اثر سب سے زیادہ اسی صلاحیت پر پڑتا ہے اور شجاعت وبلند ہمتی جبن اور پستی خیال سے بدل جاتی ہے اسی کو اقبال نے اس شعر میں بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر شاہین بچوں کو بھی پابند قفس کر کے عطائے صیاد کا امیدوار بنا دو تو چند روز میں وہ بیٹر کے پر کی پھڑپھڑاہٹ سے بھی لرزہ براندام ہو جائیں گے۔

تنش از سایۂ بال تدروے لرزہ می گیرد

چو شاہین زادۂ اندر قفس با دانہ می سازد

تم غور کرو کہ کیا حیدر آباد کا مسلمان گزشتہ دو سو سال سے اندر قفس با دانہ ساختن کا عادی نہیں ہو گیا ہے اور کیا اسی کا نتیجہ کے طور پر آج اس شاہین زادہ کی روح سایۂ بال تدروے لرزہ براندام نہیں ہے۔

اقبال کے نزدیک آرام و راحت زاغ و زغن کا کام ہے اور قید و صید کی بند شیں قسمت شاہین کی سعادت۔ اور جب تک کوئی ان مرحلوں سے نہیں گزرتا عزت و احترام کے مقام رفیع کو حاصل نہیں کر سکتا وہ کہتے ہیں۔

شہپر زاغ و زغن در بند و قید و صید نیست

کیں سعادت قسمت شہباز و شاہین کردہ اند

انھوں نے مسلمانوں کو ترغیب دلائی کہ کرگس کی دوں ہمتی چھوڑیں اور شاہین کی پرواز اپنے بال و پر میں پیدا کریں۔

پرواز ہے دونوں کی اسی دہر میں لیکن

شاہیں کا مقام اور ہے کرگس کا مقام اور

اقبال کے نزدیک علم و فراست اپنی تمام خوبیوں کے باوجود اس وقت تک بے قیمت ہیں جب تک ان کا حامل تیغ و سپر سے بھی آراستہ نہ ہو ان کے نزدیک شاہین زادگی کی شرط اول مرد غازی کی تیغ و سپر سے موانست ہے فرماتے ہیں کہ ؎

من آن علم و فراست با پرِ کاہے نمی گیرم

کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم
ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

اِقبال کی زندگی

علامہ سر محمد اقبال ۱۸۷۷ء میں بہ مقام سیال کوٹ پیدا ہوئے، سیال کوٹ ایک نہایت مردم خیز خطہ ہے۔ گزشتہ صدیوں میں بھی یہاں سے بعض ایسے صاحبِ کمال پیدا ہوئے جن کا نام تمام دُنیائے اِسلام میں آج تک بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔ ملا عبد الحکیم، سیال کوٹی جو شاہ جہاں کے زمانے میں تھے اور جن کو اُن کی مشہور تصنیف کے صلے میں چاندی میں تولا گیا تھا، یہیں کے رہنے والے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ سیال کوٹ کے مردم خیز ہونے کا ذکر علامہ اِقبال سے کیا تو اُنھوں نے اس کی تصدیق کے لئے تاریخ میں سے ایسے کئی باکمالوں کے نام گنوائے جو اس سرزمین سے اُٹھے تھے۔ سیال کوٹ کا علاقہ کشمیر کی ریاست سے بالکل ملحق ہے اور بڑی کثرت سے کشمیری خاندان اس میں آباد ہیں؛ اقبال کے آبا و اجداد بھی کشمیر ہی سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے۔ ان کے اسلاف کشمیری پنڈت تھے جن کی ذات سپرو تھی۔ مجھے اُن کے سپرو ہونے کا علم خود اُنہی کی زبانی حاصل ہوا۔ سر تیج بہادر سپرو اپنی علم دوستی کی وجہ سے اِقبال کے بڑے قدر دانوں میں ہیں، خود صاحب موصوف کی زبانی اِس کا

پتہ چلا کہ غالباً چار یا پانچ پشت اُوپر اقبال اور سپرو ایک ہی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اِس کے بعد ایک نے اِسلام قبول کر لیا اور اِختلاف مذہب کی وجہ سے اِس خاندان کی مختلف شاخیں ایک دوسرے سے بے تعلق ہو گئیں۔

اگرچہ اِسلام کے زیرِ اَثر اقبال ذات پات اور نسل پر اِفتخار کو صحیح نہیں سمجھتے تھے تاہم جا بجا اُن کے اشعار میں اِس بات کے اشارے ملتے ہیں کہ اُن کو اپنے برہمن زادہ ہونے پر بھی فخر تھا۔ برہمنوں کی ذہانت اور فلسفہ دانی سے کس کو اِنکار ہو سکتا ہے اور غالباً از روئے قانونِ توارث اِقبال کو اس میں اچھا خاصا حصہ ملا۔

اقبال کے والد گو صاحبِ ثروت نہ تھے لیکن اپنے شہر میں دل و دماغ کی پاکیزگی کی وجہ سے بہت قابلِ احترام سمجھے جاتے تھے، کوئی بیس برس کا عرصہ ہوتا ہے جب کہ انارکلی والے مکان میں مجھے ان سے شرفِ نیاز حاصل ہوا۔ اس وقت اقبال کی شہرت تمام ملک میں پھیل چکی تھی اور اُن کے والد اقبال کے کمال پر بجا طور پر فخر کرتے تھے۔ اُن پر تصوف کا رنگ بہت غالب تھا۔ یہی رنگ اقبال میں علم و شعر کے جوہروں کے ساتھ مِل کر اور بھی زیادہ گہرا ہو گیا اور اسی کی بدولت اقبال کو عطار، سنائیؒ اور رومی کی صف میں جگہ ملی۔

اقبال کبھی کبھی اپنے والدؒ کے کشف و کرامات بھی بیان کرتے تھے۔ فرماتے تھے "میں نے والدہ کی زبانی سنا ہے کہ ایک آدھ مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ والد کی موجودگی میں بے چراغ کمرے کے اندر تاریک رات میں عجیب وغریب قسم کا نور ظاہر ہوا اور تاریک کمرے میں ایسا معلوم ہوا کہ سورج نکل آیا ہے"۔ اقبال کے والد کی گفتگو میں نہایت لطافت اور پاکیزگی پائی جاتی تھی

وہ ایک مرتبہ فرماتے تھے "اقبال کی پیدائش کے کچھ روز پہلے میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک بڑا ہی عجیب و غریب پرندہ فضا میں زمین کے قریب اڑ رہا ہے اور بڑی کثرت سے لوگوں کا ہجوم ہے، اس ہجوم میں مَیں بھی ہوں، وہ پرندہ کسی کی کوشش سے ہاتھ نہیں آتا لیکن خود بخود میرے دامن میں آکر گرا اور میں نے اُسے پکڑ لیا۔"

فرماتے تھے "میں نے اس کی اِقبال کی پیدائش کے بعد ہی تاویل کی کہ وہ پرندہ یہی بچہ ہے اور یہ ضرور کوئی غیر معمولی کمال پیدا کرے گا۔"

جس کسی کو اُن سے ملنے کا موقع ملا ہو اُس کو قطعاً اس بات میں شک نہیں ہو سکتا کہ اقبال کو اپنی طبیعت کے بہترین عناصر اپنے باپ ہی سے بچپن میں ملے۔ فارسی کی ایک نظم میں بھی اپنے والد کے اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے یہ واقعہ بیان کیا ہے "میں نے ایک سائل کو بُری طرح ڈانٹا والد سن رہے تھے انھوں نے اس دردانگیز طریقے سے میری اِس درشتی پر سرزنش کی کہ اِس کے بعد سے آج تک میں کبھی کسی سائل کے ساتھ کسی قسم کی سخت کلامی نہیں برت سکتا۔"

اِقبال کو اپنی والدہ سے بھی بہت محبت تھی جس کا ثبوت اس بلیغ اور دردانگیز مرثیے سے مِلتا ہے جو انھوں نے اپنی والدہ کی وفات پر لکھا ہے۔ جس کا ایک بند یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

کس کو اَب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار؟ | کون میرا خط نہ آنے سے رہیگا بے قرار؟
خاکِ مَرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا | اَب دُعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤنگا
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا | گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات | تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی | میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

وہ جواں قامت میں ہے جو صورتِ سروِ بلند | تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند
کاروبارِ زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا | وہ محبت میں تری تصویر، وہ بازو مرا
تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ | صبر سے نا آشنا، صبح و مسا روتا ہے وہ

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی

اقبال کو جس زمانے میں اپنے اندر گہرے وجدانی رجحان کا احساس شروع ہوا تو ایک روز انھوں نے اپنے والد سے اس کا ذکر کیا "میں اپنے اندر کچھ ایسی چیزیں محسوس کرتا ہوں کہ اگر مجھ میں بعض جسمانی کمزوریاں نہ ہوتیں تو شاید میں بھی کسی نہ کسی قسم کا نبی ہو جاتا" اس پر ان کے والد نے ہنس کر کہا "خدا کا شکر ہے کہ تم کو اپنی کمزوریوں کا علم ہے جو تم کو اس مغالطے میں پڑنے سے بچاتی رہیں گی"۔

انٹرمیڈیٹ تک اُن کی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی، خوش قسمتی سے اُردو فارسی اور اسلامیات کے ذوق کی تربیت کے لئے اُن کو ایک ایسے اُستاد سے تلمذ حاصل ہوا جو اپنے زمانے کے بے نظیر شخص تھے۔ مولوی میر حسن بڑے عالم اور سخن فہم شخص تھے اساتذہ کا کلام اُن کو بڑی کثرت سے یاد تھا۔ جو ذوقِ سخن اُن کی طبیعت میں تھا اس کو وہ ہونہار شاگردوں میں بھی منتقل کر دیتے تھے۔ کچھ اپنے میلانِ فطرت کی وجہ سے اور کچھ مولوی میر حسن کے فیضِ صحبت کی وجہ سے جوانی کے زمانے میں اقبال کا یہی حال تھا کہ اساتذہ کے ہزارہا اشعار اُن کو یاد تھے۔

سیالکوٹ کا اسکاچ مشن کالج غالباً اس زمانے میں ایف۔ اے تک محدود تھا اسی لئے بی۔ اے کی تعلیم کے لئے اقبال لاہور چلے آئے اور گورنمنٹ کالج

میں داخل ہو گئے۔ وہیں سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں بڑے اِمتیاز سے حاصل کیں۔

اس زمانے میں اِقبال کی خوش قسمتی سے آرنلڈ وہاں فلسفے کے پروفیسر تھے۔ آرنلڈ کو فلسفے کے علاوہ ادبیات کا بھی ذوق تھا اور اسلامیات سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ جس قدر اقبال آرنلڈ کے شاگرد ہونے پر خوش تھے آرنلڈ اقبال جیسے طباع اور ذہین شاگرد کی استادی پر فخر کرتے تھے آرنلڈ کا بیان تھا کہ ایسے طالب علم کے پڑھانے سے خود اُستاد کے علم میں اِضافہ ہوتا ہے۔

ایم۔ اے میں فرسٹ آنے کے صلے میں اِقبال کو نانک بخش مڈل ملا۔ اِس کے بعد وہ کچھ عرصے اورنیٹل کالج اور گورنمنٹ کالج میں فلسفے کے پروفیسر بھی رہے، جب پروفیسر آرنلڈ ولایت جانے لگے تو اقبال کو اپنے ساتھ چلنے پر بہت مجبور کیا۔

اِقبال کی اِنگلستان کو روانگی۔

اِقبال کے اِس سفر یورپ میں اُن کے بڑے بھائی شیخ عطا محمدؒ نے جو ابھی بقید حیات ہیں ان کی بڑی مدد کی۔ شیخ صاحب کی آمدنی اگرچہ محدود تھی لیکن اُن کو اپنے چھوٹے بھائی سے ایسا عشق تھا کہ اُنھوں نے اپنا تمام سرمایہ بے دریغ اُن کے حوالے کر دیا، اِقبال بھی جب اپنے بھائی کا ذکر کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی معشوق کا ذکر کر رہے ہیں۔ دونوں بھائیوں کا یہ گہرا عشق آخر عمر تک بدستور قایم رہا۔

اِقبال ۱۹۰۵ء میں عازم اِنگلستان ہوئے لیکن اس سے پہلے ہی وہ اپنی چند نظموں کی وجہ سے ایک اعلیٰ درجے کے شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے جو نظمیں اُنھوں نے انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں میں پڑھیں

یا سر عبد القادر کے "مخزن" میں شایع ہوئیں وہ ایسی بلند پایہ نظمیں تھیں کہ ہر سخن فہم کو اِحساس ہو گیا تھا کہ آسمانِ شعر پر ایک نیا آفتاب طلوع ہوا ہے۔

اِنگلستان میں وہ کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے زیادہ تر اُن کا تعلق پروفیسر وارڈ اور سارلے سے رہا پروفیسر براؤن سے، پروفیسر نکلسن سے کیمبرج ہی میں نے دریافت کیا تھا کہ آیا طالب علمی کے زمانے میں وہ اقبال کو جانتے تھے اُنھوں نے فرمایا "نہیں میں اس زمانے میں اُن سے واقف نہ تھا"

اِنگلستان کے دورانِ قیام میں مغربی فلسفے کے علاوہ اقبال نے اِسلامی فلسفے کی طرف رجوع کیا اور بڑی تحقیق سے اسلامی تعلیمات کے فلسفے کا مطالعہ کیا اِس تحقیق کا حاصل وہ مقالہ ہے جو "Metaphysics in Persia" کے نام سے شایع ہوا، اس مقالہ کی بناء پر میونخ یونیورسٹی سے اُن کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری ملی، لندن میں اُنھوں نے بیرسٹری کا اِمتحان بھی پاس کیا۔ اس زمانے میں پروفیسر آرنلڈ کے قایم مقام کی حیثیت سے وہ کچھ عرصے لندن میں عربی کے پروفیسر بھی رہے، اِنگلستان کے زمانۂ قیام میں اُنھوں نے (۶) لکچر اِسلام پر بھی دیئے۔

وَاپسی ۱۹۰۸ء میں وہ وطن واپس لوٹے علمی شوق کی وجہ سے زیادہ موزوں بات تو یہی تھی کہ وہ پروفیسر ہوتے لیکن کسی وجہ سے انھوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ ملازمت نہ کریں گے۔ اس زمانے میں اِنڈین ایجوکیشنل سروس میں پنجاب میں غالباً کوئی ہندوستانی نہیں تھا یہ سروس زیادہ تر انگریزوں کے لئے مخصوص تھی لیکن اقبال کے علم کا چرچا اس وقت بھی ایسا تھا کہ خود گورنمنٹ نے اُن کے سامنے یہ خدمت پیش کی لیکن اِقبال نے اسکو

قبول کرنے سے اِنکار کر دیا، اُن کے دوستوں کو بڑا افسوس تھا کہ اُنھوں نے ایسا نادر موقع ہاتھ سے کیوں کھو دیا جسٹس شاہ دین مرحوم اس زمانے میں ہائیکورٹ کے جج تھے۔ اس بارے میں وہ اقبال سے بہت ناراض تھے اور ان سے ہمیشہ کہتے تھے تم جیسے آدمی کا عدالت میں کوئی کام نہیں۔ تمہیں علمی زندگی کو بطور پیشے کے اختیار کرنا چاہیئے، میں نے اُن سے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ "آیا یہ بہتر نہیں تھا کہ آپ پروفیسر ہو جاتے؟" فرمانے لگے "میں نے کچھ دن پروفیسری کی اور اس نتیجے پر پہونچا کہ ہندوستانی کالجوں کی پروفیسری میں علمی کام تو ہوتا نہیں البتہ ملازمت کی ذلتیں ضرور سہنی پڑتی ہیں" فرماتے تھے "ایک مرتبہ طالب علموں کی حاضری کے متعلق گورنمنٹ کالج کے پرنسپل سے کچھ جھگڑا ہو گیا اور پرنسپل نے مجھ سے کچھ اس طرح گفتگو کی جیسے کوئی کلرک سے باتیں کرتا ہے۔ اس دن سے ملازمت سے طبیعت کچھ ایسی کھٹی ہوئی کہ جی میں ٹھان لی کہ جہاں تک ہو سکے گا ملازمت سے گریز کروں گا۔ اپنے اسی خیال کو اُنھوں نے اسرارِ خودی میں بیان کیا ہے۔

رزقِ خویش از دستِ دیگر الحذر
الحذر از نانِ چاکر الحذر

اِنگلستان کے دوران قیام میں قومی احیاء کے خیالات اُن کی طبیعت میں موجزن ہونے لگے تھے وہاں اُنھوں نے جو نظمیں لکھیں اُن سے اِنھیں خیالات کا پتہ ملتا ہے۔

ہر شاعر جو دیگر کمالات کی بھی اہلیت رکھتا ہو کبھی کبھی شاعری کو لاطایل بھی سمجھنے لگتا ہے۔ اقبال کو اِنگلستان میں خیال ہوا کہ مسلمانوں میں شاعری انحطاط کے ساتھ وابستہ ہے اور اس قوم کو مزید شاعری کی ضرورت نہیں۔

چنانچہ انھوں نے ارادہ کیا کہ وہ شاعری چھوڑ دیں گے اور کوئی ایسا کام کرینگے جس سے قوم میں بیداری اور قوتِ عمل پیدا ہو، اس وقت تک اُن کو اس کا پوری طرح احساس نہیں ہوا تھا کہ شاعری کا رُخ بدل کر بھی یہ کام بہ طریقِ احسن اس سے لیا جا سکتا ہے۔ اُس زمانے میں سر عبد القادر بھی انگلستان ہی میں تھے اور دونوں ساتھ ہی رہتے تھے، سر عبد القادر کو اس کا خطرہ ہوا کہ کہیں سچ مچ اقبال شاعری ترک نہ کر دیں، اس معاملے میں دونوں میں بحث ہو گئی اور فیصلہ یہ ہوا کہ پروفیسر آرنلڈ سے مشورہ کیا جائے اور اس کے بعد قطعی فیصلہ کیا جائے۔ دنیائے ادب کے لئے یہ نہایت خوش قسمتی کی بات ہے کہ آرنلڈ نے اُن کو نہایت صحیح مشورہ دیا اور اُن سے کہا کہ بلند پایہ شاعری سے قوم کا ایسا تعمیری کام ہو سکتا ہے جو کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔ اس پر اقبال کچھ نرم پڑ گئے اور ان کا وہ خیال رفتہ رفتہ جاتا رہا لیکن اس کے ساتھ یہ ارادہ بھی کیا کہ شاعری کو محض تفننِ طبع کا ذریعہ نہ بنایا جائے بلکہ اس کی تمام قوت قوم کے اندر صحیح جذبات کے بیدار کرنے کے لئے صرف کی جائے۔

انگلستان سے واپسی پر اقبال بیرسٹری کے پیشے میں اپنے آپ کو استوار کرنے لگے۔ اگرچہ اُن کو اپنی ذہانت، محنت، اور شہرت کی وجہ سے کچھ نہ کچھ کام ملتا رہتا تھا لیکن دیر تک ان کو یہ پتہ نہ چلا کہ ان کی بیرسٹری اُن کی شاعری میں حائل ہے اور ان کی شاعری ان کی بیرسٹری میں مزاحم، عمر کا ایک نہایت ہی قیمتی حصہ انھوں نے اس پیشے پر ضائع کیا۔ میں نے اُن سے ایک مرتبہ کہا "آپ نے یہ دو متضاد سے شغل کیوں اختیار کر رکھے ہیں؟" فرمانے لگے۔ اس تضاد سے بہت فایدہ پہونچتا ہے۔ وکالت دنیا داری کا نچوڑ ہے، تمام جہان کی کثافتوں اور خباثتوں سے انسان اس پیشے میں آشنا ہو جاتا ہے۔

اور طبیعت میں اُس کے خلاف ایک ایسا ردِ عمل پیدا ہوتا ہے کہ بڑے زور سے انسان کی روح لطیف چیزوں کے حصول کے لئے بال و پر پھیلاتی ہے۔" اِس پر انھوں نے یورپ کے بعض ایسے لوگوں کا ذکر کیا جو شاعر بھی ہیں اور بیرسٹر بھی۔ اقبال کے انتقال کے بعد مجھے ان کا یہ فرمانا یاد آیا کیوں کہ جس اخبار میں اُن کی خبرِ انتقال درج تھی اس میں ساتھ ہی یہ خبر بھی تھی کہ اسی روز سر ہنری نیو بولٹ انگلستان کے مشہور شاعر بیرسٹر کا بھی انتقال ہو گیا دونوں کی خبرِ وفات ٹائمس میں ساتھ ہی ساتھ چھپی تھی۔

جتنی مدت اِقبال بیرسٹری کرتے رہے عام علمی مشاغل اُن سے نہیں چھوٹے وقتاً فوقتاً وہ شعر بھی کہتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس شغل کے لئے وہ اتنا ہی وقت دے سکتے تھے جتنا اپنے پیشے کے مشاغل سے بچ جاتا۔ قانون کی کتاب وہ اہم مقدمے کی تیاری ہی کے وقت دیکھتے ہوں گے کیوں کہ سیکڑوں ملاقاتوں میں میں نے ان کو اکثر فلسفے، ادب، تاریخ اور مذہب وغیرہ کی کتابیں پڑھتے ہوئے دیکھا لیکن کبھی قانون کی کتاب اُن کے ہاتھ میں نہیں دیکھی۔

بیرسٹری کے بہترین زمانے میں بھی اُن کی آمدنی کبھی ایک ہزار روپے سے متجاوز نہیں ہوئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے وقت ریاست کے بعض عہدے داروں کا خیال ہوا کہ اقبال کو بطور پرنسپل کے یہاں بلایا جائے میں نے اُن سے اس کے متعلق دریافت کیا معلوم ہوا کہ وہ اس کے خواہش مند نہیں تھے فرماتے تھے۔

"تنخواہ کے لحاظ سے تو مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور اگر تھوڑی سی رقم مجھے زاید مل بھی جائے تو اس کے لئے جلا وطن ہونا کوئی معقول فعل نہیں۔"

اس زمانے میں وہ بڑی کثرت سے ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے

اِمتحانات میں ممتحن بنائے جاتے تھے۔ سینکڑوں جوابی بیاضوں کے پلندے اُن کے پاس پڑے رہتے تھے۔ امتحانوں کے پرچے دیکھنے کا کام کچھ ایسا میکانیکل ہو جاتا ہے کہ وہ بیاضیں پڑھتے بھی جاتے تھے اور ہم نشینوں سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ پرچوں کو غور سے نہیں دیکھتے تھے اُن کی عادت تھی کہ وہ اپنے ذمے اول تو کوئی کام کے لینے سے بہت گریز کرتے تھے لیکن اگر کوئی کام اپنے ذمے لیتے تھے تو اس میں پوری کوشش صرف کرتے تھے۔

(۲۰) برس سے زیادہ عرصے تک بیرسٹری اور شاعری کا ملا جلا شغلہ جاری رہا۔ اس زمانے میں عام قاعدہ تھا کہ ہر پلیڈر لیڈر بننے کی کوشش کرتا تھا جسکی طرف اکبرالہ آبادی نے ظریفانہ اِشارہ کیا ہے۔

ہو کل چھٹے اُن کے پنجے سے جب | تو پھر قوم مرحوم کے سَر ہوئے
پپیہے پکار اُٹھے "پی کہاں" | گر وہ پلیڈر سے لیڈر ہوئے

اقبال کی سلامتی طبع کی یہ بہت بڑی دلیل ہے کہ وہ اِس لالچ میں نہیں آئے، ان کو پبلک لایف میں گھسیٹنے کی بہت کوششیں کی گئیں لیکن وہ اس سے گریز کرتے رہے، اس زمانے میں سیاسیات کا جو رنگ تھا اقبال کو اُس میں غلامانہ سیاست کی بو آتی تھی اور وہ کہتے تھے "جب تک صورت حال یہی ہے تو لیڈر کسی قدر قوم فروشی ہی کے ساتھ پنپ سکتے ہیں" جس کے لئے وہ اپنی طبیعت کو آمادہ نہیں پاتے تھے اس کیفیت پر اُنھوں نے وہ نظم لکھی ہے جس میں اُنھوں نے لیڈری کا نقشہ کھینچا ہے۔

میں نے اقبال سے ازراہ نصیحت یہ کہا | عامل روزہ ہے تو اور نہ پابندِ نماز
تو بھی ہے شیوۂ اربابِ ریا میں کامل | دل میں لندن کی ہوس لب پہ ترے ذِکر حجاز

ختم تقریر یہ تری مدحت سرکار پہ ہے | فکر روشن ہے ترا موجد آئین نیاز
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے | پردۂ خدمت دیں میں ہوس جاہ کا راز
اس پہ طرہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے | تیری مینائے سخن میں ہو شراب شیراز
جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں بھی | تجھ کو لازم ہے کہ ہو اٹھ کے شریک تگ و تاز

غرض اس تمام نظم میں انھوں نے لیڈروں کے اخلاق کا خاکہ کھینچا ہے آخر میں فرماتے ہیں کہ یہ سب کمال اور کمزوریاں مجھ میں بھی موجود ہیں چاہوں تو اچھا خاصا لیڈر ہو جاؤں لیکن ایک بڑے ضروری عنصر کی کمی ہے۔ فرماتے ہیں

سن کے کہنے لگا اقبال "بجا فرمایا" | شک مجھے آپ کی باتوں میں نہیں بندہ نواز
"مجھ میں اوصاف ضروری تو ہیں موجود مگر | ہے کمی ایک کہوں تم سے جو ہو فاش نہ راز"

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی
اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی

۱۵/۲۰ برس تک اسی خیال پر قایم رہنے کے بعد آخر سیاسی حالات کے انقلاب اور بعض احباب کی ترغیب نے اُن کو اس میدان میں گھسیٹا، اس کے بعد وہ پنجاب کی اسلامی سیاست میں پیش پیش رہے، مسلم لیگ کے پریسیڈنٹ بھی ہوئے، مسلم کانفرنس کی روح رواں بھی رہے اور پنجاب کونسل کے ممبر بھی ہوئے۔ میں نے اُن سے ایک روز مذاق سے کہا کہ "کیوں جناب! آپ تو کونسلوں کو سرمایہ داروں کا اکھاڑا کہتے تھے۔ اب خود اس میں کیسے شریک ہو گئے؟" فرمانے لگے "جو کہتا تھا وہ ٹھیک تھا، میں اسی لئے شریک ہوا ہوں کہ اندر سے اس کی بیخ کنی کی جائے۔"

کچھ سال کے تجربے کے بعد ان کو محسوس ہوا "میں عملی سیاست کا مرد میدان نہیں بن سکتا مجھ کو اس سے بلند تر کام کرنا چاہئے اور شعر کے ذریعے ایک طرف تو

قوم کے دلوں میں تغیر پیدا کرنا چاہیئے اور دوسری طرف لیڈروں کی طبیعتوں کی باگ خاص نصب العین کی طرف موڑنی چاہیئے۔

اقبال زندگی کے کسی شعبے میں بھی عملی آدمی نہیں تھے افکار و تاثرات نے اُن کی تمام شخصیت پر قبضہ کر لیا تھا، مسلمانوں میں چوں کہ قحط الرجال ہے اِس لئے یہ قوم ایک ہی اِنسان سے مختلف اور متضاد تقاضے کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ ایک شخص شاعر بھی ہو، فقیر بھی ہو، قومی لیڈر بھی ہو اور پیر و مرشد بھی ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ "ہر کسے را بہر کارے ساختند" ہر اہلِ کمال کسی خاص ہی صنف میں کمال رکھتا ہے اور دوسری سمتوں میں اس کی اِستعداد اوسط سے بھی گر جاتی ہے، ایک زمانہ ایسا آیا کہ ہندوستان کے اکثر بڑے بڑے لیڈر اقبال کے اشعار سے اپنی روحوں میں گرمی پیدا کرتے تھے اور اس کے اشعار کے پیدا کئے ہوئے جوش کو عمل میں تبدیل کرتے تھے، اُن میں سے بعض لیڈر جو شاعر کی نفسیات سے واقف نہیں تھے اقبال پر طعنہ زن ہوتے تھے کہ "تم نے ہم کو مومن بنا دیا لیکن خود کافر کے کافر ہی رہے"۔

ایک مرتبہ مولانا محمد علی نے اقبال سے یہی کہا۔ اقبال نے جواب دیا۔ "سنو بھائی! تم نے دیکھا ہوگا کہ جب قوالی ہوتی ہے تو قوال بڑے مزے اور اطمینان سے گاتا ہے لیکن سننے والے ہُوحق کرتے ہیں، وجد میں آتے ہیں ناچتے ہیں مضطرب ہوتے ہیں، بے ہوش ہو جاتے ہیں لیکن اگر یہی کیفیت قوال پر بھی طاری ہوں تو قوالی ختم ہو جائے۔ میں تو قوم کا قوال ہوں، میں گاتا ہوں تم ناچتے ہو، کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی تمہارے ساتھ ناچنا شروع کر دوں؟"

اس بیان میں اقبال نے بڑے ظریفانہ انداز میں ایک بڑی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ جس طرح فطرت میں تقسیم عمل ہے اِس طرح افراد میں بھی تقسیم عمل

ہونی چاہیئے۔

سیاست اور وطن پرستی۔

جہاں تک سیاسی افکار، تاثرات اور نصب العین کا تعلق ہے اقبال کی سیاست کے (۳) پہلو تھے، ایک طرف تو وہ تمام بلند پایہ مفکرین، مصلحین کی طرح تمام نوع انسان کی بہتری کے متعلق سوچتا تھا۔ اس کی شاعری کا بیشتر حصہ انسانی زندگی کے نصب العین سے تعلق رکھتا ہے اور براہ راست ملکی سیاست سے بے تعلق معلوم ہوتا ہے۔ محض مخصوص گروہوں کے متعلق سوچنا عملی سیاست دانوں کا کام ہے اعلیٰ درجے کے شاعر، حکیم یا نبی مخصوص گروہوں کو اپنی نظرگاہ نہیں بناتا، اقبال ہی کے مماثل جرمنی کا سب سے بڑا شاعر اور مفکر گوئٹے ہے جس کا زمانہ جرمنی کا وہ پرآشوب زمانہ تھا جس میں نپولین نہ صرف جرمنی کو بلکہ تمام یورپ کو تہ و بالا کر رہا تھا۔ گوئٹے اس تمام ہنگامے سے کچھ ایسا بے تعلق معلوم ہوتا تھا کہ بعض نقادوں نے اس کو متہم کیا ہے کہ اس میں جذبۂ حب الوطنی کی کمی تھی اس قسم کی تنقید کوتاہ نظری ہی پر مبنی ہو سکتی ہے وہی گوئٹے جس نے براہ راست اس وقت کی عملی سیاست میں نہ قلم سے حصہ لیا اور نہ عمل سے اپنے افکار کی بدولت جرمنی کی علمی اور تہذیبی عظمت کا بانی ہے۔ اقبال کے متعلق بھی صورت حال اسی قسم کی ہے اس نے شروع میں حب وطن کے عام جذبات کے ماتحت بڑی پرجوش نظمیں وطن پر لکھیں جن سے بہتر آج تک کوئی ہندوستانی شاعر نہیں لکھ سکا لیکن اس دور کے بعد اس کی نظر وطن سے بے تعلق تو نہیں ہوئی لیکن وطن سے بلند ہو گئی اور وہ اس نقطہ نظر پر آگیا جو قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ کسی قوم میں تغیر حقیقی طور پر پیدا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس قوم کے نفوس میں تغیر پیدا نہ ہو۔ سیاست دان کی نظر فقط ظاہر پر پڑتی ہے اور وہ فقط سطحی

تغیرات کی اُدھیڑ بن میں لگا رہتا ہے لیکن حقیقی مصلح کی نظر اساسیات پر پڑتی ہے اور سیاست دان کے مقابلے میں بہت زیادہ وسیع اور دور رس ہوتی ہے سیاست دان محض ابن الوقت ہوتا ہے اور معاملات کی گتھیاں جیسے جیسے پیدا ہوتی جاتی ہیں ان کو سلجھانے کے لئے وہ قاعدے اور قانون بناتا رہتا ہے جن کی تہہ میں کوئی پائدار حقیقت نہیں ہوتی۔ اقبال کو یہ خیال ہوا کہ وطن کے متعلق کورانہ جوش کو ابھارنے کا وہی نتیجہ ہوگا جو مغرب نے جا بہ جا حب الوطنی سے پیدا کیا ہے۔ جغرافیائی حدود کی پرستش سے انسان کی نظر تنگ، اس کی عقل بہانہ جو اور اس کا دل حقیقی عشق سے محروم ہو جاتا ہے لہذا وہ اہل وطن کے دلوں میں ایسے جذبات پیدا کرنا چاہتا تھا جس میں محض یورپ کی حب الوطنی کی تقلید نہ ہو بلکہ عدل وانصاف کا راستہ صالحانہ جد وجہد سے سب کے لئے کھل جائے، وطن کی صحیح محبت اس کے دل میں آخر تک موجود تھی اور وہ اس کو ایک فطری جذبہ خیال کرتا تھا، آخر تک اپنی فارسی نظموں میں جہاں کہیں وہ ہندوستان کا ذکر کرتا ہے اس کے بیان میں بڑا درد اور سوز وگداز ہوتا ہے۔
وہ ہر قسم کی غلامی سے بیزار تھا اور وطن کو نہ صرف سیاسی بلکہ اقتصادی، عقلی مذہبی اور اخلاقی غلامی سے بھی آزاد دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی سیاست کا دوسرا پہلو اس امر کے ساتھ وابستہ ہے کہ وہ صرف ہندی ہی نہیں بلکہ ہندی مسلمان تھا۔ اس نقطہ نظر میں وہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کا نمائندہ تھا جہاں تک سیاست کا تعلق گروہوں کی اصلاح اور ارتقاء سے ہے وہ جس طرح ہندوستان کی آزادی اور اس کے لئے اعلیٰ درجے کے اقتدار کا آرزومند تھا، اسی طرح وہ تمام اسلامی دنیا کی آزادی اور اس کی ترقی کا متمنی تھا۔

ہندوستان کے بعض غیر مسلم حضرات مسلمان کی اس نطرت سے آشنا

نہیں ہیں چنانچہ جب کوئی مسلمان ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا سے تعلق دل چسپی یا جوش اور جذبے کا اظہار کرتا ہے تو وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتا اور وطن پرست یا قوم پرست نہیں ہے۔ ہر صحیح الفطرت مسلمان ہندوستان کی پستی سے اتنا ہی دل گیر ہے جتنا کہ اور کوئی غیر مسلم ہندوستان کی عزت اس کی عزت اور ہندوستان کی ذلت اس کی ذلت ہے اس کا وجود خاکی اسی زمین سے ابھرا اور اسی میں پیوند ہو جائے گا لیکن اسلام نے اس کو ایک ایسی برادری کا بھی رکن بنا دیا ہے جو جغرافیائی حدود سے ماورئی ہے مراکش اور چین کے مسلمان کی سیاسی اور تمدنی کشمکش کے ساتھ بھی اس کے دل کو وہی رابطہ ہے جو خود اپنے وطن کی جدوجہد سے ہے۔

مسلمان کی وسعت قلب میں وطن کے لئے ایک نہایت عزیز مقام موجود ہے لیکن وطن سے ماورئی دنیا کی عالم گیر اسلامی برادری کو بھی وہ اپنے دل سے الگ نہیں کر سکتا۔ جب تک اسلام کے نصب العین میں کوئی قوت باقی ہے۔ ہر سلیم القلب ہندی مسلمان کی طبیعت میں یہ دونوں جذبے بیک وقت موجود رہیں گے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے ایک جذبہ دوسرے کے منافی ہے۔ اب ہندوستان کے غیر مسلم، وسیع النظر راہنما پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی سیاست میں یہی نقطہ نظر اختیار کر لیا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے مسئلے کو نہ کوئی ہندوستانی سمجھ سکتا ہے اور نہ کوئی صحیح راہ عمل پیش کر سکتا ہے جب تک کہ باقی اقوام کی سیاست کو بھی ساتھ ملا کر اس پر غور نہ کیا جائے جس زمانے میں مسٹر گاندھی اور ان کے شرکا نے خلافت کی تحریک میں عملی حصہ لیا باوجود اس امر کے کہ خلافت سے غیر مسلموں کو کوئی تعلق نہیں تھا۔ مسٹر گاندھی کی اس جدوجہد میں کسی کے دل میں یہ شک و شبہ پیدا نہیں ہوا کہ

گاندھی جی ہندوستان کی سیاست سے دور ہٹ گئے ہیں، اس زمانے میں لالہ لاجپت رائے نے جو ہندوؤں کے نہ صرف سیاسی بلکہ مذہبی لیڈر بھی تھے۔ ایک مضمون لکھا جس کا موضوع یہ تھا کہ ہندوستان کبھی آزاد نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسلامی ممالک بھی آزاد نہ ہوں۔ ہندوستان کی آزادی اور غلامی ان ممالک کی آزادی اور غلامی سے غیر منفک طور پر وابستہ ہے یہی نقطۂ نظر لینن کا بھی تھا حالانکہ وہ اپنی تحریک کو مذہب کے خلاف ایک جہاد سمجھتا تھا۔ محض اپنے سیاسی اور معاشی پروگرام کو مدنظر رکھتے ہوئے لینن کا یہ خیال تھا کہ جب تک اسلامی ممالک آزاد نہ ہوں یورپ کی سرمایہ داری اور ملوکیت کو شکست نہیں ہو سکتی۔

اِن حقایق سے آشنا ہونے کے بعد کوئی کج اندیش شخص ہی اِس نتیجے پر پہونچ سکتا ہے کہ اقبال کا جذبہ جو اِسلامی دنیا کے متعلق تھا وہ اس کی حب وطن سے کوئی الگ چیز ہے۔ حرّیت کی ایک ہی پکار کے یہ دو حربے تھے اور یہ دونوں حربے اقبال کی شاعری میں نمایاں اور ساتھ ساتھ موجود ہیں۔

جب وہ یہ کہتا ہے کہ انسان کو وطنیت سے پاک ہونا چاہیئے اور اس کی گرد کو دامن سے جھٹک دینا چاہیئے تو اس سے اس کی مراد فقط وہ غلط وطنیت کا جذبہ ہے جس نے مغربی اقوام کو اندھا کر دیا، وہ اِس غلط وطنیت سے بچا کر اپنے ہم وطنوں کو وطنیت کے اس جذبے کی طرف لانا چاہتا تھا جو کسی خاص زمین کے ٹکڑے کی پرستش پر مبنی نہ ہو بلکہ عروج انسان اور اس کی روحانی ترقی کے ماتحت ہو، ہندوستان کے دوسرے مشہور عالم شاعر ٹیگور کا نقطہ نظر بھی اقبال سے کچھ الگ نہیں ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ

ٹیگور میں جذبہ وطنیت کی کمی ہے لیکن مغربی رنگ کی وطن پرستی کے خلاف ٹیگور نے بھی اپنی آواز بلند کی۔ ٹیگور نے دنیائے ادب میں انسانی دلوں پر جو قبضہ کیا ہے وہ وطن کے متعلق راگ گاکر نہیں کیا ہے بلکہ روح انسانی کی گہرائیوں میں ڈوب کر کیا ہے اور ایسے افکار اور تاثرات کی بدولت اس کو عالم گیر شہرت حاصل ہوئی جو ذات پات، نسل اور رنگ اور جغرافیائی حدود سے بلند تر ہیں۔

اِقبال ہندوستان کی آزادی اور عظمت کے طالب تھے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے ان کی روح میں بڑی بے تابی تھی لیکن ان کو یہ خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ آزادی محض آقاؤں کی تبدیلی نہ ہو اور ظلم کی قوتیں جوں کی توں گوروں کے ہاتھوں سے نکل کالوں کے ہاتھوں میں نہ آجائیں۔ سچی آزادی کے لئے وہ یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں ہر گروہ کو نہ صرف نصب العینی طور پر مساوی حقوق حاصل رہیں بلکہ آئین و قوانین اِس انداز کے وضع کئے جائیں کہ اس وقت ملک میں جو جو گروہ جس حیثیت سے پس ماندہ اور مظلوم ہیں اُن کی پس ماندگی اور مظلومیت کا علاج کیا جائے۔

بعض نام نہاد قوم پرست فقط انگریزوں سے سیاسی قوت چھین لینے کے در پے ہیں اور اُن کے ضمیر میں وہ عدل پیدا نہیں ہوا جو تمام اِنسانوں کے لئے مساوی طور پر ترقی کی راہیں کھول دے۔ اِقبال کے دل میں ہندوستان کے تمام مظلوم طبقوں کے لئے بڑا درد تھا اور اس معاملے میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز ان کی نگاہ میں نہیں تھی۔ جب وہ مسلمانوں کے جائز حقوق کی حمایت گول میز کانفرنس میں کر رہے تھے تو اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی دیگر پس ماندہ اقوام کو بھی تحریک کرتے تھے بے سرمایہ اور محروم مزدکسانوں کی حمایت میں جو کچھ انھوں نے لکھا اس میں کیش و ملت کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی۔

اِقبال بھی وطن کی آزادی کا ایک پرجوش مجاہد تھا لیکن مغربی انداز کی وطن پرستی کو بُت پرستی سمجھتا تھا جہاں دوسرے قسم کے اَصنام کو توڑنے کا کام اُس نے اپنے ذمے لیا وہاں یہ بڑا بُت بھی اس کی ضرب و حرب سے نہیں بچ سکتا تھا۔





ڈاکٹر عاشق بٹالوی

علامۂ اقبال کی خدمت میں چند لمحے

علامہ اقبال کی زندگی میں راقم الحروف کو عرصۂ دراز تک انکی خدمت میں گاہے گاہے حاضر ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ جب مرحوم کا قیام میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں تھا۔ اور صحت اچھی تھی تو تقریباً روزانہ شام کو دولتکدہ پر محفل جمتی تھی۔ جس میں ہر مذاق کے لوگ حاضر ہو کر کسب فیض کر سکتے تھے۔ اِن دلپذیر صحبتوں کے چند واقعات اِس وقت یاد آگئے ہیں۔

ڈگریوں کا اِجراء

حضرت علامۂ اقبال اگرچہ علم و فضل کے پیکر تھے۔ لیکن یبوست یا خشکی جو بعض لوگوں کے نزدیک علم کا ضروری خاصہ ہے؛ ان میں نام کو نہ تھی۔ طبیعت ہمیشہ شگفتہ اور مزاج ہر وقت شاداں و فرحاں رہتا تھا۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی کا موقع ہوتا تو ایسی دلچسپ گفتگو کرتے کہ سننے والے گھنٹوں محظوظ رہتے تھے۔ علامۂ مغفور کو اپنے بڑے بھائی شیخ عطا محمد سے بیحد محبت تھی۔ یہ محبت گویا عشق کے درجہ تک پہنچ چکی تھی۔ شیخ صاحب کا جو عمر میں ڈاکٹر صاحب

سے پندرہ بیس سال بڑے تھے حال ہی میں اپنے وطن مالوف سیالکوٹ میں انتقال ہوا ہے۔ بانگ درا کی متعدد نظموں بالخصوص "والدہ مرحومہ کی یاد میں" اور "التجائے مسافر" میں ڈاکٹر صاحب نے نہایت والہانہ انداز میں اس برادرانہ محبت کا اظہار کیا ہے۔ ایک مرتبہ فرمایا کہ "جب میں ولایت گیا تو کچھ اپنا روپیہ میرے پاس موجود تھا لیکن زیادہ رقم میرے بھائی صاحب نے مجھ کو دی تھی۔ ولایت کے قیام کے دوران میں بھی وقتاً فوقتاً مجھ کو روپیہ بھیجتے رہتے تھے۔ جب میں نے کیمبرج سے بی۔ اے کر لیا تو انھوں نے لکھا کہ اب بیرسٹری کا کورس پورا کر کے واپس آ جاؤ۔ لیکن میرا ارادہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری لینے کا تھا۔ اس لئے میں نے جواب دیا کہ کچھ رقم اور بھیجئے تا کہ جرمنی جا کر ڈاکٹری کی سند بھی لے لوں۔ انھوں نے مجھ کو مطلوبہ رقم بھیجدی۔ انہی دنوں میں وہ ایک روز سیالکوٹ میں اپنے بے تکلف دوستوں کی صحبت میں بیٹھے ہوئے تھے کہ کسی شخص نے پوچھا "کیوں شیخ صاحب! سنا ہے اقبال نے ایک اور ڈگری لی ہے؟"

بھائی صاحب نے جواب دیا "بھئی کیا بتاؤں۔ ابھی تو وہ ڈگریوں پہ ڈگریاں لئے جا رہا ہے۔ خدا جانے ان ڈگریوں کا اجر کب ہوگا؟"

ملّتِ بیضا ایک روز محفل جمی ہوئی تھی کہ ایک نوجوان نے جو کسی مقامی کالج میں ایم۔ اے کا طالب علم تھا کہا "ڈاکٹر صاحب آپ ہمیشہ کہا کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو ذات پات کی تمیز مٹا دینی چاہیئے کیونکہ ہماری ذات صرف اسلام ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "بے شک میرا یہی عقیدہ ہے اور میں ہمیشہ اس کی تلقین کرتا ہوں۔"

نوجوان نے کہا "میں نے سنا ہے کہ خواجہ . . . . صاحب

کاٹھیاواڑ کے کسی خاندان میں شادی کرنا چاہتے تھے لیکن آپ نے انھیں منع کر دیا ہے اور کہا ہے کہ پنجاب کی کشمیری برادری سے باہر شادی نہ کریں۔"

ڈاکٹر صاحب بے اختیار ہنسے۔ کہنے لگے "بالکل صحیح ہے۔ آپ جانتے ہیں خواجہ . . . . صاحب وہاں شادی کرلیں تو ان کی اولاد بھی کالی کلوٹی ہوگی اور اس طرح اس خاندان سے وہ صباحت رخصت ہو جائیگی جو کئی پشتوں سے اس کی خصوصیت چلی آرہی ہے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے بچے نہایت خوشرو اور سرخ و سپید ہوں تاکہ ہم لوگ صحیح معنی میں ملّت بیضا بن جائیں۔ اِس لطیفے پر بے اختیار قہقہہ بلند ہوا اور دیر تک محفل میں خوش طبعی کی رو جاری رہی۔

پیارے صاحب رشید

ایک روز لکھنؤ اور دِلّی کی شاعری کا ذکر ہو رہا تھا۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ "اب دِلّی و لکھنؤ سے وہ لوگ رخصت ہوتے جا رہے ہیں جن کے دم سے اُردو شاعری کے ان دو دبستانوں کی خصوصیات قائم تھیں۔ اور چند سال کی بات ہے کہ لکھنو دلّی، لاہور، حیدر آباد سب ایک سطح پر آجائیں گے۔"

ڈاکٹر صاحب نے اس شخص کی طرف دیکھ کر کہا۔ "بے شک آپ صحیح کہتے ہیں بہت سے لوگ تو رخصت ہو چکے اور جو باقی ہیں وہ بھی اُٹھتے جا رہے ہیں۔ میں اپنا ایک دلچسپ واقعہ آپ کو سناتا ہوں۔

جب میں پہلے پہل لکھنؤ گیا تو وہاں کے مشہور شاعر پیارے صاحب رشید (زندہ تھے۔ لکھنؤ کے بعض سخن فہم احباب نے میری آمد پر شعر و سخن کی ایک مجلس منعقد کی جس میں پیارے صاحب رشید بھی تشریف لائے۔ حاضرین سے میرا تعارف کرانے کے بعد میر مجلس نے فرمائش کی کہ میں اپنا کلام سناؤں چنانچہ اُن کے

اِرشاد کی تعمیل میں میں نے اپنی چند نظمیں سُنائیں۔ مجھے وہ منظر اب تک نہیں بھولتا کہ میں اپنا کلام سنا رہا تھا اور میرے ہر شعر پر پیارے صاحب رشید کے چہرے سے حیرت و استعجاب و انقباض اور دل گرفتگی کے مخلوط جذبات کا اِظہار ہو رہا تھا۔ کبھی ان کی بھویں تنتی اور پھیل جاتی تھیں۔ کبھی آنکھیں یکبارگی کھلتیں اور پھر بند ہو جاتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ جب میں کلام سنا چکا تو ان کے پاس بیٹھ کر ادب سے پوچھا کہ "آپ کے سامنے شعر پڑھنا ہے تو گستاخی لیکن جو کچھ عرض کیا ہے آپ نے ملاحظہ فرمایا؟"

اُنھوں نے کسی قدر تامل سے جواب دیا "ہاں صاحب سُنا ہے۔ لیکن سچ پوچھئے تو ایسی اُردو ہم نے نہ آج تک پڑھی ہے نہ سُنی ہے۔ حیران ہوں کہ یہ فارسی ہے یا اُردو ہے یا کوئی اور زبان ہے۔"

ڈاکٹر صاحب یہ لطیفہ بیان کر کے دیر تک ہنستے رہے۔

طوائف کا ماحول

۱۹۳۰ء کے لگ بھگ کا ذکر ہے کہ پنجاب کے ایک مشہور رئیس نے جو سیاسی زندگی میں بھی کچھ نام پیدا کر چکے تھے۔ لاہور کی ایک طوائف سے شادی کر لی۔ یار لوگوں میں اس واقعہ کا چرچا ہونے لگا۔ ایک روز ڈاکٹر صاحب کے سامنے بھی کسی نے ذکر چھیڑ دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس رئیس کا نام لیکر کہا کہ "میں ان کو خوب جانتا ہوں۔ وہ متمول ضرور ہیں۔ لیکن آرٹسٹ نہیں ہیں۔ اگر آرٹسٹ ہوتے تو طوائف سے کبھی شادی نہ کرتے۔"

حاضرین میں سے ایک صاحب نے جو غالباً شاعر بھی تھے کہا "کیا آرٹسٹ طوائف سے شادی کرنیکا مخالف ہے؟"

ڈاکٹر صاحب بولے آپ خود آرٹسٹ ہیں۔ کیا آپ یہ نکتہ نہیں سمجھ سکتے

ذرا غور کیجئے۔ باغ میں فرشِ زمردیں بچھا ہے۔ ہوا کے سرد جھونکوں سے طبیعت بشاش ہو رہی ہے۔ بلند بالا درختوں کی ٹہنیاں جھوم جھوم کر گلے مل رہی ہیں گلزار کی روشوں پر دونوں طرف سرو استادہ ہیں۔ بیچوں بیچ نہر کا شفاف پانی بہہ رہا ہے۔ پرند چہچہا رہے ہیں۔ بھینی بھینی خوشبو سے فضا مہک رہی ہے۔ رنگ برنگ کے پھولوں سے آنکھ کو نور دل کو سرور حاصل ہو رہا ہے۔ کیا ایسے ماحول میں ایک نازک سی شاخ پر کھلا ہوا گلاب کا پھول زیادہ خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ یا اگر آپ اس کو توڑ کر اپنے گھر لے جائیں تو زیادہ خوش نما معلوم ہوگا؟"

ایک مشنری کا قصہ

ایک روز پیشہ ور مولویوں، واعظوں اور پیروں کا ذکر ہو رہا تھا کہ یہ لوگ کیا کیا بہروپ بھر کے اور کس کس طریقے سے سادہ لوح عوام کو ٹھگتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "یہ وبا صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ کم و بیش دنیا کے ہر ملک میں موجود ہے۔ میں جب کیمبرج میں پڑھتا تھا تو تعطیلات کے زمانے میں کچھ دنوں کے لئے میں اپنے ایک ہم سبق انگریز دوست کے ہمراہ اس کے وطن چلا گیا اس کا گھر سکاٹ لینڈ کے ایک دور اُفتادہ قصبے میں تھا۔ مجھے وہاں گئے چند روز ہوئے تھے کہ معلوم ہوا کہ ایک مشنری جو ہندوستان سے آئے ہیں آج شام کو قصبے کے اسکول میں لیکچر دیں گے اور بتائیں گے کہ ہندوستان میں عیسائیت کو کس قدر فروغ ہو رہا ہے میں اور میرے میزبان دونوں لیکچر سننے کے لئے پہنچے۔ سامعین میں عورتیں اور مرد کافی تعداد میں تھے۔ مشنری نے بتایا کہ ہندوستان میں تیس کروڑ انسان آباد ہیں، لیکن ان لوگوں کو انسان کہنا جائز نہیں۔ عادات و خصائل اور بود و باش کے اعتبار سے یہ لوگ انسانوں سے بہت پست اور حیوانوں سے کچھ اوپر ہیں

ہم نے سالہا سال کی جد وجہد سے اِن حیوان نما اِنسانوں کو تھوڑی بہت تہذیب سے آشنا کیا ہے۔ لیکن کام بہت وسیع اور اہم ہے۔ آپ ہمارے مشن کو دل کھولکر چندہ دیجئے۔ تاکہ اس عظیم الشان مہم میں جو ہم نے بنی نوع اِنسان کی بھلائی کے لیئے جاری کر رکھی ہے زیادہ سے زیادہ کامیابی ہو۔ یہ کہکر مشنری نے میجک لنٹیرن سے سامنے لٹکے ہوئے پردے پر ہندوستانیوں کی تصویریں دکھانا شروع کیں۔ ان میں بھیل، گونڈ، دراوڑ اور اڑیسہ کے جنگلوں میں بسنے والی قوم کے نیم برہنہ افراد کی نہایت مکروہ تصاویر تھیں۔ جب لیکچر ختم ہو گیا تو میں نے کھڑے ہو کر صدر جلسہ سے کچھ کہنے کی اجازت طلب کی۔ اُنھوں نے بخوشی اجازت دی تو میں نے بڑے جوش سے پچیس منٹ تقریر کی۔ میں نے حاضرین سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں خالص ہندوستانی ہوں میرا خمیر اسی ملک کی سرزمین سے اُٹھا ہے۔ آپ میری وضع قطع، رنگ روپ، چال ڈھال، دیکھ لیجئے۔ میں آپ لوگوں کی زبان میں اُسی روانی سے تقریر کر رہا ہوں۔ جس روانی سے مشنری صاحب نے بزعم خود حقایق و معارف کے دریا بہائے ہیں۔ میں نے ہندوستان ہی میں رہ کر تعلیم حاصل کی ہے۔ اَب مزید تعلیم کے لئے کیمبرج میں آیا ہوں۔ آپ میری شکل وصورت دیکھکر اور میری باتیں سُنکر خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ مشنری صاحب نے ہندوستان کے باشندوں کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ کہاں تک درست ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان مشرقی دنیا کا ایک متمدن و مہذب ملک ہے جس نے صدیوں تک تہذیب اور علم کی مشعل بلند رکھی ہے۔ اب اگرچہ ہم سیاسی طور پر اِنگلستان کے غلام ہو گئے ہیں۔ لیکن ہمارا اپنا ادب ہے۔ اپنا تمدن ہے، اپنی قومی روایات ہیں جو کسی طرح مغربی قوموں کی روایات سے کم شاندار نہیں ہیں مشنری صاحب

نے محض آپ کے جذبات کو برانگیختہ کر کے آپ کی جیبیں خالی کرنے کے لئے ہندوستانیوں کی یہ گھناؤنی اور خوفناک تصویر پیش کی ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ جونہی میری تقریر ختم ہوئی جلسے کا رنگ بالکل بدل گیا۔ سب لوگ میرے ہم خیال ہو گئے اور مشنری صاحب کو حد درجہ مایوس ہو کر وہاں سے خالی ہاتھ نکلنا پڑا۔

مسٹر جناح

۱۹۳۶ء کے آخری ایام تھے اور نئے آئین کے ماتحت صوبجاتی اسمبلیوں کے انتخابات کا زمانہ بالکل قریب آگیا تھا۔ ہندوستان بھر میں اضطراب اور کش مکش کی ایک لہر جاری تھی اور ہر جگہ اسی بات کا چرچا ہو رہا تھا۔ پنجاب میں اتحاد پارٹی اور مسلم لیگ کے درمیان زور آزمائی ہونے والی تھی۔ ڈاکٹر صاحب لیگ کے حامی اور مسٹر جناح کے بہت بڑے مداح تھے۔ ایک روز مسٹر جناح کی دیانت اور امانت اور قابلیت کا ذکر ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

"مسٹر جناح کو خدائے تعالیٰ نے ایک ایسی خوبی عطا کی ہے
جو آج ہندوستان کے کسی مسلمان میں مجھے نظر نہیں آتی۔"

حاضرین میں سے کسی نے پوچھا کہ وہ خوبی کیا ہے تو آپ نے انگریزی میں کہا:۔

"He is incorruptible and unpurchasable,

جسمانی یا روحانی معراج

اسی محفل میں ایک شخص نے کہا "لیکن ڈاکٹر صاحب! مسٹر جناح تو شیعہ ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے قدرے گرم ہو کر کہا "آپ یہاں بھی شیعہ سنّی کا جھگڑا

کھڑا کرنا چاہتے ہیں؟ جناح نے کب محدث، مفسر یا فقیہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے؟ اس بیچارے نے کب کہا ہے کہ وہ عالمِ دین یا امامِ وقت ہے؟ اس نے کہاں لکھا ہے کہ مسلمان اس سے کتاب و سنت کا درس لیں؟ مسلمانوں کی بدبختی کی انتہا ہے کہ وہ ہر بات میں شیعہ سنی کی تمیز کھڑی کر دیتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ انگریز نے ہندوستان میں پارلیمنٹری طرزِ حکومت کے نام سے اپنی شہنشاہیت کو مضبوط کرنے کا ایک جال بچھایا ہے۔ جناح اس جال کی ایک ایک گرہ سے واقف ہے وہ انگریزی سلطنت کی چالوں سے اس حد تک آگاہ ہے کہ خود انگریز بھی اس سے خائف ہیں۔ وہ بیچارہ صرف یہ کہتا ہے کہ مسلمان اس نظامِ حکومت کے ماتحت کہیں خسارہ نہ اٹھالیں۔ اس لئے وہ اپنی سیاسی بصیرت کی روشنی میں آپ کے ہوشیار ہو جانے کی تلقین کرتا ہے۔"

مجلس پر ایک خاموشی چھا گئی۔ چند منٹ کے بعد ڈاکٹر صاحب نے کہا۔ ایک اسی قسم کا واقعہ اور سنیئے۔

"جب میں ۱۹۲۶ء میں پنجاب کونسل کی رکنیت کے لئے لاہور کے حلقہ انتخاب سے کھڑا ہوا تو شہر کے بعض دوستوں نے چوک وزیر خاں میں ایک جلسہ منعقد کیا اور بہت اصرار سے مجھکو وہاں لیگئے۔ جلسے میں لوگوں نے مجھ سے تقریر کرنے کو کہا۔ میں نے مختصر سی تقریر کی اور بتایا کہ اس نظامِ حکومت میں قانون ساز مجالس کو کتنی اہمیت حاصل ہے۔ ان مجالس میں صرف ان لوگوں کو جانا چاہیئے جو آئین و دستور کے ضابطے سے اچھی طرح واقف ہیں۔ میں ابھی تقریر کر ہی رہا تھا کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر سوال کیا" یہ بتایئے کہ آپ آنحضرتؐ کی جسمانی معراج کے قائل ہیں یا روحانی معراج کے؟"

میں نے پوچھا کہ اس سوال کا یہاں کیا موقع ہے؟"

اُس نے کہا" ہم نے سُنا ہے کہ آپ جسمانی معراج کے قائل نہیں ہیں اگر یہ صحیح ہے تو ہم آپ کو ووٹ نہیں دینگے۔"

قندھار کا انار

۱۹۳۳ء میں نادر شاہ مرحوم بادشاہ افغانستان کی دعوت پر ڈاکٹر صاحب کابل تشریف لے گئے تھے۔ واپس آئے تو میں حاضر خدمت ہوا اور لوگ بھی بیٹھے تھے اور آپ سفر کے واقعات سنا رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ "آپ افغانستان سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کیا تحفہ لائے ہیں؟"

یہ سُنکر آپ مُسکرائے اور اپنے ملازم علی بخش کو آواز دے کر کہا کہ اُن کے حصے کا ایک انار اندر سے لے آؤ۔" علی بخش نے ایک نہایت خوش رنگ اور بہت بڑا انار لاکر مجھے دے دیا۔ مرحوم نے میری طرف دیکھ کر فرمایا" یہ خاص قندھار کا انار ہے۔ میں کابل سے واپسی پر غزنی قندھار اور کوئٹہ کے راستہ سے آیا ہوں۔ یہ راستہ بہت لمبا ہے۔ لیکن جن دلچسپیوں نے مجھے یہ طویل راستہ اختیار کرنے پر مجبور کیا اُن میں ایک یہ بھی تھی کہ میں قندھار کے انار رکھا سکونگا جانتے ہو جب احمد شاہ ابدالی نے ۱۷۶۱ء میں پانی پت کے میدان میں عظیم الشان فتح حاصل کی اور سارا ہندوستان اس کے قدموں پر آگرا تو کس چیز نے اُس کو ہندوستان کی بادشاہی چھوڑ کر واپس افغانستان جانے پر مجبور کیا تھا؟ اسی انار نے! نواب نجیب الدولہ اور دوسرے مسلمان سرداروں نے اس سے درخواست کی کہ آپ یہیں رہ جایئے تو اس مرد مجاہد نے جواب دیا کہ یہاں رہ جاؤں تو قندھار کے انار کیونکر کھاؤنگا؟"

غزنی

فرمایا کہ غزنی کی موجودہ آبادی سے ہٹ کر کچھ فاصلے پر بزرگوں کے

بے شمار مزار ہیں اِن مزاروں اور مقبروں کے چاروں طرف کھنڈر ہی کھنڈر ہیں۔ محمود غزنوی، سبکتگین کا مقبرہ ایک پہاڑی پر ہے۔ میں وہاں نہ چڑھ سکا البتہ سلطان محمود اور حکیم سنائیؒ کے مزاروں پر بیٹھ کر میں نے دیر تک قرآنِ کریم کی تلاوت کی ہے۔ اِن مزاروں کی زیارت سے روح کو ایک ایسی طمانیت اور بالیدگی نصیب ہوئی ہے کہ بیان نہیں کی جا سکتی۔ بالخصوص حکیم سنائیؒ کی قبر نے تو دل و دماغ کو انوار و تجلیات سے روشن کر دیا ہے۔ وہیں ایک شخص نے بتایا کہ قصبے کے اندر وہ جگہ اب تک محفوظ ہے جہاں حکیم موصوف مطب کیا کرتے تھے۔ میری طبیعت کو یہ جگہ دیکھے بغیر کیونکر قرار آسکتا تھا۔ چنانچہ اُسی روز اُس شخص کی رہنمائی میں میں وہاں پہونچا۔ غزنی کے بازار یوں بھی بہت تنگ ہیں۔ لیکن جس گلی میں حکیم سنائیؒ کا مطب تھا وہ تو غیر معمولی طور پر تنگ ہے۔ مطب کی یہ جگہ مٹی کے ایک کچے چبوترے کی صورت میں جس کا بمشکل دو گز طول اور دو گز عرض ہوگا محفوظ ہے۔ لوگ ادب سے اس کو ہر روز صاف کر دیتے ہیں میں دیر تک عالم محویت میں اس چبوترے پر بیٹھا رہا اور طبیعت نے سوز و گداز کی وہ نعمت پائی کہ اس کا اظہار لفظوں میں نہیں ہو سکتا۔"

حامد علیخاں

سر اقبال دے نال میل

"پیر خانے" دے اندر"

علامہ اقبال علیہ الرحمۃ سے ملاقات کی یہ دلچسپ تفصیل پنجابی رسالہ "سارنگ" بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۰ء میں چھپی تھی۔ اس رسالے کے ایڈیٹر ایک ہندو نوجوان مسٹر ایس۔ ایل پراشر تھے علامہ اقبال سے یہ ملاقات غالباً مسٹر ایس۔ ایل۔ پراشر نے خود کی تھی۔ میں نے اس مقالے کا لفظی ترجمہ کیا ہے اور حتی الامکان کوشش کی ہے کہ اصل پنجابی اندازِ بیان بڑی حد تک قائم رہے۔

آج ڈاکٹر سر اقبال کا نام دنیا میں بڑے فخر سے لیا جاتا ہے۔ سارے ہندوستان کو اس کی ذات پر ناز ہے۔ واقعی اقبال نے پنجاب کو سر اونچا کرنے کے قابل بنا دیا ہے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کو بہت کم یہ خیال آتا ہے کہ اقبال پنجاب کا رہنے والا اور پورا پکا پنجابی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ

اقبال کی ساری شاعری اردو یا فارسی زبان میں ہے۔ اور اس میں پنجاب کی زندگی یا پنجاب کی خوبصورتی کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی شاعری کا پیغام کسی خاص ملک کے لوگوں کے لئے نہیں بلکہ ساری دنیا کے لئے ہے۔ اس کی نظموں کے مردوں، عورتوں، پرندوں، جانوروں، گھاس، بوٹیوں، پھولوں اور پودوں کی اپنی کوئی اصلیت نہیں ہوتی۔ یہ سب خیال کی تخلیق ہیں۔ تخیل ہی انہیں پیدا کرتا ہے۔ تخیل ہی مارتا ہے اور تخیل ہی بٹھاتا اور اٹھاتا ہے۔ اقبال اپنے تخیل کی دنیا میں خیالوں کی آمد و شد کا تماشا دیکھنے میں مست ہو چکا ہے۔

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندِ دگر

خیالوں کا یہ کھیل اقبال کے لئے شطرنج کی بازی سے بھی زیادہ پر لطف ہے، وہ شاہ کو مات کرنے کی دھن میں لگا ہوا ہے۔ کسی وقت دم بھر کے لئے وہ حقے کا ایک آدھ کش لگاتا ہے اور پھر اپنی بازی میں محو ہو جاتا ہے۔ اسے کسی دوسری بات کی سدھ بدھ نہیں۔ کوٹھی کا احاطہ ویرانہ سا ہو رہا ہے۔ کلر اور خاک دھول کی کثرت سے جگہ اجڑی اجڑی لگتی ہے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی بیریوں کی ایک قطار کسی خانقاہ کے مجاور کے حجرے کی راہ دکھاتی ہے۔ صفائیوں کا کس کو دھیان ہے؟ کون یہاں بیٹھا گھاس پھول اگایا کرے؟ باہر کے حال کی کسی کو خبر بھی ہو!

ہمیں یاد ہے جب ہم اقبال صاحب سے ملنے گئے تو وہ بیٹھک[1] میں ایک آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے، سخت کالر لگا رکھا تھا اور پرانے زمانے کا

---

[1] یہ جاوید منزل سے پہلی کوٹھی کا ذکر ہے۔

کالا انگریزی سوٹ پہنے حقہ پی رہے تھے۔ شکل و صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی یونیورسٹی کے فلسفے کے استاد ہیں۔ پل بھر کے لئے ہم نے سامنے بیٹھے ہوئے وکٹورین[1] سے آنکھ بچا کر کمرے کی چیزوں پر ایک نظر ڈالی۔ ہمارے سامنے ہی انگیٹھی پر ملکۂ وکٹوریہ کی تصویر پڑی تھی۔ ہم بے مسکرائے بغیر نہ رہا گیا اور ہم نے اُن سے پوچھا "اس تصویر سے کوئی خاص پیار ہے؟ یا کسی خاص مطلب سے یہاں رکھی گئی ہے؟"

اُنھوں نے جواب دیا "یہ تصویر ایک دفعہ میرا بھائی کہیں سے لے آیا تھا اُس نے یہاں رکھ ڈالی ہے۔ اور یہ یہاں پڑی ہے۔ میں نے تو کبھی خیال ہی نہیں کیا کہ ہے بھی یا نہیں" یہ اقبال کا حال ہے۔ وہ اپنی دنیا میں مست ہے اُسے باہر کی چیزوں کے دیکھنے بھالنے کی فرصت ہی نہیں۔

اُنھوں نے خود ہی ہمیں بائیں ہاتھ کی دیوار پر دو میموں کی تصویروں کی طرف توجہ دلائی اور ہنس کر ایک مولوی صاحب کی بات سنائی:۔

"ایک دفعہ ایک مولوی میرے پاس آیا ہوا تھا۔ نماز کا وقت ہوا تو وہ اس کمرے میں نماز پڑھنی شروع کرنے لگا۔ لیکن ان تصویروں کو اپنے سامنے دیکھ کر رک گیا اور بولا "یہ تصویریں یہاں سے ہٹوا دیجئے"۔

میں نے کہا آپ اِن تصویروں کی طرف دھیان ہی نہ کیجئے یہ اس جگہ دیوار کا عیب چھپانے کے لئے لگائی گئی ہیں۔ لیکن مولوی نہ مانا۔"

ہم نے اقبال صاحب سے پوچھا کہ "آپ کا پنجابی بولی کے متعلق کیا خیال ہے؟" ان کا جواب یہ تھا کہ "پنجابی بولی اس وقت علمی زبان نہیں

---

[1] وکٹوریا کے زمانے کا آدمی۔ اس عہد کے فیشن کا پابند۔

اس میں نثر بہت کم ہے۔ لیکن کوئی وجہ نہیں کہ نثر کے لکھے جانے سے یہ علمی زبان نہ بن سکے۔ پنجابی میں "جھکاپن"[1] بہت ہے لیکن اس کی وجہ یہ رہی ہے کہ عام طور پر کم پڑھے لکھے آدمی ہی اسے پڑھتے لکھتے رہے ہیں۔ پڑھے لکھے آدمیوں کی ہمت سے اس میں لطافت اور نزاکت پیدا کی جا سکتی ہے پنجابی میں "بنتر" (From.) پر بہت کم زور دیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ بحروں کا لحاظ قائم نہیں رہتا۔ بہاولپور کے احمد یار نے تھوڑی بہت ہمت کی ہے۔ اس کا دعوے ہے کہ مجھ سے پہلے کسی نے بحر قافیئے اور ردیف کا اتنا خیال نہیں رکھا۔ پنجابی شاعری بڑی بڑھیا شاعری ہے اور خاص طور پر جذبات سے بھیگی ہوئی ہے۔ پنجابی شاعری کی زبان بڑی سیدھی سادھی نرم اور میٹھی ہوتی ہے، جذبات سچے ہوتے ہیں اور بڑے کھلے الفاظ میں بیان کئے جاتے ہیں۔ لیکن تشبیہوں میں بعض اوقات مذاق پست ہو جاتا ہے۔ ایک شعر میں نتھ کا بیان کرتے ہوئے شاعر کہتا ہے ؎

جے بنیسری جھک لباں تے آئی کوئی آب حیات ڈیہونے نوں
یا وَت پت جلیب حسن دی پئی کرڈاہ تلیونے نوں

(علی حیدر)

عشق کے رموز پنجابی میں خوب بیان کئے جا سکتے ہیں، لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں کہ پنجابی شاعری میں صرف مجازی عشق ہی ہوتا ہے نہیں بلکہ عشق حقیقی زیادہ ہوتا ہے۔ پنجابی شاعری تصوف سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات یوں معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی شاعری میں تصوف

---

[1] گنوارپن۔

کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ پنجابی شاعری میں ایک اور خصوصیت ہے۔ اِس میں وطن کی محبت کے متعلق بڑے پُر جوش گیت ملتے ہیں۔ فوجی گیتوں کی بھی کمی نہیں عام لوگوں کے گیتوں اور "بولیوں" کی تو کوئی حد ہی نہیں۔ اُردو میں تصوف کی شاعری ہے ہی نہیں۔ صرف ایک میر درد کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اُردو میں وطن کی محبت کی شاعری اور فوجی گیت بھی نہیں ہیں۔ اُس کی عشقیہ شاعری میں بناوٹ زیادہ اور جذبات کا زور کم ہے۔ عام لوگوں کے گیت تو اس میں بالکل نہیں ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اُردو شاعری درباروں اور امیروں اور مصاحبوں کے ہاتھوں میں پھلی پھولی ہے۔ وہ لوگ یا تو ایرانی تھے یا ایرانی مذاق کو پسند کرتے تھے۔ اُن کا میل جول عام لوگوں سے نہیں تھا۔ اِسی وجہ سے اُردو شاعری میں ایرانہ رنگت آگئی تھی۔ وہ شعر کہنے کو ایک فیشن سمجھتے تھے۔ شعر گوئی پر قدرت حاصل کرنا ہی شاعر کی خوبی سمجھی جاتی تھی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض اوقات صرف بحر قافئیے اور ردیف کی خاطر بناوٹی جذبے اور بناوٹی خیال گھڑنے کی ضرورت پڑتی تھی لیکن پنجابی کے لئے اُردو کی خوبیوں کی ضرورت ہے۔ پنجابی شاعروں کو اُردو شاعروں کی طرح "بندش[1]" پر قدرت حاصل کرنی چاہیئے اور اُردو شاعری کی قوت اور پاکیزگی پنجابی شاعری میں پیدا کرنی چاہیئے"

ہم نے اقبال صاحب کے بڑھے گاڑھے یار محمد حسین صاحب سے سن رکھا تھا کہ اقبال صاحب پنجابی شعر پڑھنے سننے کے بڑے شوقین ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ غلام قادر کی "چٹھیاں[2]" سنتے ہوئے وہ رو پڑے تھے۔ پھر بھی ہم پنجابی

---

[1] خیالات و الفاظ کی تراش خراش اور بناوٹ۔

[2] پنجابی گیتوں کی ایک قسم جس میں محبوب کے نام خط لکھا جاتا ہے۔

شاعری کی حقیقت سے اُن کی یہ واقفیت دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ اُنہوں نے اُردو شاعری سے مقابلہ کر کے دونوں زبانوں کی شاعری کے مذاق کا خلاصہ بیان کر دیا تھا۔ پنجابی شاعری کی بنیاد عام لوگوں کی زندگی پر ہے اور اُردو شاعری کی بنیاد امیروں اور مصاحبوں کی زندگی پر۔

اِس موقع پر ہمیں بہت افسوس آیا کہ پنجابی کی بہت سی کتابیں گورمکھی حروف میں ہیں جس کے باعث لوگوں کو پنجابی کے علمی خزانوں کا حال معلوم نہیں پنجابی بولی کے متعلق اقبال صاحب کے خیالات سن کر ہماری ہمت بندھی اور ہم نے پُوچھا کہ "کیا آپ کے لئے زبان کا سوال پیدا نہیں ہوا تھا؟ آپ کو پنجابی زبان میں لکھنے کا خیال کبھی نہیں آیا تھا؟"

اقبال صاحب نے جواب دیا "نہیں۔ میری تعلیم ہی کچھ ایسی ہوئی تھی کہ مجھے کبھی پنجابی لکھنے کا خیال نہیں آیا تھا اور نہ میں اب لکھ سکتا ہوں۔"

ہم نے پُوچھا "فارسی میں لکھنے کا خیال آپ کو کس طرح آیا؟"

اُنھوں نے جواب دیا "میں نے دیکھا تھا کہ فارسی میں میرے خیالات اچھی طرح ادا ہو سکتے ہیں دوسرے فارسی دنیا کے بہت سے حصّوں میں سمجھی جاتی ہے۔"

ہم نے کہا "ہمیں تو بڑا افسوس ہے کہ آپ کے سے جانے اور مانے ہوئے پنجابی نے اپنی زبان میں نہیں لکھا۔ پنجابی کو تو آپ جیسے آدمی کی ضرورت تھی۔ جس طرح گوئٹے نے اپنے وقت کی بے حقیقت جرمن بولی کو دُنیا کی ایک مسلمہ عظیم الشان زبان بنا دیا تھا اسی طرح آپ بھی پنجابی زبان کو ترقی دے سکتے تھے۔"

سر اقبال نے کہا "کوئی بولی بھی ہو ایک زبردست شخصیت اُسے بنا سکتی ہے

اور کوئی تعجب کی بات نہیں کہ پنجابی کو بھی کوئی گوئٹے جیسا آدمی مل جائے۔"

ہم سے یہ پوچھے بغیر نہ رہا گیا کہ کیا آپ نے یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ اپنی شخصیت کا پورا اظہار اپنی زبان کے سوا اور کسی زبان میں نہیں ہو سکتا؟"

انھوں نے جواب دیا "میں نہیں مان سکتا کہ اپنی زبان کے سوا آدمی اور کسی زبان میں اپنا مطلب پوری طرح بیان نہیں کر سکتا۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ زبان کا سوال اتنا اہم نہیں ہوتا۔ خواہ کوئی زبان ہو، صرف مشق ہونی چاہیئے۔ ہر ایک زبان میں لکھا جا سکتا ہے۔ اصل چیز تو خیال ہے۔"

ہم اقبال صاحب کے اس جواب پر حیران ہوئے کہ ایک شاعر کا یہ خیال ہے کہ آدمی اپنی نج کی زندگی کا "اظہار" پرائی بولی میں کر سکتا ہے۔ مگر ہم سمجھ گئے کہ انھوں نے صرف اپنی شاعری کو پیش نظر رکھا ہے جس میں زیادہ تر تخیل کا اتار چڑھاؤ دکھایا گیا ہے۔

ہم نے پھر کہا "معاف کیجئے آپ کا عقیدہ کہ زبان کا سوال اتنا اہم نہیں ہوتا ایک ناول یا ڈراما لکھنے والے کے لیے کس طرح درست ہو سکتا ہے؟ ناول یا ڈراما لکھنے والے کو بہر حال لوگوں کی زندگی سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس کے لئے لوگوں کی زبان استعمال کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا "ہاں ناول یا ڈراما لکھنے کے لئے لوگوں کی زبان استعمال کرنی پڑتی ہے۔ اگر کوئی شخص پنجابی ناول یا ڈرامے لکھنا چاہیے تو کیا حرج ہے اگر وہ پنجابی میں لکھے۔"

ہم نے کہا "کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر رچرڈ کا خیال ہے کہ ایک بدیشی آدمی دوسرے ملک کی شاعری سے پوری طرح لطف نہیں اٹھا سکتا۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

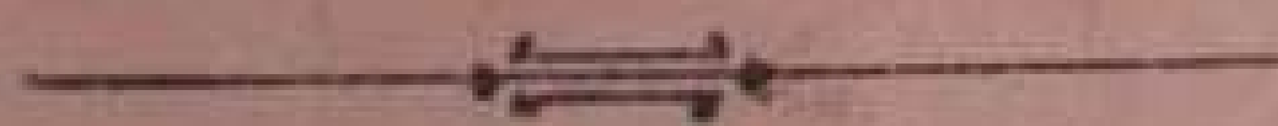
اقبال صاحب کے جواب نے اُن کی صفائی پیش کر دی۔ انھوں نے کہا "میں ایسی شاعری کو شاعری نہیں سمجھتا۔ اصل شاعری روح کی شاعری ہوتی ہے۔ اور وہ ساری دنیا کے لئے ہوتی ہے۔" گفتگو کا رُخ بدلنے کے لئے اقبال صاحب نے قرآن کی ایک آیت پڑھی جس کا مطلب بابا نانک کے الفاظ میں یہ ہوتا ہے:۔ رَل مِل بیٹھو صفا بچھائے۔

يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ۔۔۔ (قرآن مجید)

مطلب یہ ہے کہ ہم سب خدا کو مانتے ہیں ہمیں مِل جُل کر رہنا چاہیے اور مشترک اصولوں پر ہمیں متحد ہو جانا چاہیے۔

ہم نے کہا " تو پھر آپ کی شاعری میں مسلمانوں سے خطاب، ایسے ہی مسلمانوں کے لئے ہوتا ہے؟"

اُن کا جواب تھا "ہاں آپ نے ٹھیک بوجھ لیا ہے۔"



پروفیسر خواجہ عبدالحمید
لکچرار گورنمنٹ کالج ملتان

اقبال کے علمی جواہر ریزے

ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال علیہ الرحمۃ سے پہلی بار ملاقات کا شرف مجھے نومبر ۱۹۲۲ء میں حاصل ہوا۔ اس سے پہلے میں اپنی طالب علمی کے زمانہ سے بیسیوں بار ان کو دور سے دیکھ چکا تھا، اسلامیہ اسکول لاہور کی طالب علمی کے زمانہ میں جب کبھی انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں ڈاکٹر صاحب تشریف لاتے تو ہر شخص کی زبان پر ہوتا "آج ڈاکٹر اقبال نے آنا ہے"۔ ہر کس و ناکس وہاں موجود ہوتا، آپ بالعموم لے سے اپنی نظم پڑھا کرتے تھے۔ پہلی نظم جو میں نے ان کی زبان سے بغیر ترنم کے سنی "شکوہ" تھی، اس کے بعد "شمع و شاعر" اور "جواب شکوہ" (جو موچی دروازہ کے باغ میں پڑھی گئی) پھر دوبارہ ترنم "خضر راہ" سے شروع ہوا جو اسلامیہ اسکول دروازہ شیرانوالہ کے صحن میں پڑھی گئی تھی ان دنوں ڈاکٹر صاحب کی طبیعت قدرے علیل تھی اس لئے نظم مذکور

گاؤ تکیہ کے سہارے بیٹھ کر پڑھی تھی۔

اس زمانہ سے پہلے مجھ جیسے شخص کے لئے ڈاکٹر صاحب کا نام، ان کی شکل و صورت اور اُن کا ترنم ہی باعثِ کشش ہوتا تھا۔ اسکول اور کالج کے زمانہ میں ہر مسلمان طالب علم کو ڈاکٹر صاحب کے کچھ نہ کچھ اشعار (اور لاہور میں تو ہر ملت کے طلبہ کو) یاد ہوتے تھے اور مجلسیں ان اشعار کے ترنم سے گرمائی جاتی تھیں، کالج کے زمانہ میں میں ڈاکٹر صاحب کو ہر روز مشن کالج کے دروازہ سے باہر والی سڑک پر اپنی مختصر سی گاڑی (ڈگ) میں چیف کورٹ سے واپس آتے دیکھتا تھا، چہرہ سرخ، سنہری موچھیں، سرخ ترکی ٹوپی اور سیاہ سوٹ، ہاتھوں میں گھوڑے کی باگ۔ غرض اسی شان سے ہر روز تفریح کی گھنٹی میں مجھے دور سے ان کی زیارت نصیب ہوتی تھی۔ لاہور میں ہم لوگوں میں "ڈاکٹر صاحب" کا لقب، "صرف اقبال" ہی کے لئے وقف تھا، اس لئے آئندہ سطور میں اسی لقب سے یاد کرونگا۔

نومبر ۱۹۲۰ء میں ہندوستان بھر میں تحریک عدم تعاون زوروں پر تھی، لاہور میں کانگریس کے کارکنوں کی خاص توجہ اسلامیہ کالج کی طرف مبذول تھی، مسلمان اور ہندو اکابر لاہور میں جمع تھے اور ان کی ہدایات کے مطابق کانگریسی کارکنوں نے اسلامیہ کالج میں "جماعتوں" کا کام تقریباً ناممکن کر دیا تھا خود اسلامیہ کالج کی ہستی معرضِ خطر میں تھی، ڈاکٹر صاحب ان دنوں

انجمن حمایت اسلام لاہور کے جنرل سکرٹری تھے، چنانچہ ایک روز کالج کے چند پروفیسروں نے (جن میں راقم الحروف بھی شامل تھا) فیصلہ کیا کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں چلکر اِن متضاد فتووں اور قراردادوں کے متعلق، جن کی بارش ہر سمت سے کالج پر ہو رہی تھی، ان کی رائے دریافت کی جائے، ڈاکٹر صاحب اس وقت انارکلی والے مکان میں مقیم تھے اور حسب عادت آرام کرسی پر بیٹھے تھے، حقہ پاس تھا۔ (میں نے اُنھیں اُن کے قیام گاہ میں حقہ کے بغیر کبھی نہیں دیکھا) ڈیڑھ دو گھنٹوں تک تحریک عدم تعاون کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہوتی رہی، اس سے معلوم ہوا کہ ابھی اُنھوں نے اِس تحریک کی ضرورت اور صحت کے متعلق کوئی قطعی رائے قائم نہیں کی۔ گاندھی جی کی اُنھوں نے بہت تعریف کی، اور جو کام وہ ہندو قوم کی بہتری کے لئے کر رہے تھے، اُسے مدنظر رکھتے ہوئے فرمانے لگے کہ کوئی تعجب نہ ہوگا، اگر ہندوؤں کی آیندہ نسلیں اُنھیں اوتار تسلیم کریں، ہم لوگوں نے دریافت کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے، ظریفانہ انداز میں فرمایا "جس قدر کام کالج میں ہو سکتا ہے، کرتے جاؤ، ہاں بھئی یہ ڈر ہے کہ کالج ٹوٹ نہ جائے اور آپ لوگوں کو تلاش روزگار کی زحمت اُٹھانی پڑے، سو میرا مشورہ یہ ہے کہ ایک وقت کا کھانا کاٹ دو، میں نے بھی یہ کام شروع کیا ہے، اور میری صحت پر اس کا اثر بہت اچھا پڑا ہے" اِس پر قہقہہ پڑا اور ہم لوگ واپس آئے :

اِس کے بعد مجھے گاہے گاہے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملتا رہا، اور ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۷ء تک تو شاید کوئی ہفتہ ایسا نہ تھا جس میں ان کی خدمت میں ایک یا دو بار حاضری کا اتفاق نہ ہوا ہو۔ اِن صحبتوں میں طرح طرح کی باتیں ہوتی تھیں۔ اگر کوئی اور صاحب موجود نہ ہوتے تو میں ان سے بعض باتوں اور مسائل کے متعلق سوالات کرتا جن کا وہ کمال مہربانی سے شافی جواب مرحمت فرماتے؛

میرے ذمہ ایک فرض یہ تھا کہ فلسفہ اور جنرل سائنس کے متعلق جو اچھی اور تازہ چھپی ہوئی کتاب نظر سے گزرے اسے ان کی خدمت میں پیش کروں، اور پیش کرنے سے پہلے پڑھ لوں چنانچہ کتاب لیتے وقت وہ مجھ سے اس کے متعلق رائے پوچھتے ہوئے اچھا خاصہ اِمتحان لے لیا کرتے تھے؛

ڈاکٹر صاحب کی زبان فیض ترجمان سے جو ہزار ہا جواہر ریزے بکھرتے رہے ہیں، ان میں سے چند کو (جو مجھے یاد ہیں اور جن میں کوئی ایسی بات نہیں جو کسی کے لئے بار خاطر ہو) میں نے یہاں جمع کیا ہے، ان میں ان باتوں کو درج نہیں کیا ہے جن میں ملی یا سیاسی معاملات پر تفصیلی بحث تھی، یا جن میں فلسفہ یا سائنس کے دقیق مسائل پر بحث تھی، ایسی باتوں کو بھی ترک کر دیا گیا ہے جن کا تعلق ذاتیات سے ہے، ایسی باتیں بھی نہایت پُر لطف اور سبق آموز ہوتی تھیں۔ لیکن ان کا شائع کرنا مناسب نہیں؛

ڈاکٹر صاحب کی یاد اُن کے عقیدت مندوں کے دلوں میں ابھی تازہ ہے، وقت گزرتا جائے گا اور ان کی شخصیت کے خط و خال ذہن میں دھندلے پڑتے جائیں گے، اس وقت ہر اُس شخص کے پاس جو اُن کی خدمت میں حاضر ہوا (اور ایسے اشخاص کی تعداد ہزار ہا ہے) ان کا کوئی نہ کوئی ذہنی تبرک ضرور موجود ہے، اِس لئے ضرورت ہے کہ ان تبرکات کو جمع کر دیا جائے، افسوس ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو زندگی میں کوئی بوسول (Boswell.) نہ ملا، اِس لئے درخواست ہے کہ جن بزرگوں اور دوستوں کو ان سے ملنے کا اکثر اتفاق ہوا ہو وہ ان کے جواہر ریزوں کو ضائع ہونے نہ دیں اور جلد تر اُنھیں دُنیا کے سامنے پیش کریں۔ ڈاکٹر صاحب کے سیرت نگاروں کو اس مواد سے فائدہ پہنچنے کی اُمید ہے۔

(عبد الحمید)

(۱) ایک روز طہارت کے اِسلامی قواعد کا ذکر اتفاقاً چھڑ گیا، اِس سلسلہ میں غیر مسلم قوموں کی طہارت بھی معرض بحث میں آئی۔ ڈاکٹر صاحب فرمانے لگے "میں جب طالب علمی کے سلسلہ میں اِنگلستان گیا تو میرا لوٹا میرے ساتھ تھا، میں جب کبھی رفع حاجت کے لئے غسل خانہ جاتا، تو میرا لوٹا میرے ساتھ ہوتا، چند روز اسی طرح سے گزرے، آخر میری میزبان یعنی مالکۂ مکان (Land lady.) سے رہا نہ گیا (یہ خاتون پچاس سال کے لگ بھگ ہونگی اور میرے ساتھ نہایت مہربانی سے پیش آتی تھیں) مجھ سے پوچھنے لگیں یہ چیز تم غسل خانے میں کیوں لیجاتے ہو، میں نے اُن سے کہا کہ اِسلامی طہارت کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ قضائے حاجت کے بعد صرف کاغذ یا مٹی کے ڈھیلے کا اِستعمال کافی نہیں ہے، بلکہ پانی سے اِستنجا کرنا بھی

ضروری ہے، چنانچہ اِس موضوع پر گفتگو شروع ہوئی، میں (یعنی ڈاکٹر صاحب) نے اُن کے سامنے طہارت اور غسل کے اِسلامی اُصول بیان کئے۔ مثلاً یہ کہ غسل جنابت مسلمان مرد اور عورت پر اسی طرح فرض ہے جس طرح عورت پر طہر کا غسل۔

میں نے کہا، بڑی بی، کسی خاص غسل کی تو آپ کو اَب حاجت نہ ہوگی، البتہ طہارت کے لئے پانی ضرور استعمال کیا کیجئے۔ یہ باتیں سن کر بڑی بی بہت خوش ہوئیں اور فرمانے لگیں کہ ضرور ایسا کرونگی، مسلمانوں کے یہ قواعد نہایت پاکیزہ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ سائنس داں اور اہل طب کو اِسلامی قواعد طہارت کا گہرا مطالعہ کرنا چاہیئے اور اِس سلسلہ میں جو کام اہل فقہ نے کیا ہے اسے بغور پڑھنا چاہیئے۔

(۲) "یہود" کا لالچ اور دولت کا عشق ضرب المثل ہے، اس کے متعلق کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب سے میری گفتگو ہوئی، ایک مرتبہ مثال کے طور پر فرمانے لگے کہ جب میں انگلستان گیا تو میں نے ڈاکٹر آرنلڈ صاحب سے یہ خواہش کی کہ میرے قیام کا اِنتظام ایسے گھر میں کروا دیا جائے جہاں ذبیحہ کا خاص انتظام ہو، یورپ میں صرف یہود اس بات کا خاص طور پر خیال رکھتے ہیں کہ صرف اپنا ذبیحہ کھائیں چنانچہ ایک اچھے یہودی گھر میں میری رہایش کا اِنتظام کروا دیا گیا، ان لوگوں میں بہت خوبیاں تھیں، اپنی "نماز" باقاعدہ پڑھتے تھے، جب میں گھر میں ہوتا تھا تو میں بھی شریک ہو جاتا تھا۔ میں نے اُن سے کہا کہ مسلم ہونے کی وجہ سے حضرت موسیٰؑ میرے لئے بھی پیغمبر ہیں۔ اور میں اُن کی روش پر چل سکتا ہوں، وغیرہ، لیکن کچھ عرصہ کے بعد میرا دل ان لوگوں کی طرف سے کھٹا ہو گیا، مجھے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ ہر اُس چیز میں جس کی مجھے ضرورت ہوتی تھی اور جس کو میں

ان کے ذریعہ سے منگواتا تھا، یہ لوگ دوکانداروں سے کمیشن لیا کرتے تھے، ان کی اسی ایک عادت نے ان کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیا۔

(۳) ہندوستانی مذاہب پر ایک روز مجھ سے باتیں کر رہے تھے، بدھ مت کا ذکر آگیا، فرمانے لگے "انگلستان میں طالب علمی کے زمانہ میں مجھے ہر روز شام کے وقت اپنی قیام گاہ کی طرف ریل گاڑی میں سفر کرنا پڑتا تھا، یہ گاڑی ایک جگہ ختم ہوتی تھی، اور سب مسافروں کو سامنے والے پلیٹ فارم پر دوسری گاڑی میں سوار ہونا پڑتا تھا، گاڑی جب اسٹیشن پر پہونچتی تو گارڈ بلند آواز سے پکارتا All change (یعنی مسئلۂ تناسخ) یعنی سب بدل جاؤ ایک روز میں حسب معمول گاڑی میں بیٹھا تھا، کہ میرے اردگرد اخبار بین مسافر آپس میں بدھ مذہب کے متعلق باتیں کرنے لگے، ایک صاحب نے میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ صاحب غالباً ایشیائی ہیں ان سے بدھ مذہب کے متعلق پوچھنا چاہیئے، چنانچہ مجھ سے پوچھا گیا، میں نے کہا، ابھی جواب دیتا ہوں، یہ کہہ کر چپ رہا، چند منٹوں کے بعد انھوں نے مجھ سے دوبارہ پوچھا، میں نے پھر کہا ابھی جواب دیتا ہوں، وہ کہنے لگے، شاید آپ جواب سوچ رہے ہیں۔ میں نے کہا ہاں، اس دوران میں اسٹیشن آگیا، اور گارڈ (all change.) یعنی مسئلۂ تناسخ پکارنے لگا، میں نے کہا بس یہی بدھ مذہب ہے۔

(۴) کیمبرج کے زمانہ میں چند ہمعصروں سے مذہب پر بحث چھڑ گئی، ایک صاحب پوچھنے لگے مسٹر اقبال یہ کیا بات ہے کہ جتنے بھی پیغمبر اور بانیان مذہب دنیا میں آئے۔ وہ بلا استثناء ایشیا میں مبعوث ہوئے، یورپ میں ایک بھی پیدا نہیں ہوا، ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا، بھئی شروع شروع میں اللہ میاں

اور شیطان نے اپنا اپنا پتیرا جمالیا، اللہ میاں نے ایشیا کو پسند کیا اور شیطان نے یورپ کو، اسی لئے پیغمبر جو اللہ میاں کی طرف سے آئے ہیں ایشیا میں مبعوث ہوئے، وہ صاحب بول اُٹھے تو پھر شیطان کے پیغمبر کیا ہوئے؟ اُنھوں نے جواب دیا، یہ تمھارے میکا ئیولی اور مشہور اہل سیاست اس کے رسول ہیں، اس پر بہت قہقہہ پڑا۔

(۵) یورپ اور انگلستان میں اس وقت بھی ہزاروں اشخاص ایسے موجود ہیں جن کے خیال میں ہندوستان میں صرف بڑے بڑے دریا، پہاڑ، جنگل، بیابان، چند بڑے بڑے شہر، شیر، سانپ، بچھو، سپیرے اور جنگلی لوگ پائے جاتے ہیں، یہ خیال بہت کچھ یورپین پادریوں، سرکاری ملازموں اور سیاحوں کی جدتِ طبع کا مرہون منت ہے۔ اسی طرح سے یہ لوگ اپنی بہادری اپنے ہمعصروں پر جتا سکتے ہیں۔ اور گپیں ہانک کر مجلسوں کو گرما سکتے ہیں۔ چنانچہ طالب علمی کے سلسلہ میں جب اقبال انگلستان گئے (یہ ۱۹۰۵ء کا زمانہ تھا) تو انھیں بھی اس طرز خیال کا تجربہ ہوا، ایک مجلس میں ایک لیڈی صاحبہ پُوچھنے لگیں، کیوں مسٹر اقبال، کیا آپ کے پلنگ کے نیچے بھی ہر روز صبح کے وقت سانپ ہوتا تھا؟ ڈاکٹر صاحب نہایت سنجیدگی سے بولے، نہیں بی جان، ہر روز نہیں، ہر تیسرے دن۔

(۶) ایک مرتبہ ایشیا اور یورپ کے باہمی فرق و امتیاز کا ذکر ہو رہا تھا۔ میں نے پُوچھا کیا ایشیا اور یورپ کی عورتوں میں بھی وہی فرق ہے جو ان ممالک کے مردوں کے درمیان ہوتا ہے؟ اس سلسلہ میں میں نے انگریز اور جرمن عورتوں کے باہمی امتیاز اور فرق کے متعلق ڈاکٹر صاحب سے پوچھا (انگریز اور جرمن عورتوں کی تخصیص اس لئے کی تھی کہ ڈاکٹر صاحب طلب علم کے زمانے میں

زیادہ تر ان ہی دونوں ملکوں میں رہے تھے) فرمایا "انگریز عورت میں وہ "نسائیت" اور "بے ساختگی" نہیں جو جرمن عورت میں ہے، جرمن عورت ایشیائی عورت سے ملتی جلتی ہے، اس میں محبت کی گرمی ہے، انگریز عورت میں یہ گرمی نہیں، انگریز عورت گھریلو زندگی اور اس کی بندشوں کی اس طرح شیدا نہیں جس طرح کہ جرمن عورت ہے"۔ میں نے عرض کیا آپ کے اس خیال کی تصدیق مسٹر ڈبلیو، ٹی، سٹیڈ۔

(W. T. Stead.) (جو انگلستان کے مشہور ریاست دان تھے اور کسی زمانہ میں انگریزی رسالہ ریویو آف ریویوز کے مدیر بھی تھے) کے ایک قول سے ہوتی ہے، جو اس وقت مجھے یاد ہے، ایک موقع پر انھوں نے یہ کہا تھا کہ جرمن عورتیں درحقیقت پردہ میں ہیں (یہ قول زمانہ قبل از جنگ کا ہے، لیکن کوئی تعجب نہیں اگر اب بھی صحیح ہو) انگریز اور امریکن عورتوں کی آزادی کے مقابلہ میں جرمن عورتیں تقریباً پردہ ہی میں ہیں۔

(۷) طلب علم کے سلسلہ میں جب ڈاکٹر صاحب لندن میں تھے۔ تو سر سید علیہ الرحمۃ کے ایک رفیق جن کا اِسم مبارک مولوی . . . . . صاحب تھا (غالباً آپ ایڈوکیٹ تھے) سیاحت کے سلسلہ میں یورپ کی سیر کرتے ہوئے اِنگلستان پہنچے (ان بزرگ کو میں نے ۱۹۱۰ء میں مسلم یونیورسٹی کے وفد میں لاہور میں دیکھا تھا، میں اِن دنوں اسلامیہ اسکول میں پڑھتا تھا اس وقت مولوی صاحب شکل وہیئت میں بالکل سر سید کا مثنیٰ تھے۔ وہی لمبی ترکی ٹوپی، لمبی سفید داڑھی، سیاہ مارننگ ڈریس، الغرض چھوٹے پیمانے پر سر سید معلوم ہوتے تھے) پروفیسر ٹی، ڈبلیو، آرنلڈ جنھیں اِقبال سے شغف تھا اور جن کی توجہ سے اقبال گورنمنٹ کالج لاہور میں ہی مستفید ہوئے تھے، ان دنوں لندن یونیورسٹی

یں عربی کے پروفیسر تھے، اور اقبال کے مربی خاص تھے، بلکہ جب پروفیسر موصوف چند ماہ کے لئے مصر تشریف لے گئے تو اقبال ہی کو وہ اپنا جانشین بنوا کر گئے تھے :

مولوی صاحب لندن میں تشریف لائے، چونکہ پروفیسر آرنلڈ سرسید مرحوم کے حلقۂ اثر بلکہ خود علی گڈھ کالج میں رہ چکے تھے، اس لئے مولوی صاحب ان ہی کے پاس گئے، انھوں نے اقبال کو حکم دیا کہ بھئی مولوی صاحب کو لندن کی تمام قابل دید جگہیں اور چیزیں دکھا دو ...... اقبال نے نہایت تندہی سے مولوی صاحب کو جگہ جگہ پھرایا اور شام کے قریب کسی قہوہ خانہ میں جا بٹھایا، وہاں چائے اور قہوہ کے علاوہ چند ستم پیشہ لڑکیاں بھی موجود تھیں، اور خدا جانے اقبال کے اشارے یا خود اپنی جولانی طبع سے وہ مولوی صاحب قبلہ کے گرد جمع ہو گئیں، کوئی مولوی صاحب کو قہوہ پینے کی تلقین کرتی کوئی ان کی نورانی داڑھی پر شیدا تھی، ایک دو نے تو شاید مولوی صاحب کے رخساروں پر عقیدت مندی کی ایک دو مہریں بھی جڑ دیں، اس مصیبت سے جب اُن کو نجات ملی تو وہ غصہ سے بھرے ہوئے پروفیسر آرنلڈ کی خدمت میں پہنچے اور اقبال کی شکایت کی، دوسرے روز جب اقبال، پروفیسر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ بہت خفا تھے۔ فرمانے لگے، اقبال تم لندن میں آکر بے حد شریر ہو گئے ہو، تمھیں شرم نہ آئی، مولوی صاحب ایسے بزرگ کو اِس قہوہ خانے میں لے گئے، اقبال نے نہایت متانت سے جواب دیا، " قبلہ آپ نے مجھے حکم دیا تھا کہ لندن کی تمام قابل دید جگہیں مولوی صاحب کو دکھاؤں، اگر میں مولوی صاحب کو صرف لندن کا عجائب خانہ، چڑیا گھر، محلات، تاریخی عمارتیں، وغیرہ ہی دکھلا دیتا تو وہ لندن کے متعلق سخت غلط فہمی میں مبتلا رہتے۔

اور ہندوستان جاتے ہوئے، لندن کے متعلق نہایت غلط اور یک طرفہ خیالات لے کر جاتے، لندن کی زندگی میں قہوہ خانوں کا رُخ خواہ برا ہو یا بھلا بہت اہم ہے، اسی لئے میں نے مناسب سمجھا کہ مولوی صاحب کو یہ تاریک پہلو بھی دکھا دوں میں اُنھیں جان بوجھ کر وہاں لے گیا تھا، اقبال کا یہ خیال کہ زندگی کا ہر پہلو دیکھنے سُننے اور تجربہ کرنے کے لائق ہے، اُن کے اسلامی فلسفہ کا ایک اہم رُکن تھا (اِسی خیال سے مجبور ہو کر اُنھوں نے سوامی۔ بی کے سوانح نگاروں کو ٹوکا تھا دیکھئے نیچے فقرہ نمبر (۸)

(۸) جسم اور روح کی جو غلط تقسیم پُرانے زمانے سے فلاسفہ اور مذاہب میں ہو چکی ہے، اس کے بُرے نتائج میں سے سب سے بُرا نتیجہ یہ ہے کہ عام مذاہب میں جسم اور اُس کی خواہشات کو بُرا کہا گیا ہے، لیکن اسلام میں نہ "جسم" کو کبھی بُرا کہا گیا اور نہ جسمانی لذات کو کوسا گیا ہے، صرف اس کی حدیں مقرر کر دی گئی ہیں، جو شخص اسلامی حدود کے اندر رہ کر جسمانی لذّات حاصل کرے اس سے مواخذہ نہیں، اور نہ وہ گنہگار ہے، البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ اِن لذات میں ترتیب کا لحاظ رکھے اور اعلیٰ کو ادنیٰ کے لئے قربان نہ کرے، دوسرے مذاہب کے بانی اور پیرو لذاتِ جسمانی سے اس قدر متنفر ہیں، کہ خود "جسم" کا وجود ہی گناہ تصور کیا جاتا ہے اور اس گناہ کا کفارہ صرف یہ سمجھا جاتا ہے کہ ہر طرح سے "جسم" کو ایذا دیجائے اور جسمانی لذّات کے حصول کو گناہ کبیرہ سمجھا جائے، ادھر "جسم" میں خودی ہے، جس قدر اس کو ٹھکراؤ بگڑتا ہے دباؤ اُبھرتا ہے، لذّات سے محروم رکھو تو ہر وقت ان ہی کی فکر میں رہتا ہے ڈاکٹر صاحب نے اِس اسلامی تعلیم کو بار بار اور نئے نئے رنگ میں اپنی تصانیف میں بیان کیا ہے:

قریباً بارہ یا تیرہ سال ہوئے ہیں ایک روز شام کے وقت ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، باتوں باتوں میں یہی مسئلہ معرض بحث میں آگیا۔ فرمانے لگے "ابھی چند ہی روز ہوئے کہ مجھے اس اسلامی تعلیم کی صحت کا ثبوت ضمناً ذکر کرنا پڑا۔ دو تین ہندو صاحبان میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم نے رشی سوامی جی کی سیرت لکھی ہے، آپ چونکہ سوامی جی کے گہرے دوست تھے؛ اِس لئے آپ اس سیرت پر نظرِ ثانی فرمائیں اور ہمیں مزید مواد دیں، بلکہ خود بھی کچھ لکھیں وغیرہ" ڈاکٹر صاحب نے کہا جو سیرت آپ نے لکھی ہے، دکھایئے، ڈاکٹر صاحب نے کتاب کو جستہ جستہ دیکھا، یہ سیرت بالکل اسی طرح سے لکھی گئی تھی جیسے اِس نوع کی کتابیں بالعموم لکھی جاتی ہیں، یعنی ممدوح کو فرشتہ سیرت، ولی اور ہر قسم کی لغزشوں اور نقائص سے مبرا اور منزہ ثابت کرنا۔ ڈاکٹر صاحب نے ان سے فرمایا آپ لوگوں نے سوامی جی کی زندگی سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا، اور نہ اس درسِ عبرت کا جو ان کی زندگی سے حاصل ہو سکتا ہے، اِس کتاب میں ذکر ہے، انھوں نے پوچھا وہ کیا، فرمایا آپ کو معلوم ہے کہ فلاں سال سوامی جی اپنی تعلیم ہمہ اوست، اور "برہمچاریہ" کے پرچار کے لئے امریکہ تشریف لے گئے تھے، وہاں بعض لوگ جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھے، ان کے حلقۂ اثر میں آگئے، ان میں ایک مریدنی ضرورت سے زیادہ فیضیاب ہوئی، لیکن واپسی پر سوامی جی اس عورت اور بچہ دونوں کو امریکہ ہی میں چھوڑ آئے، یہ واقعہ ایک نہایت اہم اور عبرت آموز سبق ہے جو سوامی جی کی زندگی سے حاصل ہوتا ہے، کہ وہ خود "برہمچاریہ" کو نباہ نہ سکے اور اپنے اس فعل سے انھوں نے اپنی تعلیم کو غلط ثابت کر دکھایا، لیکن بجائے اس کے کہ وہ اس غلط تعلیم

اور غلط اصول کو چھوڑتے، اُنھوں نے اپنی ناکامی کو چھپانا چاہا، اور اس وجہ سے اُنھوں نے بچہ اور اُس کی ماں کو امریکہ میں چھوڑ کر ایک اخلاقی گناہ کا ارتکاب کیا، آپ لوگوں کا فرض تھا کہ سوامی جی کی زندگی کے اس اہم واقعہ کو کھول کر بیان کرتے تاکہ معلوم ہوتا کہ وہ اپنی تعلیم میں جس کے لئے اُنھوں نے اپنی زندگی وقف کردی تھی کس حد تک کامیاب رہے ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کی یہ بات ان دوستوں کو کیوں بھاتی، کہنے لگے، جناب والا اِن باتوں کو کتابوں اور سیرتوں میں لکھنا نہیں چاہیئے۔ یہ کہہ کر واپس چلے گئے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ سوامی جی سے آپ کی دوستی کس زمانہ میں تھی، فرمایا کہ لاہور میں طالب علمی کے زمانہ ہی میں میری ان سے دوستی بڑھ گئی تھی، میں نے انھیں مثنوی مولانا روم سے آشنا کیا تھا، بلکہ پڑھائی بھی تھی، سوامی جی سے میں نے سنسکرت سیکھنا شروع کی تھی، ڈاکٹر صاحب سوامی جی کے خلوص نیت اور روحانی سرشاری کے بہت معترف تھے، اور اسی لئے وہ سوامی جی کے برہمچاریہ کی ناکامی میں اُن کی حیات کا اہم ترین سبق پاتے تھے، یعنی جو بات سوامی جی سے بھی نبھ نہ سکی وہ ہے غلط۔

(۹) چند سال ہوئے ایک جرمن یا آسٹرین سیاح ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا آپ اُس زمانہ میں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں مقیم تھے، سیاح صاحب "جہاں گرد" Globe Trotter تھے، علی بخش (ڈاکٹر صاحب کا ملازم) نے اسے پہلے دیکھا تو معلوم ہوا کہ پٹھانستان کا کوئی فقیر ہے، اُسے اندر بلوایا گیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، اُس نے ڈاکٹر صاحب کو اپنی 'بیاض' دکھائی جس میں ہر ملک کے مشہور و معروف لوگوں نے اپنے اپنے ہاتھ سے کچھ نہ کچھ لکھا تھا، سیاح مذکور نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی کہ آپ بھی اس میں کچھ لکھدیں،

اُنھوں نے فارسی کا ایک قطعہ لکھکر دستخط کر دیئے، اس نے پُوچھا آپ کس چیز کی تعلیم دیتے ہیں؟

جواب میں فرمایا میرے آباء و اجداد برہمن تھے، اُنھوں نے اپنی عمر اس سوچ میں گزار دیں کہ خدا کیا ہے، میں اپنی عمر اسی سوچ میں گزار رہا ہوں کہ اِنسان کیا ہے۔

(۱۰) ۱۹۲۵ء میں ایک روز شام کے وقت میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر تھا کہ علی بخش نے اطلاع دی کہ چند طالب علم ملنے کو آئے ہیں، جاڑے کا موسم تھا، ڈاکٹر صاحب بڑے کمرے میں بیٹھے تھے، (بالعموم وہ شام کے وقت بستر پر بیٹھتے تھے اور ملاقاتی وہیں کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے) لڑکے اندر آئے، یہ اِسلامیہ کالج کے طلبہ تھے، میں چونکہ اِسلامیہ کالج میں ملازم تھا، اس لئے ان کی گفتگو سُننا چاہتا تھا، مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں وہ شام کے وقت وفد کی صورت میں کیوں حاضر ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے دریافت فرمایا "کیوں بھئی کیسے آئے" اُنھوں نے جواب دیا کہ ایک مشاعرہ کرنے کا اِرادہ ہے۔ جناب والا اگر اس کی صدارت قبول فرمائیں تو عزت افزائی ہوگی اور لوگ بھی بہت جمع ہوں گے، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "صدر" تو میں کسی مجلس یا جلسہ کا بننا نہیں چاہتا، البتہ "شعر بازی" سے تمھیں روکتا ہوں، اس وقت ہندوستان کو اور بالخصوص مسلمانوں کو "شعر بازی" کی ضرورت نہیں، اور نہ ہر شخص شعر کہنے کے قابل ہوتا ہے، لوگ شعر بازی کی طرف اِسی لئے جلد متوجہ ہو جاتے ہیں کہ بغیر کاوش مطالعہ اور محنت کے اُنھیں شہرت حاصل کرنے کی خواہش دامنگیر ہوتی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس وقت بہت کم ایسے شاعر ہیں جن کے کلام میں 'بقا' کا عنصر موجود ہو، آپ نوجوان ہیں آپ کو اس غلط روش پر ہرگز نہ چلنا چاہیئے، ضرورت ہے نثر نگاروں کی

جو محنت اور مطالعہ کے بعد اُردو زبان میں مختلف موضوعوں پر کتابیں، رسالے، تراجم وغیرہ لکھیں اور اپنی قوم کو اور خود اپنے آپ کو بہتر بنائیں، ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا کم و بیش یہی ماحصل تھا، چنانچہ اُن کی تقریر نے اِن نوجوان شعرا کے جوش کو ٹھنڈا کیا، اور وہ یہ لیکچر سُن کر بورڈنگ ہاؤس سدھارے۔

(۱۱) ۱۹۲۵ء میں ایک نامور بزرگ لاہور میں تشریف لائے، اُن کی لیاقت، وسعتِ علم اور بالخصوص فصاحت و بلاغت کے متعلق عوام میں بہت مبالغہ آمیز باتیں مشہور تھیں۔ فنِ تقریر میں بہت کم لوگ اُن کی ہمسری کر سکتے تھے اور انگریزی زبان، محاورہ، تلفظ اور اَدب میں تو انھیں بلا کی دسترس حاصل تھی، میں نے ایک روز ڈاکٹر صاحب سے اُن کی بہت تعریف کی، وہ بزرگ بھی نئے نئے وارد ہوئے تھے!..........

فرمایا کہ انگریزی فنِ تقریر میں اُن کا پایہ مسلم ہے، لیکن یاد رکھو کہ (انبیاء ع اور مصلحین اقوام کو چھوڑ کر) جو لوگ بے ضرورت اُٹھتے بیٹھتے تقریریں کرتے رہتے ہیں، اُن میں روحانیت کا فقدان ہوتا ہے

In People other than Prophets and great national reformers, too much of Public speaking is very afoten a sign of spiritual Poverty.

"باتونی" حضرات کے متعلق تو یہ نظریہ بالکل صحیح ہے لیکن افسوس تو یہ ہے کہ بعض بڑے بڑے مقرروں کے متعلق بھی یہ نظریہ غلط نہیں، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ انگلستان میں طالب علمی کے زمانہ میں، میں بھی تقریروں کے مشغلہ میں کچھ عرصہ کے لئے بہت منہمک رہا، لیکن بعد میں میں نے اسے بالکل ترک کر دیا۔ علامہ نے جو کلیہ اُوپر بیان فرمایا ہے، اس میں "بے ضرورت" Too much یا "ضرورت سے زیادہ"

پر زور ہے، عوام اور سامعین سے خراج تحسین حاصل کرنے میں مقرر صاحب کو وہ لطف حاصل ہوتا ہے کہ وہ مسئلہ زیر بحث پر پورا غور کئے بغیر دھواں دھار تقریر فرما دیتے ہیں، اس لئے ایسے بزرگوں کے اقوال اور تقریروں میں سطحیت کا عنصر زیادہ نمایاں رہتا ہے، بہت کم مقرر ایسے ہوتے ہیں جو کاوش اور مطالعہ سے اپنے آپ کو اس خطرہ سے محفوظ رکھتے ہیں، ان سطحی مقررین کے برعکس جو شخص کچھ لکھ کر دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے، وہ اپنے الفاظ پر غور کرتا ہے، اور جب تک اسے اپنی بات اور اپنے استدلال پر پورا یقین نہیں ہوتا، وہ انھیں عوام کے سامنے پیش کرنے سے گریز کرتا ہے، اس حقیقت کو البتہ فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ عوام کے دلوں کی تسخیر کے لئے جو طاقت اور جذب تقریر میں ہو سکتا ہے وہ تحریر میں ممکن نہیں۔

انبیاء اور مصلحین اقوام ہر وقت فکر و عمل میں مصروف رہتے ہیں، وہ جب تقریر کرتے ہیں تو ان کے الفاظ ان کے فکر و عمل اور ان کی روحانیت و الہام کو دنیا کے سامنے پیش کرتے ہیں، وہ شوق تقریر سے مجبور ہو کر نہیں بولتے بلکہ صرف اس لئے بولتے ہیں کہ بغیر تقریر کے چارہ نہیں، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان کی تقریر سراسر روحانیت ہوتی ہے، کیونکہ خود خدا ان کا سکھانے والا ہوتا ہے، علّمہ البیان

(۱۲) ۱۹۲۶ء کے شروع میں ایک شام کو میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں بحیثیت مدیر کریسنٹ Crescent (رسالہ اسلامیہ کالج لاہور) حاضر ہوا اور ملتجی ہوا کہ نئے سال کا پہلا نمبر نکلنا ہے، براہ کرم کوئی پیغام یا ارشاد طلبہ کے لئے دیجئے، تاکہ پہلے ورق پر اسے چھاپا جائے، فرمانے لگے، مضمون لکھنے کا تو وقت نہیں البتہ یہ شعر چھاپ دو:

پشیماں شو اگر لعلے ز میراث پدر خواہی
کجا عیش بردن آوردن لعلے کہ در سنگ است

میں نے اسے چھاپ دیا، اس سے بہتر پیغام مسلمان طلبہ کے لئے تو شاید ناممکن تھا۔

(۱۳) ۱۹۲۷ئہ یا ۱۹۲۸ئہ میں جب سٹر منوہر لال وزیر تعلیم پنجاب تھے، تو مسلمانوں میں اپنی حق تلفی کا بہت چرچا تھا، ڈائرکٹر صاحب محکمۂ تعلیمات پنجاب اِن دنوں سر جارج انڈرسن تھے، مسلمان ممبرانِ کونسل کا ایک مختصر سا وفد اِس معاملہ پر بحث کرنے کے لئے ڈائرکٹر صاحب کے پاس گیا، ڈاکٹر صاحب چونکہ ان دنوں کونسل کے ممبر تھے، اور تعلیمی حالات سے واقف، وہ بھی وفد میں شامل تھے، رسمی باتیں جو ایسے موقعوں پر ہوتی ہیں ہوئیں، ڈائرکٹر صاحب بہادر نے وعدہ فرمایا کہ میں ضرور اس معاملہ پر غور کروں گا، اور جہاں جہاں حق تلفی یا بے قاعدگی ہوئی ہے، اس کی تلافی کی پوری کوشش کرونگا: ڈاکٹر صاحب نے فوراً ظرافت سقراط سے کام لیا، اور سر جارج سے فرمانے لگے، اجی صاحب آپ اتنی کاوش مت کیجئے گا، ہم لوگ تو مسلمان ہیں، آپ کے اِس وعدہ ہی سے خوش ہو گئے ہیں، اب کچھ کرنے کرانے کی ضرورت نہیں۔

(۱۴) ۱۹۲۲ئہ میں جب ڈاکٹر صاحب کو نائٹ ہڈ Knight hood. کا خطاب ملا، تو اسلامیہ کالج کے کریسنٹ ہوسٹل کے طلبہ نے آپ کو چائے پر مدعو کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے کمال مہربانی سے (جو اُن کا عمر بھر شیوہ رہی) یہ دعوت قبول فرمائی چنانچہ وقتِ مقررہ پر آپ تشریف لائے، آپ کے دوست نواب سر ذوالفقار علی خاں صاحب بھی ساتھ تھے، چائے کے بعد طلبہ نے درخواست کی، کہ ان کی ہدایت کے لئے چند کلمات فرمائے جائیں، ڈاکٹر صاحب نے ایک مختصر سی تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ قوموں کے اخلاق کو خراب کرنے والی چیزوں میں سے ایک نہایت خطرناک بلکہ مہلک چیز وہ نظریہ ہے، جسے "فن برائے فن" art for art's sake.

کہتے ہیں، اِس نظریہ سے مراد یہ ہے کہ جمالیات کا ہر شعبہ یا فن صرف اپنے اُصولوں کو ہی اپنا معیارِ صحت اور نصب العین مقرر کرے، اپنے ان اصولوں سے باہر کوئی اُصول (مثلاً اخلاقیات یا روحانیت کا کوئی اُصول) اس فن کی راہبری کا حقدار نہ ہو، وہ فن خود اپنا راہبر ہو، اس کی ترویج یا ترتیب یا اس کا اِرتقا کسی فوق الفن اصول کے ماتحت نہ ہو، وغیرہ۔ مختصر یہ کہ حُسن خود اپنا معیار ہے، اور اپنے سے بالاتر کسی معیار یا مدعا یا نصب العین کو ماننے کے تیار نہیں، یہ نظریہ آج کل مغربی دُنیا میں بہت مقبول ہے، اور اس کی مقبولیت کی رفتار اگر اسی طرح تیز رہی تو مجھے یقین ہے کہ وہ ان اقوام کو گرا کر رہیگا، میں نے اپنے کلام میں اس مہلک نظریہ کے خلاف جہاد کیا ہے، اور میں تم نوجوانوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ اس خطرناک غلطی میں نہ پڑنا، "فن" جب اخلاقیات اور روحانیات سے علیحدہ ہوتا ہے، تو وہ بہت جلد مخرب اخلاق بن جاتا ہے۔ اعلیٰ مقاصد کی تکمیل یا پیروی کے لئے جمالیات کے کسی فن کو لوگے تو وہ اپنے بہترین مدارج طے کریگا، اور قوم و مِلت میں ایک نئی روح پھونک دیگا، لیکن وہی فن جب اِن مقاصد سے بچھڑ جائے گا، تو قوم و مِلت کے حق میں زہر قاتل بنے گا۔"

میں نے اوپر ڈاکٹر صاحب کی مختصر تقریر کا ماحصل (جو شاید دس بارہ منٹ سے زیادہ نہ تھی) اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے، بالخصوص اس نظریہ "فن برائے فن" کی تعریف کو واضح کر کے بیان کرنا میں نے مناسب سمجھا ہے، یہ تقریر سنے مجھے کئی سال گزر چکے ہیں، لیکن بعد کے واقعات نے اِن خیالات کو میرے ذہن سے محو ہونے نہیں دیا، ہر طرف "فن برائے فن" کی تباہ کاریاں ایک وبا کی صورت اِختیار کر رہی ہیں، جرمنی اور اِٹلی میں تو ہٹلر اور مسولینی کی کوششوں نے اس نظریہ کی اچھی خاصی بیخ کنی کی ہے، لیکن دوسرے مشہور مغربی ممالک میں اس کے خلاف کوئی منظم جہاد نہیں کیا گیا، ہندوستان میں کچھ عرصہ سے

یہ نظریہ نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ میں رائج ہو رہا ہے، آزاد خیال، فینین artists.
اس کے مبلغ ہیں اور عریانیت اُن کے فن کے اسرار کی کلید، ڈاکٹر صاحب نے
اس نظریہ کے مہلک نتائج کو جگہ جگہ اپنی تصانیف میں مثلاً محکوم اور زوال پذیر اقوام
کے جمالیات کے تذکرہ میں بیان کیا ہے، اِس نظریہ کے برعکس اُنھوں نے اپنی
تعلیم اِس شعر میں نہایت بلیغ طریقہ سے بیان کی ہے؛

دلبری بے قاہری جادو گری است
دلبری با قاہری پیغمبری است

(۱۵) ۱۹۲۶ء میں مَیں نے اِسلامیہ کالج کو چھوڑا، ممبران اِسٹاف نے کمال
مہربانی سے چائے کی ضیافت دی، ڈاکٹر صاحب سے چونکہ مجھے عقیدت تھی اِسلئے
اُنھیں بھی مدعو کیا گیا (یعنی اساتذہ کے علاوہ صرف وہی مہمان تھے) وہ از راہ
ذرّہ نوازی شامل ہوئے، باتیں ہوتی رہیں دوران گفتگو میں منتظم صاحب نے
ڈاکٹر صاحب کی شرکت کا شکریہ ادا کیا فرمانے لگے پروفیسر میرا دوست ہے، اس کے
ملازمتی جنازہ کے لئے مجھے ضرور وقت نکالنا تھا۔

The Professor is my friend, I had to find time for his official funeral اِس پر قہقہہ پڑا، فرمانے
لگے، کہ میں نے اِن الوداعی پارٹیوں کے لئے "ملازمتی جنازے" کی اِصطلاح
وضع کی ہے؛

اس پارٹی میں ڈاکٹر صاحب، مسٹر یوسف علی (جو پرنسپل تھے) کے ساتھ بیٹھکر
چائے پی رہے تھے، باتوں باتوں میں پردہ کا معاملہ زیر بحث آیا، یوسف علی صاحب
نے ڈاکٹر صاحب سے پُوچھا، کیوں صاحب آپ کو تو پردہ کی مخالفت ضرور کرنی چاہیئے؟
اُنھوں نے جواب دیا کہ میں تو پردہ کا بہت حامی ہوں، یوسف علی صاحب نے وجہ

دریافت کی تو فرمایا کہ پردہ سے، جنسیت کی خواہش تیز تر ہوتی ہے، بے پردگی اور عریانی سے وہ راز کھل جاتا ہے، جو جنسیت کی جان ہے، اس مختصر سے جواب میں انھوں نے انسانی نفسیات کے ایک اہم اصول کو لطیف پیرایہ میں بیان کر دیا۔

(۱۶) ڈاکٹر صاحب کو پورا یقین تھا کہ ان کا کلام اور ان کا کام باقی رہے گا، عرصہ ہوا میں نے ایک روز عرض کی کہ یورپی زبانوں میں آپ کا کلام اگر ترجمہ کی صورت میں شائع ہو جائے تو نہ صرف خود یورپ کے حق میں مفید ہوگا، بلکہ صحیح اسلامی نقطۂ نگاہ اور تعلیم کے متعلق بھی اہل یورپ میں جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں، وہ بہت حد تک دور ہو جائیں گی، آپ ترجمہ کی اجازت ضرور دیں، فرمانے لگے، کہ میرا کلام باقی رہے گا؛ (my work shall live.) تراجم آہستہ آہستہ ہو ہی جائیں گے۔

(۱۷) گول میز کانفرنس کے سلسلہ میں انگلستان میں ڈاکٹر صاحب کو اکابر اور فضلاء سے تبادلۂ خیالات کا موقع ملا، ایک بزرگ نے عیسائی پادریوں کا مشہور اور جھوٹا اعتراض اسلام کے خلاف دہرایا اور پوچھا کہ "سر محمد کیا یہ سچ ہے، کہ اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ عورت کے روح نہیں ہوتی"؟

ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کیا روح سے آپ کی مراد وہی شئے ہے، جو آپ لوگوں کے خیال میں جسم سے بالکل علیحدہ اور مختلف ہوتی ہے" معترض صاحب نے کہا جی ہاں، انھوں نے جواب دیا، "تو پھر صاحب اسلام کے مطابق عورت کیا مرد میں بھی روح نہیں ہے"۔ اس دقیق اور لطیف جواب کو سمجھنے کے لئے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے فلسفیانہ مضامین میں اس نظریہ پہ بہت زور دیا ہے، کہ روح اور جسم کی تقسیم قرآنی تعلیم کے بالکل خلاف ہے

اور یہ پرانے مذاہب اور فلاسفہ کی غلط تعلیم کا نتیجہ ہے، قرآن کے مطابق انسان ایک فرد ہے، جس میں روحانی اور جسمانی خاصیتیں موجود ہیں، لیکن روح اور جسم دو الگ الگ چیزیں موجود نہیں، جس سے وہ بنا ہو، روح اور جسم کی یہی غلط تقسیم ہے، جس کی وجہ سے بیسیوں ناقابل حل مسئلے فلسفہ، مذہب میں پیدا ہو چکے ہیں اِسلام انسان کو ایک زندہ شخصیت Spiritual andorganic being تصور کرتا ہے اور یہ تصور قرآن میں نہ صرف اسی ارضی زندگی کے لئے اِستعمال ہوتا ہے، بلکہ حشر اور حیات بعد الموت کے لئے بھی قائم رہتا ہے، چنانچہ حیات بعد الموت میں اِنسان کے لئے جو جزاء اور سزا مقرر ہے، جس کا ذکر قرآن میں بار بار آتا ہے، وہ روحانی بھی ہے اور جسمانی بھی، ڈاکٹر صاحب نے مندرجہ بالا جواب میں اِس مسئلہ کو واضح کیا ہے، کہ اسلام کے مطابق روح جسم سے علیحدہ کوئی شے نہیں، اس لئے نہ وہ عورت میں پائی جاتی ہے اور نہ مرد میں، کس بلاغت اور ظرافت سے ایک ہی بات میں نہ صرف ایک جھوٹے الزام کی تردید کی گئی ہے، بلکہ ایک اہم اُصول کو بھی واضح کر دیا گیا ہے، ڈاکٹر صاحب کی روز مرہ کی گفتگو میں یہی خاصیت بار بار نمایاں ہوتی تھی۔

(۱۸) دوسری گول میز کانفرنس کے زمانہ میں اِنگلستان کی مشہور سیاح خاتون مس روزیتا فوربس (" Miss Rosita Forbes.) نے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا شوق ظاہر کیا، چنانچہ مس صاحبہ نے اُنھیں اپنے ہاں مدعو کیا، یہ خاتون شمالی افریقہ اور اسلامی ممالک میں بہت پھری ہیں، اور اُن پر اِس سیاحت کا بہت اچھا اثر پڑا ہے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے، کہ ان کا محل جو لندن میں ہے وہ ایشیائی بلکہ اسلامی طرز آرائش کا نہایت لطیف اور شستہ نمونہ ہے، سامان آرائش، غالیچے، زیب و زینت

کے انداز ہر لحاظ سے معلوم ہوتا ہے، کہ ہارون الرشید کے بغداد کے کسی محل کا خاکہ ہے، اسی محل میں ڈاکٹر صاحب کی ضیافت ہوئی، اور پُر لطف مجلس رہی لیکن انھیں خاتون کے محل کی تعریف کا موقع نہ ملا، روانگی کے وقت مس صاحبہ سے نہ رہا گیا، پوچھنے لگیں، "سر محمد میرے اس مکان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ "آپ نے اپنی بہشت دنیا میں پائی، میں اپنی بہشت کا منتظر ہوں"

(۱۹) دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب کی ملاقات روما میں مسولینی سے ہوئی، اس ملاقات میں مسولینی نے ان کی تعلیم سے دلچسپی کا اظہار کیا اور اس کی تعریف کی گفتگو آدھ گھنٹہ سے زیادہ رہی دوران گفتگو میں قوم اور مذہب کا بھی ذکر ہوا، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اطالیہ کی موجودہ حالت (اور اس کی حل طلب مشکل) بہت حد تک ایسی ہے جیسے کہ قبل از اسلام ایران کی تھی، ایران کی تہذیب فرسودہ تھی، اور قوم کے قویٰ شل ہو چکے تھے، ان کو تازہ خون کی ضرورت تھی، ایران کی خوش قسمتی سے اس کے جوار میں عرب کی جری اور بادیہ پیما قوم تھی جس نے ایران کو اپنا تازہ اور خالص خون دیا، نتیجہ یہ ہوا، کہ ایران میں حیات کی ایک نئی لہر دوڑ گئی اور یہ قوم ایک پُر شکوہ تہذیب کی حامل اور علم بردار ہوئی، عربی خون کی بدولت ان میں بہترین اہل فن، اہل سیاست، اور اہل سیف پیدا ہوئے اسی طرح روما کے زوال کے بعد گاتھ اور جرمن قوموں نے اطالیہ کو اپنا خون دیا، اور اسے قرونِ وسطیٰ میں نشاۃ ثانیہ نصیب ہوئی، اب پھر ایران اور اطالیہ دونوں کو تازہ خون کی ضرورت ہے، ایران اب بھی اس لحاظ سے خوش قسمت ہے، کہ اس کے شمال میں جری اور نیم مہذب ترکمان موجود ہیں، اور مغرب میں اندرون عرب کے جری قبائل، یہ قومیں اپنا خون دیکر ایران کو پھر زندہ اور قوی کردیں گی، لیکن موجودہ اطالیہ کے گرد اسی کی جیسی مہذب قومیں آباد ہیں جن میں صحرائی وحشت اور تازگی نام کو

موجود نہیں، اطالیہ تازہ خون کہاں سے لیگی؟"
ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے، کہ مسولینی اس اچھوتے خیال سے بہت متاثر ہوا!
(۲۰) ڈاکٹر صاحب پر حسن کا اثر بہت گہرا اور فوری ہوتا تھا، روما کے اسی قیام کے زمانہ میں (جو صرف چند روزہ تھا) ان کی ایک دوست خاتون نے (غالباً اسی خاتون نے مسولینی کی ملاقات کے لئے وقت مقرر کرایا تھا) جو اطالیہ کے طبقہ امراء سے تھی ان سے دریافت کیا، اگر آپ کو یہاں کوئی خاص چیز دیکھنی ہے، تو فرمائیے؟ تاکہ اس کا انتظام کیا جائے، فرمایا کہ اطالیہ کا حسن مشہور ہے، میں اس شہر روما کی حسین ترین خواتین دیکھنا چاہتا ہوں، چنانچہ موصوفہ نے ایک ٹی پارٹی میں اعلیٰ سوسائٹی کی چند حسین خواتین مدعو کیں، جن سے ڈاکٹر صاحب نے ملاقات کی، فرماتے تھے، کہ اطالیہ کا حسن یورپ میں بہترین ہے، اور اس ضیافت میں روما کے حسن کے بعض نہایت لطیف نمونے تھے؛
(۲۱) گول میز کانفرنس سے واپسی پر ڈاکٹر صاحب کی ملاقات پیرس میں پروفیسر برگساں سے ہوئی، برگساں کی تصانیف کا اثر ان پر بہت تھا، اس کا نظریۂ "واقعیت زمان" (Reality of time.) ڈاکٹر صاحب کے خیال میں اسلامی نقطۂ نگاہ کے بہت قریب تھا، چنانچہ دوران ملاقات میں اس پر بحث ہوئی، ڈاکٹر صاحب نے برگساں کو یہ حدیث سنائی، کہ "زمانہ کو برا مت کہو کہ زمانہ خدا ہے"؛ فرماتے تھے کہ جس وقت برگساں نے یہ حدیث سنی تو وہ کرسی سے اچھل کر آگے بڑھا اور مجھ سے پوچھنے لگا "کیا یہ سچ ہے"؟
(۲۲) گول میز کانفرنس کے اختتام پر ڈاکٹر صاحب نے ہسپانیہ کا سفر کیا، اس سفر کے واقعات انھوں نے کمال مہربانی سے مجھے مفصل سنائے۔ قرطبہ کے جس ہوٹل میں آپ ٹھہرے تھے، اس کے مالک (مینیجر) سے آپ نے سب سے پہلے

یہی پوچھا کہ کیا اِس علاقہ میں قدیم مراکشی نسل کے لوگ آباد ہیں اس نے جواب دیا کہ بڑی تعداد میں، آپ نے خواہش ظاہر کی کہ مجھے ان میں سے کسی ایک سے ضرور ملایا جائے۔ منیجر مسکرا کر بولا، اس کام کے لئے ہوٹل سے باہر جانے کی ضرورت نہیں میں خود مراکشی اصل سے ہوں (جنوبی ہسپانیہ کے اِن باشندوں کو مورسکو (Morisco.) کہا جاتا ہے. حسن اتفاق سے آپ کو پرانی عمارتیں دکھانے کے لئے جو راہبر مقرر کیا گیا تھا، (آپ نے شرط یہ رکھی تھی، کہ راہبر انگریزی جانتا ہو، کیونکہ میں ہسپانوی زبان سے آشنا نہیں) وہ بھی مراکشی اصل سے تھا، ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ اس علاقہ میں عربی مراکشی اثر چہروں کی ساخت میں بہت نمایاں ہے، چنانچہ "مسجد قرطبہ" میں اِسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے:

آج بھی اِس دیس میں عام ہے چشم غزال ۔۔۔ اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دِل نشیں
بوئے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے ۔۔۔ رنگ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے

اسی سفر ہسپانیہ میں آپ کو پروفیسر آسین "Asin." سے بھی ملاقات کا موقع مِلا، یہ وہی پروفیسر ہیں، جنھوں نے قریباً پندرہ سال یا شاید کچھ زیادہ ہوتے ہیں، ایک معرکتہ الارا تصنیف کی تھی، جس میں یہ ثابت کیا تھا کہ اطالوی شاعر دانتے پر عربی بالخصوص اِن حدیثوں اور روایتوں کا اثر جو معراج نبوی صلعم اور عذاب دوزخ سے متعلق ہیں، کسی قدر غالب تھا، دانتے کی شہرۂ آفاق تصنیف ڈیوینا کامیڈیا میں یہ اثر صفحہ صفحہ پر نمایاں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ پروفیسر آسین کی خواہش تھی کہ مسلمان طالب علم، بالخصوص ہندوستان کے طالب علم ہسپانیہ میں آئیں اور ملک کی زبان سیکھ کر ان قیمتی اور بے شمار عربی مخطوطوں کا مطالعہ کریں جو ہسپانیہ کے بعض کتب خانوں مثلاً اسکوریال میں بند پڑے ہیں، (خدا جانے اِس خوفناک جنگ میں اِن نایاب مخطوطوں کو کس قدر

نقصان پہونچا ہو،"

ڈاکٹر صاحب کو سفر ہسپانیہ میں معلوم ہوا کہ اس ملک میں قومیت اور وطنیت کی ایک نئی لہر دوڑ رہی تھی، ملک میں ایسے نوجوان اور فضلاء نکل آئے تھے، جو ہفت صد سالہ اسلامی حکومت ہسپانیہ کے کارناموں کو فخریہ بیان کرتے تھے، اور اس دور کو اُندلس کا بہترین زمانہ کہکر یاد کرتے تھے، اسی تحریک کا نتیجہ تھا کہ مسجد قرطبہ کو کیتھولک چرچ کے مختلف فرقوں سے چھین لیا گیا، حالانکہ کئی سو سال سے اِن فرقوں نے مسجد کے مختلف حصوں میں اپنی عبادتگاہیں بنالی تھیں، وطنیت کی اس تحریک کا چونکہ مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا، اِس لئے مسجد کو محکمۂ آثار قدیمہ کے حوالے کر دیا گیا، اِس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے حکمت الٰہی کی ایک دلپذیر مثال یہ سُنائی کہ مسلمانوں کے اخراج کے بعد جب مسجد قرطبہ (جو تعمیری جمالیات کے لحاظ سے دنیا کی نادر ترین عمارتوں میں سے ہے) عیسائی راہبوں کے قبضہ میں آئی، تو اُنھوں نے آیاتِ قرآنی پر جو سُنہری حروف میں مسجد کی دیواروں اور محرابوں پر لکھی ہوئی تھیں، پلستر کرادیا، آج قریباً پانچ چھ سو سال کے بعد جب وہ پلستر محکمۂ آثار قدیمہ کے حکم سے اکھاڑا جاتا ہے، تو وہی نقوش اپنی پرانی شان میں دُنیا کے سامنے آتے ہیں اگر پلستر نہ ہوتا، تو یہ نقوش غالباً اس وقت تک بالکل محو ہو جاتے، ڈاکٹر صاحب کا یہ فقرہ میرے ذہن میں نقش ہے، کہ مسجد اور اس کے نقوش کو دیکھکر جو لذّت قرآن اور اسلام کے مفہوم کے متعلق میں نے حاصل کی، وہ بیسیوں تفسیروں سے حاصل نہ کر سکا۔"

ایک بات ڈاکٹر صاحب کو اسپین کے سفر میں خاص طور سے نوٹ کرنی پڑی، کہ اس وقت اس ملک میں پرانی مساجد کی تعداد بہت ہی کم ہے، اُن کا خیال تھا کہ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں، یا مسلمانوں کے ہسپانیہ سے اِخراج

کے بعد تعصب کی وجہ سے عیسائیوں نے ان تمام مساجد کو سخت بے دردی سے گرا دیا ہوگا، اور یا خود مراکشی اندلسی مسلمانوں کو بے ضرورت مساجد تعمیر کرنے کا وہ شوق نہ تھا، جو ہندوستانی مسلمانوں کو ہے، پہلا خیال غالباً زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ہسپانیہ کی آب و ہوا کی بیحد تعریف کرتے تھے، فرماتے تھے، کہ اس ملک میں دو تین مقامات ایسے ہیں، اور اُن کی فضا اِس قدر پاک اور شُستہ ہے کہ آج کا پکا ہوا سالن کئی مہینوں تک نہ بگڑے گا!

(۲۳) دو سال کے قریب ہوئے جب اسپین کی موجودہ ملکی جنگ کا آغاز ہوا تو یہ خبریں بھی پہونچنا شروع ہوئیں، کہ جنرل فرانکو کی فوج کا زیادہ حصہ خصوصاً وہ حصہ جو یلغاروں میں اور فیصلہ کن لڑائیوں میں **Storm troops** صف شکنوں کا کام دیتا ہے، تمام تر مراکشی سپاہیوں اور رضاکاروں پر مشتمل ہے، کچھ عرصہ کے بعد ان جفاکش اور جری سپاہیوں کی تصاویر بھی اخباروں میں چھپنا شروع ہوئیں، اِن خبروں سے ہندوستان کے ہر پڑھے لکھے مسلمان پر گہرا اثر ہوا تھا اور ہے، میں نے ایک روز ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اِس خیال کے اثر کا ذکر کیا، کہ سرزمین اندلس قریباً بارہ سو سال کے بعد پھر مسلمان مراکشی بہادروں کے قوی بازوؤں سے سر ہو رہی ہے، ڈاکٹر صاحب فوراً بولے تمھیں میری نظم مسجد قرطبہ کا آخری بند یاد نہیں رہا، اس میں میں نے پیشینگوئی کی تھی۔

آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی | دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب!
عالمِ نَو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں | میری نگاہوں میں ہے، اسکی سحر بے حجاب
پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے | لا نہ سکیگا فرنگ میری نواؤں کی تاب

(۲۴) ڈاکٹر صاحب پر جرمن مفکر نٹشے کا بہت اثر تھا، "خودی کے اسرار ان پر اس وضاحت اور جدّت سے فاش نہ ہوتے، اگر نٹشے کی تصانیف سے وہ

لاعلم رہتے، بال جبریل چھپنے کے کچھ عرصہ بعد ایک دفعہ میں نے اُن سے عرض کیا، کہ پچھلے دنوں میں نے نٹشے کی فلاں فلاں کتابوں کو کئی سالوں کے بعد اور شاید تیسری بار پڑھا ہے، لیکن اس کی فکر میں وہ تازگی، جوش اور گہرائی ہے کہ ہر بار معلوم ہوتا ہے کہ پہلی بار پڑھ رہا ہوں، اس کے بنیادی خیالات اِسلام سے اس قدر قریب ہیں، کہ افسوس ہوتا ہے کہ کسی نے اس کے سامنے اِسلامی نقطۂ نظر پیش نہ کیا، قرآن سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے اسے اپنے فلسفہ میں "اِنکار الٰہیت" Godlesness کی تعلیم دینا پڑی، عیسائیت نے خدا کے بیٹے کو "بکری کا لیلا"، اور اخلاق کو روحانی پست ہمتی کے مترادف بنا کر اسے صحیح مذہب سے متنفر کر دیا، وغیرہ:

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "تمہارا یہ خیال بالکل صحیح ہے"، اسی لئے تو میں نے نٹشے کے متعلق کہا ہے، کہ ع

دِلش مومن، دماغش کافر است

ڈاکٹر صاحب کی تصانیف میں شاہین کا فقر و درویش ہونا نٹشے کے زردشت کے اِس وعظ سے بہت قریب ہے، جس میں وہ اپنے کوہستانی نشیمن کو اس لئے پسند کرتا ہے، کہ وہاں اسے عقاب اور ستاروں کی ہمسائیگی نصیب ہے۔

(۲۵) ڈاکٹر صاحب سے میں نے دو تین موقعوں پر مرزا بیدل کی شاعری کے متعلق پُوچھا، بیدل کے متعلق اُن کی رائے نہایت اچھی تھی، میں نے ایک بار کہا کہ اس کی فارسی میں بے ضرورت مشکل پسندی ہے، فرمانے لگے، کہ تھوڑی کاوش سے یہ مشکل دور ہو سکتی ہے، بیدل نے اپنی خاص اِصطلاحات وضع کر رکھی ہیں، جنھیں وہ اپنے اشعار میں استعمال کرتا ہے، اگر ان اصطلاحات کو پہلے سمجھ لیا جائے تو بیدل میں مشکل باقی نہیں رہتی، بیدل اِس قابل ہے کہ اس کا مطالعہ بغور کیا جائے۔

(۲۶) پچھلے سال اگست یا ستمبر میں ایک روز جب میں شام کے وقت حاضر خدمت ہوا تو آپ حسب معمول جاوید منزل کے صحن میں بستر پر لیٹے تھے، اس سے چند مہینے پہلے ایک دو مرتبہ اُنھوں نے اپنے بچوں کے لئے ایک معلّمہ یا اتالیقہ کی ضرورت کا ذکر کیا تھا، کچھ دیر سیاسی خبروں کے متعلق باتیں ہوتی رہیں، اس دَوران میں ایک یورپین خاتون بچوں کو لے کر گزریں، میرے دریافت کرنے پر ڈاکٹر صاحب نے فرمایا، کہ یہ خاتون بچوں کی اُتالیقہ ہیں، جرمن نسل سے ہیں، اور نہایت شریف الطبع ہیں، انھیں ہر وقت بچوں کی پرورش کا خیال رہتا ہے اور فرصت کا کوئی وقت بھی وہ بے کار نہیں گزارتیں، کچھ کام نہ ہو تو کمرہ ہی جھاڑنا شروع کر دیتی ہیں، چنانچہ بچوں کی طرف سے تو میری طبیعت اَب بالکل مطمئن ہے، البتہ مجھے کچھ عرصہ سے تنہائی بہت محسوس ہو رہی ہے علی بخش میری ضروریات کی نگہداشت کرتا ہے، لیکن میرے لئے اَب زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ صبح سے دوپہر تک کا وقت اچھا گزرتا ہے، لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، شام کا وقت بھی اسی طرح گزرتا ہے، البتہ دوپہر سے چار بجے تک کا وقت سخت تکلیف دہ ہوتا ہے، پڑھنا بند ہو چکا ہے، اور سوئے اِنسان کب تک، میں نے عرض کی کہ موسیقی کا اِنتظام ہو جائے تو طبیعت کو تسکین ہوگی، فرمایا کہ مجھے موسیقی کی بہت خواہش ہے، میری طبیعت بھی اس کی طرف مائل ہے، لیکن افسوس ہے کہ ہندوستانی موسیقی بہت الم انگیز اور پژمردہ ہے، جس موسیقی کی مجھے ضرورت ہے، وہ ابھی شروع نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کا یہ خیال کہ ہندوستانی موسیقی میں المیت کا عنصر بہت غالب ہے اور ذوق حیات اس سے پیدا ہو ہی نہیں سکتا، میں نے کئی بار ان کی زبان سے سنا اس نتیجہ پر وہ برسوں پہلے پہونچ چکے تھے۔

(۳۷) ۱۹۳۶ء میں سید سر راس مسعود مرحوم کی وفات کی خبر اخباروں میں نکلی، اس کے چند روز بعد مجھے ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا، مجھے معلوم تھا کہ مرحوم اُن کو بہت عزیز تھے، چنانچہ جب میں نے اُن کی خدمت میں اظہار افسوس کیا تو اُنھوں نے مرحوم کی بہت تعریف کی، میں نے پوچھا کہ مرحوم میں خاص خوبیاں کیا تھیں، فرمانے لگے کہ، دو باتیں اُن میں نُمایاں تھیں، ایک یہ کہ وہ بیحد فیاض تھے ہر کسی کے دکھ درد میں شریک ہوتے تھے، کسی کی تنگدستی کو برداشت نہ کر سکتے تھے اِسی لیے اُن کی تنخواہ (اگرچہ معقول تھی) اُن کے لیے کافی نہ تھی، کوئی سائل اُن کے گھر سے خالی نہ جاتا تھا، میں تمھیں ایک مثال دیتا ہوں ....

.... ان کی بیماری سے کچھ عرصہ پہلے میں نے انھیں لکھا، کہ میں نے اپنی وصیّت میں چار اشخاص کو اپنے بچوں کا سربراہ مقرر کیا تھا، ان میں سے ایک صاحب فوت ہو گئے ہیں، مجھے بہت خوشی ہوگی، اگر آپ سربراہ بننا منظور فرمائیں، اُنھوں نے جواب میں لکھا کہ میں لاہور سے بہت دور ہوں، اِس لیے بحیثیت سربراہ میں بچوں کو کیا فائدہ پہونچا سکوں گا، البتہ آپ براہ مہربانی اپنی وصیّت میں یہ الفاظ ضرور درج فرمائیں کہ اگر بچوں کو خدانخواستہ کبھی مالی تکلیف ہو تو سب سے پہلے اطلاع کا حقدار مجھے سمجھا جائے، دوسری نمایاں خصوصیّت مرحوم میں یہ تھی، کہ ان کا دسترخوان بہت فراخ تھا، اور ان کا کھانا بہترین، ان کے پاس بہترین باورچی ملازم تھے، اور عمدہ کھانوں اور ضیافتوں پر وہ بے دریغ خرچ کرتے تھے، چنانچہ انھوں نے اسی غرض سے خالص عربی میزبانی کا سامان مکمل جمع کیا تھا، الغرض مرحوم ہندوستان کے خوش وضع اور مخیر اکابر میں سے تھے اب اُن کا جانشین یا ثانی مشکل سے ملیگا۔

(۳۸) ڈاکٹر صاحب سے میری آخری ملاقات اخیر ڈسمبر ۱۹۳۷ء میں ہوئی، اس وقت وہ خوابگاہ میں پلنگ پر بیٹھے تھے، کچھ دیر تک وہیں باتیں ہوتی رہیں، پھر

علی بخش نے آکر اطلاع دی، کہ کھانا تیار ہے، (دوپہر کا وقت تھا) فرمانے لگے، چلو دوسرے کمرہ میں بیٹھیں، ڈاکٹر صاحب سوفا پر بیٹھ گئے، علی بخش نے کرسی سامنے رکھدی، اور کھانا اس پر چن دیا، میں کھانا کھا کر گیا تھا، اِس لئے قریب ہی دوسری کرسی پر بیٹھ گیا، آپ اِشتہا سے کھانا کھاتے رہے، اور باتیں بھی ہوتی رہیں، اتنے میں رحما (دوسرا ملازم) اندر آیا، اور اطلاع دی کہ مسٹر یوسف علی اور چھوٹے میاں (نواب سر ذوالفقار علی خان صاحب مرحوم کے صاحبزادے) آئے ہیں، آپ نے فرمایا ہیں بلاؤ، چنانچہ کرسیاں قریب ہی رکھدی گئیں، اور دونوں صاحب اندر تشریف لائے مسٹر یوسف علی نے سلام علیک کے بعد مزاج پرسی کی، ڈاکٹر صاحب نے حسب عادت فرمایا بہت اچھا ہوں، مسٹر یوسف علی نے فرمایا، میرا بھی یہ خیال ہے، کیونکہ کھانا کھانا خود صحت کی نشانی ہے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، ڈاکٹر صاحب نے پوچھا، بتائیے انگلستان سے کیسے آمد ہوئی، یوسف علی صاحب نے جواب دیا کہ قرآن کریم کے آخری تین پاروں کا ترجمہ زیر طبع ہے، یہ کام اپنی نگرانی میں کروانے کے لئے آیا ہوں، کسی بات پر آپ نے مسٹر یوسف علی کو ایک لطیفہ سنایا، (جو میں بھول گیا، اس میں دہا بیوں کی "بوست" کا ذکر تھا) میں مسٹر یوسف علی کے سامنے بیٹھا تھا، لیکن غالباً وہ مجھے پوری طرح سے پہچان نہ سکے، ڈاکٹر صاحب نے ان سے کہا آپ پروفیسر حمید کو پہچانتے ہیں؟ اِسلامیہ کالج میں دو سال آپ کے ماتحت کام کر چکے ہیں، مسٹر یوسف علی بولے ہاں، ہاں، بعد میں تمھیں گجرات میں بھی تو دیکھا تھا۔ لیکن بھئی تم نے اپنے بال کیوں اِس قدر سفید کر رکھے ہیں؟ میں نے عرض کی کہ خاندانی رجحان سفید بالوں کی طرف زیادہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے مسٹر یوسف علی کی طرف مڑ کر کہا، آپ کی صحت پہلے سے بہت اچھی ہے، وہ بولے پہلے (اِسلامیہ کالج میں) میں غلام تھا، آج کل آزاد ہوں۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "نہیں، بلکہ بات یہ ہے کہ اُن کے لئے (میری طرف اِشارہ کر کے) زمان (Time) کی رو آگے کی طرف بہ رہی ہے، اور آپ کے لئے پیچھے کی طرف
Time is moving forwards for the professer and backwards for you)

اس کے بعد حسب ذیل باتیں ہوئیں۔

یوسف علی صاحب۔ فرمائیے آجکل کچھ زیر تصنیف ہے؟

ڈاکٹر صاحب۔ اُردو اور فارسی دونوں میں کچھ کلام جمع ہو رہا ہے۔

یوسف علی صاحب:۔ آپ کو میرے ساتھ وہ وعدہ یاد ہے، کہ آئندہ فارسی چھوڑ کر اُردو کی طرف دوبارہ متوجہ ہوں گا۔

میں:۔ بانگ درا کے بعد ڈاکٹر صاحب کی دو اور کتابیں اُردو میں شائع ہو چکی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب۔ جی ہاں۔ میں اُردو میں چند سالوں سے لکھ رہا ہوں۔

یوسف علی صاحب:۔ موجودہ تصنیف کب مکمل ہوگی؟

ڈاکٹر صاحب:۔ اگلے سال اِنشاء اللہ مدینہ منورہ میں پہنچ کر۔

یوسف صاحب:۔ آئندہ سال حج کو ضرور تشریف لے جائیگا؟

ڈاکٹر صاحب:۔ جی ہاں اِرادہ تو یہی ہے، اطالوی کونسل جنرل نے مجھے دعوت دی ہے، کہ اطالوی کمپنی لائڈ ٹریسٹینو کے کسی جہاز میں سفر کیجئے گا، یہ جہاز جدّہ میں تو نہیں ٹھہرتے، لیکن جدّہ کے سامنے اطالوی شمالی بندرگاہ پر ٹھہرتے ہیں، وہاں سے وہ میرے لئے ایک خاص اگن بوٹ کا انتظام کرنے کا وعدہ کرتے ہیں، جو مجھے جدّہ پہنچا دے گی، اِس طرح سفر میں مجھے تکلیف نہ ہوگی، اِس کے متعلق خط و کتابت جاری ہے۔

یوسف علی صاحب:۔ بیشک، اطالوی حکومت کو اسلامی دنیا میں آپ کی اہمیت کا پورا علم ہوگا، اور وہ ہر طرح سے آپ کو سہولت پہنچانے کی کوشش کریگی۔

ڈاکٹر صاحب:۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ سفر کی کوفت سے بچوں، صحت کی موجودہ حالت میں اس کوفت کو برداشت نہ کرسکوں گا۔

چند منٹ اور گفتگو ہوئی، اس کے بعد دونوں صاحب تشریف لے گئے، اس ملاقات سے پہلے بھی ایک دو بار مجھ سے ڈاکٹر صاحب نے سفر حجاز کے متعلق اس تجویز کا ذکر کیا تھا، انھیں حج کی اس قدر رو لگی تھی، کہ غالباً انتقال کے وقت انھیں اسی ایک آرزو کے پورا نہ ہونے کا رنج رہا ہوگا۔

دس پندرہ منٹ کے بعد میں بھی اجازت لے کر رخصت ہوا اس وقت میرے دل میں یہ خیال ہرگز نہ آسکتا تھا، کہ چار مہینہ کے قلیل عرصہ میں ڈاکٹر صاحب اپنے عقیدت مندوں کو داغِ مفارقت دے جائیں گے اس وقت ان کے چہرہ سے صحت ٹپک رہی تھی، خط تھوڑی دیر پہلے بنوا کر بیٹھے تھے، مونچھوں کو قدرے تاؤ بھی دے رکھا تھا، چہرہ کی شان جرمن جرنیلوں کی سی تھی، طبیعت بہت بشاش تھی، صرف دو تکالیف تھیں، ایک آواز جو کسی طرح کھلتی نہ تھی، اور دوسرے موتیا بند جو کچھ عرصہ سے اُتر آیا تھا، آواز کے نہ کھلنے کا اُنھوں نے کبھی گلہ نہ کیا تھا، اور موتیا بند کا وہ مارچ ۳۸ء میں آپریشن کرانا چاہتے تھے، ان کی شکل وہیئت سے کوئی ایسے آثار ظاہر نہ تھے، جن سے میرے یا اور کسی شخص کے دل میں یہ وہم پیدا ہوتا، کہ خودی کا یہ دانائے راز سفر آخرت کے لئے تیار بیٹھا ہے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون

اسلم جیراج پوری

یومِ اقبال

گزشتہ زمانوں میں بالعموم اہلِ کمال کو اُن کے کمال کی داد اُن کی زندگیوں میں نہیں ملتی تھی۔ بلکہ مرنے کے بعد جبکہ وہ اِس دنیا کو چھوڑ کر چلے جاتے اُن کا نام روشن ہوتا تھا۔ عرفی نے اسی کا ماتم کرتے ہوئے کہا ہے۔

چہ دل کشاید ازینم کہ بعد ازین گویند — کہ بودہ است فلاں دام اسمہ استاد
ازینکہ بعد بریدن تمام شانہ شود — گرہ کشادہ نگردد ز طرۂ شمشاد

لیکن آج ذرائعِ الحاق و اتصال اِس قدر بڑھ گئے ہیں کہ ساری دنیا بمنزلہ ایک گھر کے ہو گئی ہے اور جو کمال کسی میں ہوتا ہے فوراً ہی لوگ اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سر اقبال کے اشعار کی محبوبیت اور مقبولیت نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر اسلامی ممالک تک بھی پہنچ چکی ہے۔ اور ہر پڑھے لکھے مسلمان کے دل میں اُن کی عزت اور عظمت جاگزیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "دی انٹر کالجیٹ مسلم برادرہوڈ" نے اس سال کے آغاز میں ۹ جنوری کو "اقبال ڈے" منانے کا فیصلہ کیا۔ تاکہ دُنیائے اِسلام کے اِس عظیم الشان شاعر کے حضور میں وہ اپنی طرف سے

عقیدت کا نذرانہ اور تحسین کا خراج پیش کرے۔ اِن طلبار نے مجھے بھی اِس جلسہ میں مدعو کیا اور نہایت اصرار کے ساتھ۔ اس لئے میں ۹ جنوری کو دہلی سے لاہور پہنچا۔ دن صرف ایک تھا اور پڑھنے والے۔ بولنے والے۔ نظمیں اور مضامین سُنانے والے بہت۔ یعنی تقریباً تین سو کی تعداد میں۔ اس وجہ سے پروگرام بہت طویل ہو گیا تھا۔ اور تین تین گھنٹے کی تین نشستیں صبح ۹ ½ بجے سے رات کے ۹ ½ بجے تک رکھی گئی تھیں پہلی نشست میں مسٹر گوکل چند نارنگ صدر جلسہ تھے۔ ہمارا دہلوی قافلہ ذرا دیر سے پہنچا تھا اِس لئے ہم اس نشست کے آخر میں شریک ہو سکے۔ اور بعض مقالات اور نظمیں سُننے سے محروم رہے دوسری نشست ڈیڑھ بجے زیر صدارت شیخ سر عبدالقادر صاحب ممبر انڈیا کونسل منعقد ہوئی اس میں متعدد مقالے نہایت عمدہ تھے۔ خاص کر خواجہ غلام السیدین صاحب ایم۔ اے۔ ڈی پرنسپل ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کا انگریزی مقالہ بہت گراں قدر تھا۔ مولانا عابد علی صاحب عابد ایم۔ اے کی تحریر بھی نہایت دلچسپ تھی۔ اور حفیظ جالندھری کی شاعری اور موسیقی دونوں داد کے قابل تھیں نیز صوفی غلام مصطفےٰ صاحب تبسم ایم۔ اے نے اقبال کی شاعرانہ حیثیت کو کامیابی کے ساتھ نمایاں کیا تھا۔

تیسری نشست جو ساڑھے چھ بجے شام کو شروع ہوئی اس میں علامہ عبداللہ یوسف علی صدر تھے۔ اسی نشست میں بیگم شاہنواز نے ایک مختصر تقریر فرمائی اور اعلان کیا کہ اُن کے شوہر نے دس مربعے زمین ڈاکٹر اقبال کے چھوٹے بیٹے جاوید کے نام اسی اقبال ڈے کے سلسلہ میں منتقل کر دی ہے۔ اِس اعلان نے اِس یادگار کو ایک مادی قوت بخشی اور حاضرین نے اس پر نہایت خوشی اور شکریہ کا اظہار کیا۔ اس کے بعد علامہ عبداللہ یوسف علی نے اپنی جگہ پر مجھ کو

بٹھا دیا اور خود چلے گئے۔ پروفیسر محمد عمر فاروق ایم۔ اے اور پروفیسر منیر الدین صاحب ایم۔ ایس سی نے انگریزی زبان میں پر مغز مقالے پڑھے کئی نظمیں بھی پڑھی گئیں جن میں سے مولانا اسد ملتانی کی نظم خصوصیت کے ساتھ دلچسپی سے سنی گئی۔ آخر میں چودھری غلام احمد صاحب پرویز نے اپنی تقریر "اقبال اور قرآن" پر شروع کی۔ جو اس قدر پسند کی گئی کہ خاتمہ کے وقت بار بار لوگ درخواست کرتے تھے کہ کچھ اور اضافہ کیجئے۔ مگر چونکہ وقت زیادہ گزر چکا تھا اس لئے میں نے جلسہ کو ختم کر دیا اور حسب ذیل تقریر کی۔

" ڈاکٹر اقبال کے کلام کا میں اس وقت سے سلسلہ وار مطالعہ کر رہا ہوں جبکہ آج سے ایک تہائی صدی پیشتر شیخ عبدالقادر کا رسالہ "مخزن" لاہور سے نکلتا تھا۔ جس میں اُن کی نظمیں چھپا کرتی تھیں۔ زمانہ مابعد میں ڈاکٹر صاحب کی مثنویوں اسرار خودی و رموز بیخودی اور پیام مشرق نیز جاوید نامہ وغیرہ پر میں نے تبصرے بھی لکھے جو ملک کے ممتاز رسالوں میں شائع ہوئے۔

ڈاکٹر صاحب کے کلام کے ساتھ میری دلچسپی اور گرویدگی کی خاص وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری سے شعر اور ادب کی جس قدر خدمت کی ہے۔ اُس سے کہیں زیادہ اسلام اور قرآن کی خدمت کی ہے۔

ادھر صدیوں سے مسلمانانِ ہند کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ قرآن سے اُن کو لگاؤ نہیں رہا ہے اور اُن کا دینی رشتہ اس کی تعلیمات سے ٹوٹا ہوا ہے۔ وہ صرف اُن خیالات کے پیرو ہیں جو سر تا سر انسانی ہیں جن کو ملاؤں نے فرقہ بندی

اور باہمی افتراق کا ذریعہ بنا کر ملت کے اجتماعی شیرازہ کو ایسا درہم برہم کر رکھا ہے کہ جدید تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کے دلوں میں اُن کی حالت دیکھ کر خود اسلام اور قرآن کی طرف سے بے اعتنائی بلکہ بدگمانی پیدا ہو گئی جو اس صورت میں ہر عقلمند اور صاحب فہم کے دل میں پیدا ہی ہونی چاہیئے تھی۔ ایسی حالت میں ڈاکٹر اقبال نے جو خود تعلیم جدید کے ایک درخشندہ آفتاب ہیں اپنی خداداد قابلیت اور اندرونی روشنی سے شاعری کے ساز پردہ دیپک کا راگ چھیڑا۔ جس سے مسلم نوجوانوں کے افسردہ دلوں میں قرآن کی محبت کی آگ بھڑک اُٹھی اور انہوں نے اس کی عظمت اور اسلام کی حقیقت کو پہچانا۔

بھولے ہوئے راستہ کی طرف قوموں کو مائل کرنا اور اُن کے دلوں کو ہدایت کی جانب موڑنا وہ کام ہے جس کے لئے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل گزشتہ زمانوں میں انبیاء کرامؑ آیا کرتے تھے۔ وہی کام قدرت نے ڈاکٹر صاحب سے اور ڈاکٹر صاحب نے اپنی شاعری سے لیا۔ مولانا گرامی مرحوم کا یہ قول کس قدر صحیح ہے۔

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال ۔۔۔ پیغمبرے کرد و پیمبر نتوان گفت

دوسری طرف ہماری شاعری بجائے خود اس قدر مہمل ہو گئی ہے کہ اس کے تمام رشتے حیات اور عمل سے مدت ہائے دراز سے ٹوٹے ہوئے ہیں۔ شعراء خود نہیں سمجھتے کہ وہ کس ہذیان میں مبتلا ہیں اور کس لئے مبتلا ہیں۔ بس ایک پرانی لکیر ہے جس کو پیٹتے

چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ اِس صدی کے نامور شاعر اور قومیت کے مُبصر مولانا حالی مرحوم نے کہا ؎

وہ شعر و قصائد کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بدتر
ملک جس سے شرماتے ہیں آسماں پر زمیں جس سے ہے زلزلہ میں برابر

وہ علموں میں علمِ اَدب ہے ہمارا
ہوا علم دیں جس سے تاراج سارا

ڈاکٹر اقبال نے اسی عام بد ذوقی کی دنیا میں اپنی شاعری کا رشتۂ زندگی اور بالخصوص اسلامی اور قرآنی زندگی کے ساتھ قائم کیا۔ یہ وہ چیز ہے جس کے لیے توفیقِ الٰہی اپنے کسی خاص ہی بندے کو چنتی ہے۔ چنانچہ آج بھی جبکہ اُن کے کلام کا اتنا نمونہ ہمارے شعرا کے سامنے موجود ہے کوئی ان کی نکالی ہوئی شاہراہ پر چلنے کے قابل نہ ہو سکا۔ بعضوں نے صرف لفظی نقالی کی کوشش کی مگر زندگی کی اِن برقی لہروں کو نہیں دیکھ سکے جو ڈاکٹر صاحب کے شعروں کی رگ رگ میں دوڑ رہی ہیں۔

اسلامی زبانوں میں سے کم سے کم تین زبانوں عربی۔ فارسی اور اُردو کے اکثر بڑے بڑے شعراء کے کلام کا میں نے غور اور دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال کے اشعار ایسے دلکش، اُمیدوں سے ایسے بھرے ہوئے اور اسلامی حقائق سے اِتنے لبریز ہیں کہ میں اُن کو اسلام کا سب سے بڑا شاعر ماننے پر مجبور ہوں۔ اِس اِنتہائی زوال اور ذہنی پستی کے زمانہ میں مسلمانانِ ہند کے لئے اُن کا کلام قدرت کی طرف سے ایک

موہبت کبریٰ ہے۔ جس نے نوجوانوں کی جدید دماغی تعمیر میں بہت بڑا حصہ لیا ہے۔ اور آئندہ کے لئے وہ ہمارا نہ صرف ادبی بلکہ ملی سرمایہ ہے۔"

ہر چند کہ یہ پہلا اقبال ڈے تھا اور طلبا ء کی طرف سے تھا جن کے ابتدائی کاموں میں لازمی طور پر خامیاں ہوتی ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی نہایت کامیاب رہا۔ مولانا عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو۔ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر جامعہ ملیہ اور ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب پی۔ ایچ۔ ڈی پروفیسر جامعہ عثمانیہ کے آنے کی بھی خبریں تھیں اور ان میں سے سوائے مولانا عبدالحق صاحب کے سب کے نام بھی پروگرام میں درج تھے۔ لیکن یہ حضرات اپنی مجبوریوں کی وجہ سے نہ آسکے ورنہ اقبال ڈے اور بھی زیادہ کامیاب رہتا۔

دوسرے دن ہم ڈاکٹر اقبال سے ملے جو ہمارے منتظر تھے۔ ۹ بجے سے سلسلۂ گفتگو ساڑھے بارہ بجے تک رہا۔ امسال حج کی شرکت کا ارادہ رکھتے تھے مگر بیماری اور کمزوری کی حالت یہ ہے کہ کوٹھی سے باہر نکلنا مشکل ہے۔ کہتے تھے کہ میں تو دو سال سے ارادتاً سفر حج میں ہوں۔ عملاً جب موقع اللہ دے بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لئے ہیں جو اس سفر سے متعلق ہیں۔ ان میں سے کہیں کہیں سے کچھ سنایا بھی مکہ سے مدینہ کی روانگی کے وقت ایک غزل لکھی ہے جس میں اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

تو باش اینجا و با خاصان بیامیز　　　که من دارم ہوائے منزل دوست

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلو گیر ہوا کہ آواز بند ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ مجھے یہ دیکھ کر مجبوراً موضوع سخن بدلنا پڑا۔

پروفیسر محمد مجیب
بی۔اے۔آکسن

ڈاکٹر اقبال

ڈاکٹر اقبال مرحوم سے ملاقات کا شرف مجھے مارچ ۲۳ء میں حاصل ہوا. اس زمانہ میں میں پریس کا کاروبار کرتا تھا ڈاکٹر صاحب مرحوم پیام مشرق کا نیا اڈیشن چھپوانا چاہتے تھے، اور ایک دوست سید نذیر نیازی صاحب نے میرا تعارف اور میرے پریس کی سفارش کرنیکا وعدہ کیا تو میں نے موقع کو غنیمت جانا اور لاہور چلا گیا اس وقت میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کا مکان میکلیوڈ روڈ پر تھا. ویسے تو مکان کا پھاٹک بھی تھا اور اپنی الگ سڑک بھی تھی، لیکن پھاٹک چند ٹوٹی پھوٹی کوٹھریوں کی بغل میں تھا اور اس پر جو بورڈ لگا تھا اس پر نہ زمین کی سیاہی باقی رہی تھی نہ حرفوں کی سفیدی، بس رنگ اور گرد کے بڑے بڑے دھبے سے تھے، اور ڈاکٹر صاحب مرحوم کے سوا اور کسی کو ہمت نہ ہو سکتی تھی کہ ایسے بورڈ کو اپنے پھاٹک پر ٹنگا رہنے دے پھاٹک کے اندر احاطہ خاصا بڑا تھا، لیکن وہاں پہنچنے پر ڈاکٹر صاحب مرحوم کے دیدار کے خیال نے نظر کو اِدھر اُدھر دوڑنے نہ دیا، میرے دوست نے ڈاکٹر صاحب کے ملازم علی بخش کو پکارا، وہ ایک طرف سے دوڑتا ہوا آیا، مگر

آواز کا جواب خود ڈاکٹر صاحب نے دیا۔

"آؤ جی نیازی صاحب"

ہم دونوں جلدی سے زینوں پر چڑھ کر برآمدے میں پہنچے، میرا تعارف کرایا گیا اور میں آدب سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے تازی چلم بھروائی اور بے تکلفی سے باتیں شروع کر دیں۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ حسن و عشق کے ذکر کا نہیں تو ردیف اور قافیہ اور بحر کے ترنم کا اثر شاعر کی صورت پر پڑتا ہے اور صورت میں کوئی غیر معمولی بات نہ ہو تو ادا، انداز، آنکھوں کی چمک، ہونٹوں کی لرزش، کوئی نہ کوئی خصوصیت نظم کہنے والے کو اُن لوگوں سے ممتاز کر دیتی ہے جو نثر سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ اِسی وجہ سے یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی تھی کہ ڈاکٹر اقبال کی صورت شکل، وضع قطع، لباس اور گفتگو میں اُن کی شاعرانہ عظمت کا پتہ دینے والی کوئی صفت نہیں۔ میں اِس غلط فہمی میں مبتلا تھا اور پہلی نظر نے اسے اور بڑھا بھی دیا۔ نیلی قمیص، شلوار نہ میلی نہ صاف، بال مٹیالے بھورے رنگ کے جنہیں حجام نے جیسے سمجھ میں آیا کاٹ دیا تھا، رنگت بے آب، آنکھیں دھوپ میں بیٹھے رہنے سے دبی اور دھنسی ہوئی، مونچھیں پتلی اور آگے کو نکلی ہوئیں، دہانہ چوڑا اور اُس کے دونوں طرف گہری جھریاں، اس پر زبان ملی جلی اردو اور پنجابی۔ یہ شاعر کا سراپا نہ کہلائیگا اور دراصل یہ ڈاکٹر صاحب کی اصل صورت تھی بھی نہیں، بلکہ شلوار اور قمیص کی طرح روزمرہ کی صورت جو ایک پردے کی طرح اوپر پڑی رہتی تھی، اور اُن کی اصل صورت کو روزمرہ کے گرد و غبار اور اس میل سے بچاتی تھی جو سبھی کے جسم پر جا کرتا ہے۔

یہ اُوپر کا پردہ اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کرنے کے بعد ہی اُٹھ گیا جب ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کی موجودہ حالت پر گفتگو شروع کی۔ وہ تخیل اور رحمت کی اِس پستی سے

بیزار تھے جو تعلیم یافتہ مسلمانوں کو صنعت اور کاروبار سائنس اور تجارت کے میدانوں میں قدم رکھنے سے روکتی ہے اور اُنھیں تاریخ اور ادب کی کتابیں چاٹنے کے سوا اور کسی لائق نہیں چھوڑتی ڈاکٹر صاحب کو یہ بات بہت پسند آئی کہ میں نے جرمنی جاکر پریس کا کام سیکھا تھا اور اُن کی ہمت افزائی نے مجھے بھی اس کا موقع دیا کہ میرے دل میں اُن کی جو عزت اور محبت تھی اُسے ظاہر کروں۔ پھر اگلے وقتوں کی باتیں چھیڑیں۔ مسلمانوں کا حال تو آپ جانتے ہیں، تاریخ اُن کے مکان کی چھت ہے، اور وہ ہر وقت اِس فکر میں رہتے ہیں کہ دیواریں کہیں اِتنی کمزور نہ ہو جائیں کہ چھت کا بوجھ نہ سنبھال سکیں کہیں ان کے سر سے سایہ نہ اُٹھ جائے، ان کا گھر ویران نہ ہو جائے۔ اگلے وقتوں کی باتیں چھیڑیں تو ڈاکٹر صاحب کی صورت سے دوسرا پردہ ہٹا۔

ظاہر میں تو وہی ڈاکٹر اقبال اسی لباس میں اسی کرسی پر دھوپ میں بیٹھے حقے کے کش پر کش لے رہے تھے، لیکن ان کی باتیں سُنتے سُنتے کبھی تو اُس کتب خانہ کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی تھی جہاں علم کا سارا ذخیرہ جمع ہو، جہاں عالم اور شاعر اور فقیہ مل کر بیٹھتے ہوں، اُن کے دل میں ایک خیال زبان پر ایک بات، آنکھ میں ایک نشہ ہو، اور ان کی صحبت نے ایک فضا پیدا کر دی ہو جو آدمی کی رگ وپے میں سرایت کر جائے، اور اس کے دل میں وہی ایک خیال سما جائے، زبان سے وہی ایک بات نکلے، آنکھ اسی ایک نشہ میں مست ہو جائے کہ جس نے عالم اور شاعر اور فقیہ کی تین ہستیوں کو ایک شخصیت بنا دیا تھا، کبھی نظر ہر قید سے آزاد ہو جاتی تھی، مشرق سے مغرب تک دنیا ایک قالین کی طرح بچھ جاتی تھی، اور دنیا کا وہ کاروبار جو تخیل کو عاجز کر دیتا ہے آنکھ سے دکھائی دینے لگتا، کبھی جہالت کی تاریکی علم کی روشنی سے چھنتی، مشکل کی گرہ شوق کے

ہاتھوں کھلتی، کبھی علم اور شوق کی پیاس جذبۂ دین کے اُبلتے چشموں میں بجھتی، کبھی منزل کی دوری ہمت کو ڈراتی، کبھی منزل پر پہنچ کر انسان زمین آسمان پر اس طرح نظر ڈالتا ہوا دکھائی دیتا جیسے کسان اپنی زمین کو دیکھتا ہے۔ اس وقت بھی ڈاکٹر اقبال اسی لہجے میں، اسی انداز سے باتیں کر رہے تھے، لیکن میرا سر جھکتا جا رہا تھا، آنکھیں کھلتی جا رہی تھیں۔

یہ دوسرا پردہ نہیں ہٹا، اس کے آگے میں اور کچھ نہ دیکھ سکا۔ اس کے آگے اور کوئی بھی جا نہیں سکتا تھا، کیونکہ وہاں ڈاکٹر اقبال کی خلوت تھی جس کا ایک ہی دروازہ تھا اور وہ آسمان کی طرف کھلتا تھا۔

اس پہلی ملاقات کے بعد میں دو تین روز کے اندر کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا مجھے معلوم ہو گیا کہ ان کے یہاں صبح سے شام تک ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے، دو ایک بار میں ایسے وقت بھی گیا جب وہاں اور لوگ بھی بیٹھے تھے اور ان سے ڈاکٹر اقبال کی جو گفتگو ہوتی تھی وہ بھی میں نے سنی پھر میری سمجھ میں آ گیا کہ ڈاکٹر صاحب اپنی شخصیت کو تہ در تہ کیوں رکھتے ہیں، لاہور کے شہری بن کر کیوں رہتے ہیں، ملت اسلامی کا آفتاب ہوتے ہوئے بادلوں کے نقاب کیوں ڈالے رہتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بے پروائی جو شاعرانہ مزاج کے لوگ بکھرے بالوں اور بیڈھنگے کپڑوں سے ظاہر کرتے ہیں، ڈاکٹر صاحب نے اس طرح سے برتی کہ اپنے آپ کو ہر امتیاز سے محروم کر دیا، وہ خوش مذاقی جو دوسرے اچھے کپڑوں، سلیقے کے رہن سہن، نفاست اور تکلفات میں تلاش کرتے ہیں انھیں ملنساری، ہنسی مذاق اور دریائی پرند کی طرح پانی میں رہ کر پر پرواز کو خشک رکھنے کی صفت میں ملی۔ انھوں نے اس ادبی وضعداری کو نظر انداز کیا، جس کی رسائی بہا

اور آداب صحبت کے آگے نہیں، اور اس اعلیٰ وضعداری کو اختیار کیا جو منجدھار میں چٹان کو قایم رکھتی ہے، یا زمین آسمان کی گردش میں قطب کے تارے کو۔ وہ دنیا میں دنیا والوں کی طرح رہتے تھے، دل میں صاحب دلوں کی طرح، گفتگو جلوت میں کرتے تھے، شعر خلوت میں کہتے تھے۔ وہ خود بالکل سچ فرما گئے ہیں کہ ؎

باچنیں زور جنوں پاس گریباں داشتم
در جنون از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست

جنوں کے اس زور میں بھی میرا گریبان کبھی چاک نہ ہوا، یہ ہر دیوانے کے بس کی بات نہیں کہ جنون میں بھی آپے سے باہر نہ ہو۔

ان کی ظاہری صورت در اصل ضبط کا ایک پردہ تھا، اور اس میں خوبی یہ بھی کہ یہ پردہ قدرتی تھا، جیسے ہیرے کے لیے پہاڑ کا آنچل، موتی کے لئے سیپ کا سینہ ہوا کرتا ہے۔

یہ سوچ کر مجھے اور بھی تعجب ہوتا ہے کہ ایسے لوگ جن کے دل میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کی بڑی قدر تھی یہ شکایت کرتے تھے کہ ان سے مل کر وہ اس طرح محظوظ نہ ہوئے جیسا کہ ان کا کلام سن کر محظوظ ہوتے تھے۔ ڈاکٹر اقبال کی صحبت میں بیٹھ کر ہر شخص ان کا جلوہ دیکھ سکتا تو ڈاکٹر اقبال نہ رہتے یا ان کا جلوہ نہ رہتا۔ اُن کی صحبت، در اصل صحبت میں بیٹھنے والے کا امتحان تھا۔ وہاں جاکر دوسرے یہ اندازہ نہ کر سکتے تھے کہ ڈاکٹر اقبال کتنے بڑے آدمی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال خود یہ اندازہ کر لیتے تھے کہ ملنے والا کس ذہنیت اور کس مذاق کا آدمی ہے، اور اسی کے لحاظ سے گفتگو ہوتی۔ ڈاکٹر اقبال کے اپنے ذہن میں بڑی لوچ تھی، وہ نہ عقاب کی طرح بلندی کے پابند تھے، نہ چوپایوں اور آدمی کیطرح

پستی میں گرفتار۔ سچے شاعر کا کلام اس کی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے، ڈاکٹر اقبال اپنی نظموں میں اپنے متعلق جو کچھ کہنا تھا کہہ چکے تھے اب یہ اُن کے قدردانوں کا فرض تھا کہ ان کی شخصیت کو سمجھیں، اس سے اثر لیں، اور روزمرہ زندگی میں اُنھیں باتوں کے چرچے کریں جو ڈاکٹر اقبال کے دل اور اُن کے کلام میں رہتے تھے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا ...... اور اس کا دکھ سب سے زیادہ خود ڈاکٹر صاحب کو تھا۔ ان کی مایوسی کا جو عالم تھا وہ اُن کی ان بیمثل نظموں سے ظاہر ہوتا ہے، جن میں اُنھوں نے اپنی بے قدری اور تنہائی کی کیفیت بیان کی ہے، اور اسی کی پرچھائیں سی، میں ایک مرتبہ اُن کے چہرے پر دیکھ بھی چکا ہوں۔ لوگوں نے اُنہیں سیاست میں الجھایا، ان کی بات نہیں سمجھے، ان کی زبان سے اپنی بات کہلوانے کی فکر میں لگے رہے، ان کی بڑی غرض کو اپنی حقیر اغراض کا روپ دے کر اسے رسوا کیا، اُن کے بڑے کام کے بہانے سے اپنا چھوٹا کام نکال کر اُنہیں اور ساری دنیا کو دھوکا دیا۔ جنھوں نے یہ نہیں کیا وہ بھی عمل کا، کام کر کے دکھانے کا، تحریکیں اُٹھانے کا شور مچاتے رہے۔ ڈاکٹر اقبال سے مطالبہ کرتے رہے کہ اپنی آنکھیں بند اور دل خاموش کر کے ان میں آ کر مل جائیں، اُجالے سے فائدہ نہ اُٹھایا، آفتاب کو اپنے پاس بلاتے رہے۔

ڈاکٹر اقبال کا بڑا دل چھوٹے کاموں میں لگ ہی نہ سکتا تھا اور کوئی مانے یا نہ مانے ان کا دل اپنا بڑا کام کر بھی گیا۔ جس شخصیت کا وہ خواب دیکھتے تھے اس کے اور اُن کے درمیان بس موقع کا فرق تھا، جس عمل کو وہ سچا عمل سمجھتے تھے۔ وہ غور کیجیے تو اُن کے اپنے کارناموں کا بس دوسرا رُخ ہے۔

اُنھوں نے اپنے اندر وہ یقین پیدا کر لیا تھا جو دنیا میں ایمان پھیلاتا ہے اور زندگی کا سارا بوجھ سنبھالتا ہے اور اُن کے ذہن میں اِنسانیت کا جو تصور تھا وہ وہی ہے جس نے دنیا کو بارہا ایک نئی دُنیا بنا دیا ہے، اور ان کے کلام میں ایک نئی دنیا بنی بنائی ملتی بھی ہے، اُنھوں نے بہتیرے بھید بُوجھ لئے تھے جو یقین کی جان اور اِنسانیت کی آبرو ہیں، اور ان میں وہ صفت پائی جاتی تھی جو سچّے یقین، سچی اِنسانیت، سچے علم کی پہچان ہے، یعنی ایک پوری ملت کے تمام گہرے اور مستقل اور زندگی کو شکل وصورت دینے والے جذبات سمٹ کر اُن کے دل میں آ گئے تھے اور اُسے ایک ایسا نمونہ بنا دیا تھا کہ جسے دیکھ کر تاریخ کہتی ہے کہ ہاں صحیح ہے، مذہب کہتا ہے کہ ہاں یہی چاہیئے، اور ہر زمانے کے لوگ کہتے ہیں کہ ہماری آرزو ہے کہ ہم بھی ایسے ہو جائیں۔ چھوٹی شخصیتیں سمندر کی کشتیوں کی طرح چاہتی ہیں کہ احتیاط کا لنگر ہو، ہر دلعزیزی کا بادبان ہو، قومی جذبات کی ہوا موافق ہو اور چلتی رہے، ستانے اور پناہ لینے کے لئے ذاتی زندگی اور معاملات کا ساحل قریب رہے، تب کہیں وہ اپنی چال دکھا سکتی ہیں اور منزل تک پہنچانے کا حوصلہ کر سکتی ہیں۔ وہ موج تو چیز ہی اور ہوتی ہے جو سمندر کی تھاہ لیتی ہے کہ گہرائی کافی ہے یا نہیں، ہوا کو للکارتی ہے کہ دم ہو تو ذرا اپنا زور دکھا، آسمان سے کہتی ہے کہ ذرا اور اُونچا ہو سکتا ہو تو ہو جا۔ اسے ساحل سے عداوت ہوتی ہے، وہ آپ اپنی منزل ہوتی ہے، اسے کہیں جانا نہیں ہوتا، اُس کے لئے اُٹھنا اور تڑپنا بس ہے۔ ڈاکٹر اقبال کی شخصیت ایسی ہی ایک موج تھی اور اس کا سمندر عالم اسلام تھا۔ میں اِس سمندر کا ایک گمنام قطرہ بھلا کیا بتا سکتا ہوں کہ موج اٹھی اور اُس نے سمندر کو تہ تک ہلا دیا، تڑپ کر آسمان کا منھ چوما اور پھر بیٹھ کر سمندر بن گئی تو اس میں موج اور موج کو پیدا کرنے والے کی کیا مصلحت تھی، وہ کچھ اور کیوں نہ تھی، اس نے کچھ اور کیوں نہ کیا

میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ یہ موج نہ ہوتی تو کوئی نہ تھا جو مجھے اپنے پہلو میں لیتا اور اتنا اونچا اٹھا دیتا کہ سمندر کو دیکھوں، سمندر کے پھیلاؤ کو دیکھوں، دونوں جہاں پر ایک نظر ڈالوں اور تھوڑی دیر کے لئے سمجھ لوں کہ قطرہ کی بھی کچھ ہستی ہوتی ہے۔

عبدالقادر سروری
ایم، اے صدر شعبہ اردو و
فارسی میسور یونیورسٹی

اقبالؔ

حیات اور شاعری

" طرزِ جدید کا حق ادا کرنا میری طاقت سے باہر تھا۔ البتہ میں نے اُردو میں نئی طرز کی ایک اَدھوری اور ناپائدار بنیاد ڈالی ہے اس پر عمارت چننی اور اس کو ایک قصرِ رفیع الشان بنانا ہماری آئندہ ہونہار اور مبارک نسلوں کا کام ہے جن سے اُمید ہے کہ اِس بنیاد کو ناتمام نہ چھوڑیں گے "

(حالیؔ "مجموعہ نظم")

جدید اُردو ادب کا متعلم کسی موجودہ شاعر یا انشا پرداز کے متعلق کچھ لکھنا چاہے تو جب تک سرسید احمد خاں اور حالی کی خدمات کا اعتراف نہ کرے، ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا۔ حق یہ ہے کہ نثر کے لئے سرسید نے اور شاعری کے لئے حالی نے جو عہد آفریں خدمت انجام دی ہے، وہ تاریخ ادب اردو کے صفحات سے محو نہیں ہو سکتی ان بزرگوں کے اثرات موجودہ نسلوں میں آج تک زندہ ہیں۔ قدیم شاعری اور

اسالیب انشا پردازی سے بغاوت کے جو تخم انھوں نے بوئے تھے وہ ہر وقت ایک نئے بار آور درخت کی صورت میں نشو ونما پا رہے ہیں۔ زندہ شاعروں میں اس عہد آفرینی کا سب سے زیادہ مہتم بالشان مظہر خود اقبال کی شاعری ہے جس کی اپنی تخم ریزی گزشتہ سے زیادہ اہم نتائج پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے۔

ادبیات ہمیشہ قومی زندگی کا عکس سمجھی گئی ہے۔ مغل ہندی تمدن کے زوال کے بعد ہم میں سے وہ جوہر مفقود ہو چکا تھا جس کی موجودگی کسی قوم کی طبعی اور ذہنی ترقی کی سرمایہ دار ہوتی ہے۔ حالی اور سرسید سے پہلے ہندوستان میں کوئی بڑی ہستی شاید ہی نمودار ہوئی ہو۔ اور یہی حقیقت اِس امر کی توجیہہ بھی ہے کہ دورِ تنزل کے بعد سے ہندوستان کی مختلف زبانوں میں کوئی ایسا قابل ذکر کارنامہ سرانجام نہ پا سکا جو دنیا کے ادبی شہ کاروں کے ساتھ باقی رہ سکے۔

یہ کہنا تو زیادتی ہے کہ قدیم اردو شاعری جو بیشتر غزل گوئی پر مشتمل ہے کسی خوبی سے عاری ہے۔ یا یہ کہ اس میں فطریت مفقود ہے۔ فطرت کا دائرہ اِس قدر وسیع ہے کہ اس میں کائنات کی ہر شے داخل ہو جاتی ہے۔ اردو شاعری بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ جس طرح وہ ولی سے پہلے اور میر کے زمانہ تک فطری تھی۔ حالی کے زمانہ تک بھی فطری رہی۔ صرف اس کا دائرہ محدود تھا۔ قدیم شاعر، کائنات کی گوناگوں اشیاء میں سے صرف انسان کو اپنا موضوع سمجھتا تھا۔ اور انسان میں بھی وہ غیر معمولی انسان جس کا دل کسی کی زلف پیچاں میں پھنسا ہوا ہو اور جو اپنے ہم جنس کی محبت میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو رہا ہو۔ فطرت کے ایک ہی پہلو کی یہ تکرار آخر کار زیاں کار، اور زبوں اثر بن گئی۔ گو میر حسن، میر انیس، مرزا دبیر اور میاں نظیر اکبر آبادی نے اپنی اپنی بساط کے موافق شاعری کی اس حد کو توڑ کر باہر نکلنے کی کوشش کی، لیکن یہ اتفاقی بات ہے اُن کے کلام کا اثر اُن کے ماحول پر

ہنیں پڑا۔ ورنہ یہی زمانہ جدید شاعری کی ابتدا کا شمار ہوتا۔ ان شعرا کی نرالی رفتار بعض وقت تو انہیں، شعرا کے مسلمہ دائرہ سے خارج کرنے کی ملزم ثابت ہوئی ماحول پر اثر ڈالنے اور شعرا اور غیر شعرا کی ذہنیتوں میں انقلاب پیدا کرنے کی خدمت قدرت نے آزاد بھی ہنیں بلکہ حالی کے سپرد کی تھی۔ حالانکہ دونوں معاصر ہیں۔ اور آزاد کو تاریخی لحاظ سے یہ فخر حاصل ہے کہ وہ سب سے پہلے جدید شاعر ہیں۔

حالی نے سرسید احمد خاں کی شرکت میں جو عہد آفریں کوشش شروع کی تھی، وہ اقبال کی شاعری میں منتہا تک پہنچتی نظر آتی ہے۔ گو خود حالی نے قدیم اساتذہ فن کی صحبت میں نغمہ طرازی سیکھی تھی، اور وہ اُن کے اثر سے بھی بالکل عاری نہیں تھے، لیکن طبع سلیم رکھتے تھے، اس لئے جب اپنی ابتدائی شعری کوششوں سے اکتا گئے تو اپنے لئے نئی دنیا پیدا کرنی چاہی۔ اس مہم پر تنہا روانہ ہونے کو وہ تنہا خوری سمجھتے تھے، اسی لئے اُنھوں نے بہت سے شاعروں اور غیر شاعروں کو اپنا ہمنوا بنالیا۔ اِس مہم میں حالی کو جس قدر کامیابی ہوئی اس کو ہم نے حالی کے مضمون میں صاف طور سے بتلایا ہے۔ یہاں اُس کے مابعد اثرات ہمارے سامنے ہیں۔ گویا یہ حالی کی اس خواہش کی تکمیل ہے جو اس مضمون کے آغاز میں نقل کی گئی ہے۔ حالی کے فوری عمل کا باعث انگریزی اَدب اور شاعری سے روشناسی ہوئی۔ لیکن اپنی زبان کی روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے اُنھوں نے کبھی اس امر کی تلقین ہنیں کی کہ غزل، قصیدہ رباعی، یا دوسرے اصناف شاعری کو چھوڑ کر انگریزی نظم کے اصناف جیسے سانٹ، اوڈ، وغیرہ کو اختیار کریں، ان کی اصلی کوشش شاعری کے پامال مضامین سے توجہ کا ہٹانا تھی۔ صنف خواہ غزل ہو یا مثنوی۔ چنانچہ خود اُنھوں نے اور اُن کے اکثر متبعین نے یہی کیا کہ قدیم اصناف کو قائم رکھ کر پامال اور تکراری

پیالے وہی رہے لیکن مے بدل گئی

مضامین سے اجتناب کرنا شروع کیا۔ گویا حالی ہی کے الفاظ میں "مے تو وہی رہی لیکن "پیالے" بدل گئے۔ سانچے تو وہی رہے، لیکن مطالب میں وسعت ہو گئی۔

حالی کی تلقینات کا فوری اثر یہ ہوا کہ اردو شعرا خواب سے جاگ اُٹھے گو اُنھیں منزل مقصود کی فکر ابھی نہیں ہوئی۔ تاہم راستوں کی صحت پر تو وہ غور کرنے لگے۔ سامنے حالی کا دکھلایا ہوا راستہ اور اُن کے چھوڑے ہوئے نقش قدم نمایاں تھے۔ ان پر چلنا تو دشوار نہیں تھا۔ اِس لئے جدید شاعری کے آغاز میں قومی، اخلاقی اور فطری شاعری کا بازار خوب گرم رہا۔ یہ بھی اردو شعرا کی تقلید پسند ذہنیت کا ایک مظہر ہے اُنھیں میں بعض سخن گو ایسے بھی تھے، جو حالی کے مقلد تو تھے، لیکن لفظی نہیں معنوی طور پر اُنھوں نے حالی کی تلقین شعری کی اِسپرٹ کو خوب سمجھا اور لفظی تقلید کی بجائے ذاتی مشاہدات، ضروریات اور خیالات کو اپنی شاعری کا محور بنایا ان میں اسمٰعیل میرٹھی کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ اسمٰعیل خاص کر نیچرل شاعری کے گُر سے حالی سے بھی زیادہ اور ایسے ہی واقف ہیں جیسے کوئی قدیم یا جدید مغربی شاعر ہو سکتا ہے۔ ان کی شاعری درحقیقت حالی کی شاعری کا ضمیمہ ہے جس کا ایک کھلا ثبوت ذیل کے اشعار ہیں اسمٰعیل، حالی کی طرح اپنے زمانے کے شعرا کی مذمت یوں کرتے ہیں:-

سخنوران زماں کی بھی ہے یہی حالت — کہ اس قدیم ڈگر کو نہ چھوڑیے زنہار
سوائے عشق نہیں سوجھتا نہیں مضمون — سو وہ بھی محض خیالی گھڑت کا ایک طومار
نہ لکھتے ہیں کبھی نیرنگ حکمت و قدرت — نہ واقعات کے وہ کھینچتے ہیں نقش و نگار
ہے شاعری میں یہ پہلا اصول موضوعہ — کہ جھوٹ موٹ کے بن جائیں ایک عاشق زار
تمام اگلے زمانہ کا ہے یہ پس خوردہ — کہ کر رہے ہیں جگالی وہ جس کی سو سو بار

کمال اپنا سمجھتے ہیں خود ستائی کو | نہ ننگ ہے نہ حیا ہے نہ شرم و غیرت و عار
اسی طرح سے ہمارے زمانہ کے شاعر | سمجھتے اپنی خرافات کو ہیں عین وقار
جو ان کے دیکھئے دیواں تو بور کے لڈو | غلیظ و گندہ سراسر نتیجۂ افکار

آگے علماء، فلسفیوں، مشائخین، مصنفین وغیرہ کی برائیاں حالی کی اسپرٹ میں گنوائی ہیں۔

غرض حالی نے زبان میں نہیں خیال میں بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ شعراء کی ذہنیت میں تبدیلی پیدا کرنی چاہی۔ خیال کی تبدیلی میں کئی امور شامل ہیں۔ شاعری قوم کے تمدن اور تربیت کا ایک اہم جز اور مظہر ہے۔ اگر حقیقی ہو تو اس میں قوم کی حیات کا پورا عکس نظر آ سکتا ہے۔ سرسید اور حالی کی اصلاحی کوششوں سے ہمارے قدیم تمدن کو بھی دھکا لگا۔ حالی کی شاعری کی عقبی زمین بڑی حد تک جدید مغربی تمدن تھا۔ ممکن ہے کہ وہ اس معاملے میں سرسید احمد خاں کی طرح اِنتہا پسند نہ ہوں، لیکن سرسید کے اصول کے موافق ضرور تھے۔ یہ اصول یہ تھا کہ کوئی تنزل پذیر قوم ترقی اسی وقت کر سکتی ہے، جب وہ اپنے قدیم اور ترقی کے سدراہ روایات اور خیالات کی شکست و ریخت کر کے ترقی یافتہ اقوام کے ساتھ شریک رفتار ہو جائے۔ یہ بزرگ اس عقیدے کے موافق نہیں تھے کہ تنزل پذیر اقوام اپنی شاندار ماضی کی طرف رجوع کرنے سے پھر اُبھر سکتی ہیں۔ زمانے کی ضروریات اور مطالبات کو وہ زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

جدید تمدن کے نمونوں کو دیکھ کر بہت سے قدامت پسند، نہ صرف اُن کے بلکہ اس اصول کے بھی مخالف ہو گئے۔ اِنہیں قدامت پسندوں میں بعض صاحب رائے ایسے بھی تھے، جو اِس حقیقت کا بغور مطالعہ کر رہے تھے کہ مغربی تہذیب اور تمدن کا استقبال ہندوستانیوں کی ذاتی ضروریات اور احساس کا نتیجہ نہیں ہے

بلکہ محکوم ذہنیت پر حکومت کا اثر ہے۔ اُن کی نظر میں مغربی تہذیب ایک طرح کا ملمع تھا، جو ادنیٰ درجہ کی دھات پر صرف اس لئے چڑھایا جاتا ہے کہ اس کو زیادہ شاندار دکھا سکے۔ ممکن ہے کہ انہیں میں سے بعض بزرگ مذہبی بنیاد پر سرسید اور حالی کے اُصول سے مخالفت پر کمربستہ ہوگئے ہوں۔ اس طرح کی مخالفتیں نثر اور نظم دونو کے ذریعہ ہوئیں۔ نثر تو اس زمانے کے اخبارات میں مدفون ہے، لیکن شاعری میں خاں بہادر اکبرحسین الہ آبادی کی کوششیں چوٹی پر نظر آتی ہیں۔ اکبر کی شاعری پر ہم نے گزشتہ کسی مضمون میں مجمل بحث کی ہے۔ یہاں ربط مضمون کے لئے اس کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

اکبر کی شاعری کا مطالعہ صاف طور پر بتلا رہا ہے کہ وہ مغربی تہذیب کی والہانہ اور کورانہ تقلید کو ایک قوت فیصلہ رکھنے والی قوم کے افراد کے لئے بے حد مذموم جانتے تھے۔ انہیں نظر آرہا تھا کہ ہندوستانی ترقی کے جوش اور ولولے میں بلکہ ترقی کی تقلید میں اپنے تمدن کی خوبیوں اور روایات کو بھی بے دردی کے ساتھ پامال کر رہے ہیں۔ ہندوستان کے تمدن میں مغربی تمدن کا پیوند اُنہیں عجب بے جوڑ معلوم ہوتا تھا۔ پھر ترقی کی خیالی بنیادوں پر عمارت کا چننا، اس کی کشمکش، چہل پہل غرض ہر کوشش اُن کے حساس دل کو بُری طرح جلا رہی تھی۔ اور یہ جلے دل ہی کا اثر تھا، جو ایسے جلے کٹے شعر نکلتے تھے۔

ترقی کی تہیں ہم پر چڑھا کیں — گھٹا کی دولت اسپیچیں بڑھا کیں
رہیں ہر پھر کے بی آپا نصیبن — وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

گھر سے جب پڑھ لکھ کے نکلینگی کنواری لڑکیاں — دلکش و آزاد و خوشرو، ساختہ پرداختہ
یہ تو کیا معلوم کیا موقع عمل کے ہونگے پیش — ہاں نگاہیں ہوں گی مائل اس طرف بیساختہ

مغربی تہذیب آگے چل کے جو حالت دکھائے ایک مدت تک رہیں گے نوجوان دل یافتہ

کہیں کہیں اکبرنے حالی اور سرسید پر تعریف بھی کی ہے۔ کھلی یا پوشیدہ دونوں طرح۔

دلادے ہم کو بھی صاحب سے لائلٹی کا پروانہ قیامت تک رہے سید ترے "آنر" کا افسانہ

الایا ایہا الطفلان بجو راحت بنا وہا کہ قرآں سہل بود اول ولے افتاد مشکلہا

بکن تزئین پائے خود بہ بوٹ ڈاسن و پتلون کہ سرسید خبردار و زرسم و راہ منزلہا

عزت کا ہے نہ اوج نہ نیکی کی موج ہے حملہ ہے اپنی قوم پہ، لفظوں کی فوج ہے

ظاہر ہے کہ اکبر نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ ان کو بھی ہر ذی حس کی طرح قوم کی فلاح کا درد تھا اور اُس سے کچھ کم نہ تھا جتنا سرسید یا حالی کو تھا۔ اختلاف صرف نقطہ نظر کا تھا۔ اکبر یہ بھی سمجھتے تھے کہ زمانہ سرسید اور حالی کی کوششوں کا ساتھی ہے۔ تاہم وہ ترقی کے خواہشمندوں کو ان کے راستہ کی دلفریبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی متوقع دشواریوں سے بھی واقف رکھنا چاہتے تھے۔ نیز صاف اظہار خیال میں انہیں ایک طرف حکومت کی چیرہ دستیوں کا خوف تھا، تو دوسری طرف نئے تمدن کے پرستاروں کے جوش عمل سے اُنہیں کھٹکا لگا ہوا تھا کہ اُن کے مشاہدات اور تاثرات پوری طرح ظاہر نہیں ہوسکیں گے۔ اسی لئے اُنھوں نے ظرافت کا پیرایہ اختیار کر کے اپنی شاعری پر ہنسنے والوں سے پہلے اپنے خیالات پر خود آپ ہنسنا اور ہنسانا شروع کیا۔ اکبر کی شاعری میں یہ چیز اس کے موضوع شاعری کے برابر اہم ہے۔

تائید وضع ملت و دیں کی کرونگا میں اہل زمانہ لاکھ ہنسیں مجھ غریب پر

ہوتا نہیں طبیب مداوا سے دست کش سچ ہے اجل تو ہنستی ہے سعی طبیب پر

آزاد، حالی اور اسمٰعیل کے عمل اور اکبر کی مخالفت کے اثرات ابھی نمایاں بھی نہ ہونے پائے تھے کہ سیالکوٹ کا یہ نوجوان شاعر اٹھتا ہے۔ اور اپنے ذوق کی دستیاری سے نغمہ سنجی شروع کرتا ہے۔

پہلے تو وہ ماحول سے متاثر ہوتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ اس کا ذاتی تجربہ اس کو ایسی لَے اختیار کرنے پر مجبور کر دیتا ہے جو اس کے ہم صفیروں میں سب سے زیادہ اہتزاز پیدا کرنے والا ہے۔

شاعر کے ذاتی حالات کا اس کے کلام پر بڑا اثر پڑتا ہے۔ اقبال کا خاندان کشمیر کا ایک قدیم اور معزز خاندان ہے۔ اُن کے اجداد دینی علوم سے خاصا شغف رکھتے تھے جس کا گہرا اثر کلام سے نمایاں ہے۔ اقبال خود سیالکوٹ میں پیدا ہوئے جہاں اُن کے والد آکر رہ گئے تھے۔ ولادت ۱۸۷۳ء میں ہوئی۔ سیالکوٹ ہی میں ابتدائی عمر کا زمانہ بسر ہوا۔ اور بعد کو ڈگری کی تعلیم کے لئے وہ لاہور چلے آئے۔ کشمیر کی دلفریبی سے ایک عالم متاثر ہے۔ اقبال جیسے شاعر کے دل سے اس شعریت بھرے خطہ زمین کی یاد کہاں نکل سکتی تھی؟ بچپن کے اکثر قطعات میں کشمیر کو یاد کیا ہے۔ ؎

کشمیر کا چمن جو مجھے دلپذیر ہے | اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثہ میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد | جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور | یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستان میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر | بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

کیا عجب ہے کہ ذیل کے اشعار میں بھی یہی احساس کام کر رہا ہو۔

کیا بدنصیب ہوں میں گھر کو ترس رہا ہوں | ساتھی تو ہیں وطن میں میں قید میں پڑا ہوں

ارماں ہے یہ جی میں اُڑ کر چمن کو جاؤں ٹہنی پہ گل کی بیٹھوں آزاد ہو کے گاؤں

پھر دن پھریں ہمارے پھر سیر ہو وطن کی اُڑتے پھریں خوشی سے کھائیں ہوا چمن کی

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے دُکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

اقبال کی خاندانی خصوصیات کی طرح اُن کی تعلیم کی روش نے بھی اُن کی طبیعت کو بنانے میں بڑا حصہ لیا ابتدائی تعلیم کے لئے وہ سیالکوٹ کے ایک قدیم مکتب میں بٹھائے گئے، آئندہ فدائی مشرق کے دل میں مشرقی فنون سے عشق کی یہ تخم کاری تھی۔ یہاں اقبال نے کچھ ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں کہ ضرورت زمانہ نے انھیں مکتب چھوڑ کر انگریزی مدرسہ میں شریک ہونے پر مجبور کیا۔

عموماً یہ ضروری نہیں ہے کہ دنیا کی تمام بڑی ہستیاں اپنی ابتدائی تعلیم میں یا تعلیم کے کسی خاص مرحلہ پر بھی اپنی ہم جاعتوں سے ممتاز رہی ہوں۔ اور اسی طرح ہر ممتاز طالب علم زندگی کی کش مکش میں کامیاب رہے تاہم اقبال اُن ہستیوں میں سے ہیں جو ہر جگہ اور ہمیشہ بلندی کے ممتاز معیار پر رہتی ہیں۔ امتیاز کے ساتھ اُنھوں نے ابتدائی، وسطانی اور فوقانی تعلیم ختم کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لئے اسکاچ مشن کالج میں شریک ہونے کے ساتھ ہی انھیں پبلک مقبولیت بھی حاصل ہونے لگی۔ وقوع امر سے پہلے اس کے اسباب فطرت کی طرف سے فراہم ہو جاتے ہیں۔ اس کالج میں اقبال جیسے ذہین طالب علم کو ایک جید عالم کا سہارا مل گیا۔ یہ مولوی سید میر حسن ہیں جو بعد میں شمس العلماء کے خطاب سے سرفراز ہوئے مولوی صاحب عربی اور فارسی کے متبحر عالم تھے۔ اُن کے شخصی اثر کے متعلق آنریبل سر شیخ عبدالقادر

لکھتے ہیں :" اُن کی تعلیم کا یہ خاصہ ہے کہ جو کوئی ان سے فارسی یا عربی سیکھے اُس کی طبیعت میں اس زبان کا صحیح مذاق پیدا کر دیتے ہیں " عربی اور فارسی سے مناسبت طبعی اقبال کو خاندانی ترکہ میں ملی تھی، اس پر میر حسن جیسے عالم کا ساتھ گویا پیاسے اور سمندر کی یک جائی۔

اقبال کا ذوق سلیم اور عربی اور فارسی زبانوں کا صحیح مذاق اسی تعلق کا نتیجہ ہے۔ اسی کی دستیاری سے وہ آئندہ اُردو سے زیادہ فارسی شاعری میں کامیابی حاصل کر سکے۔ اور اُردو میں نئے فلسفیانہ اور صوفیانہ مضامین کے ادا کرنے کے لئے سانچے فراہم کر دیئے۔ ان کی لفظ تراشی میں جس قدر گہرائی ہے اس سے زیادہ ادبیت بھی موجود ہے۔ فارسی شاعری میں اقبال کے کارنامے لازوال ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ اس آخری دور میں جس طرح اقبال اُردو کے ہمیشہ شاعر ہیں۔ فارسی میں بھی اُن کا ہندوستان میں کوئی مدمقابل نہیں۔ ایران میں تو اب بڑے شاعروں کا پیدا ہونا گویا مسدود ہی ہوگیا۔

اسکاچ مشن کالج سے اقبال نے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ نہ صرف عربی بلکہ انگریزی میں ان کی ممتاز کامیابی نے انہیں وظیفے اور تمغے دلائے۔ یہیں اقبال کی شاعری کی مقبولیت کی بھی ابتدا ہوئی۔ شاعر کی حیثیت سے اقبال ان لوگوں میں ہیں جن کی طبیعتیں ابتدا ہی سے بار آور ہوتی ہیں۔

لیکن اقبال کی آئندہ عظمت کا بنیادی پتھر لاہور میں رکھا گیا جہاں یہ بی، اے کی تعلیم کے لئے آگئے تھے۔ لاہور کے گورنمنٹ کالج میں اقبال فلسفہ اپنا اختیاری مضمون لے کر داخل ہوئے۔ گذشتہ لسانی تکمیل کے مرحلہ سے گزرنے کے بعد یہاں فن فلسفہ میں بھی ایک ایسا شفیق استاد مل گیا جس کو خود مشرق اور خصوصاً اسلام سے خاص اُنس تھا۔ یہ علی گڑھ کے مشہور پروفیسر

آرنلڈ ہیں جو بعد میں سر آرنلڈ ہو گئے تھے اُن کی شخصیت سے سر عبدالقادر بھی بے حد متاثر ہیں اور لکھتے ہیں کہ "پہلے اُنھوں نے علی گڈھ کالج کی پروفیسری کے زمانے میں اپنے دوست مولانا شبلی مرحوم کے مذاق علمی کے پختہ کرنے میں کامیابی حاصل کی تھی" اس دوسرے موقع پر بھی پروفیسر موصوف نے اقبال جیسے شاعر کے خیالات کو سنوارنے میں سعی مشکور کی۔ اور اس طرح اُردو کے دو بڑے اُدیب اُن سے متاثر ہوئے۔

جس طرح اقبال نے اپنی غیر معمولی ذہانت سے پروفیسر آرنلڈ کے دل میں جگہ پیدا کر لی تھی، اسی طرح آرنلڈ کی اعلیٰ قابلیت نے بھی اقبال پر احترام اور محبت کے لازوال اثرات چھوڑے۔ ان باہمی تاثرات کی ناقابل فراموش یادگار "نالۂ فراق" کے زبردست جذبات ہیں۔ انہیں کی صحبت میں دراصل اقبال کا فلسفیانہ کردار بنا اور نشو ونما پایا۔ یہی وہ تعلق ہے جس نے اُردو کو ایک غور و فکر کرنے والا شاعر عطا کیا۔

یوں تو اسکاچ مشن کالج ہی سے اقبال کی شاعری شروع ہو چکی تھی لیکن لاہور میں آکر وہ خوب چمکی۔ اس کے کئی اسباب ہیں۔ پہلے تو یہ کہ دہلی اور لکھنو کی کش مکش سے چھوٹنے کے بعد اردو ادب اور شاعری کو اب لاہور میں ٹھکانا نصیب ہوا تھا۔ اس زمانے میں کلکتہ کے علاوہ علمی سرگرمی میں یہ ہندوستان کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ دوسرے دہلی اور لکھنو کے بعض بچے کچے شاعر بھی یہاں جمع ہو گئے تھے۔ جن میں مرزا ارشد گورگانی دہلوی اور میر ناظر حسین ناظم لکھنوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان دونوں بزرگوں کے قیام نے لاہور کے بازار حکیمان میں ایک بارونق مشاعرے کی بنیاد ڈال دی تھی۔ اقبال کا ذوق شاعری بھی ان کو کشاں کشاں اس محفل تک لے گیا۔ اُن کی قابلیت نے محفلِ

مشاعرہ کے تمام اراکین کو ان کا مدّاح اور دوست بنا دیا۔ اور خود اقبال کو یہ فائدہ ہوا کہ انہیں مرزا ارشد کی فیض صحبت سے مستفید ہونے کا موقع مل گیا داغ دہلوی سے مشورہ کرنے سے پہلے اقبال نے ارشد گورگانی سے بھی اِصلاح لی۔

ابھی دہلی کے آخری شاعر مرزا خاں داغ دہلوی زندہ تھے۔ اُن کی غزل خوانی کے انوکھے انداز نے اُنہیں نہ صرف اُردو کے پچھلے تمام شاعروں سے ممتاز بنا دیا تھا، بلکہ اپنے معاصرین شعرا میں استادی کا درجہ بھی عطا کر دیا تھا۔ گو یہ ملازمت کے سلسلے میں دکن آ گئے تھے، لیکن ان کا فیض ہندوستان بھر میں بواسطہ اور بلا واسطہ برابر جاری تھا۔ اقبال ابتدائی غزل گوئی میں اُن کے رنگ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مراسلت کے ذریعہ ان کی شاگردی اِختیار کر لی۔ اس واقعہ کا اثر صرف واقعے کی حد تک نہیں ہے بلکہ اقبال کی ابتدائی غزلوں کو بنانے اور ان کی زبان کو درست کرنے میں یہ بے حد کارگر ثابت ہوا ابتدائی غزلوں کی زبان میں وہ مرزا داغ کی سلاست اور اسلوب میں اسی ندرت کو جگہ دینا چاہتے ہیں جس سے داغ کی شاعری ممتاز ہے۔ ذیل کے انتخاب سے یہ امر بہ خوبی واضح ہو جائے گا۔

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی؟ | مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی؟
تمہارے پیامی نے سب راز کھولا | خطا اس میں بندے کی، سرکار! کیا تھی؟
بھری بزم میں اپنے عاشق کو تاڑا | تری آنکھ مستی میں ہشیار کیا تھی؟
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد | مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی؟

کہیں ذکر رہتا ہے اِقبال تیرا
فسوں تھا کوئی تیری گفتار کیا تھی؟

اِس طرح کی غزلیں اس میں شک نہیں کہ اقبال کے پاس کم ہیں، لیکن اُن کے قصداً نظری کر دیئے جانے کا سخت اِحتمال ہے۔ اقبال کی طبیعت بچپن سے سنجیدہ واقع ہوئی ہے۔ داغ کی شاعری کا اثر ان کے دل سے بہت جلد دور ہو گیا ہو گا۔ کیونکہ زبان کی چاشنی سے ہٹ کر تکراری مضامین کے سوا ان کے پاس کیا تھا، جو اس فلسفی شاعر کی توجہ کو الجھائے رکھتا۔ یقین ہے کہ اقبال نے اس طرح کی غزلیں اِنتخاب کے وقت خود چھانٹ دیں۔

غزل کی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے اقبال کے سب سے زبردست تاثر کا انکشاف بھی ضروری ہے داغ کی شاعری سے سیری حاصل ہو جانے کے بعد فطرتاً اقبال کی طبیعت کو غالبؔ کے کلام سے لگاؤ پیدا ہوا۔ غالب کا کلام درحقیقت اقبال کے مطالعہ کے قابل تھا۔ کیونکہ دونوں کی ذہنیت بڑی حد تک مشابہ ہے۔ غالب میں وہی عمق ہے جس کی اقبال کے دماغ کو ابتداء سے تلاش تھی۔ شاعر خصوصاً بڑھتا ہوا شاعر ہمیشہ مضطرب ہوتا ہے اس کی ذہنی بے چینی کو کہیں سکون مل سکتا ہے تو وہ صرف عمیق خیالات کی دنیا میں، اقبال کے متلاشی دماغ کو غالب کے کلام میں ایک ساتھی سا مل گیا۔ اِس کے بعد اُنھوں نے جو غزلیں لکھیں وہ لفظاً اور معناً غالب کی تقلید نہیں تو غالب کے کلام سے متاثر ضرور ہیں۔ ذیل کے اِقتباسات کو پڑھیئے تو وہی انداز خیال، وہی ٹیڑھی ترچھی چالیں وہی مشکل پسندی اور بعض وقت تو وہی صوری اور معنوی تقلید نظر آئے گی۔

ظاہر کی آنکھ سے نہ تماشا کرے کوئی
ہو دیکھنا تو دیدۂ دل وا کرے کوئی

منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت
اب کیا کسی کے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

ہو دید کا جو شوق تو آنکھوں کو بند کر
ہے دیکھنا یہی کہ نہ دیکھا کرے کوئی

عذر آفریں جرم محبت ہی حسن دوست — محشر میں عذر تازہ نہ پیدا کرے کوئی
نظارے کو یہ جنبش مژگاں بھی بار ہے — نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی[1]

کہوں کیا آرزوئے بیدلی مجھکو کہاں تک ہے — مری بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے
سکون دل سے سامان کشود کار پیدا کر — کہ عقدہ خاطر گرداب کا آب رواں تک ہے

"سکون دل" "کشود کار" "عقدہ خاطر گرداب کا آب رواں" وغیرہ کا جواب تلاش کیجئے تو سوائے غالب کے دیوان کے اور کہیں نہ ملے گا۔

بہرحال اقبال نے ارشد سے صوری تلمذ حاصل کیا۔ داغ سے تحریری صلاح لی مگر غالب سے معنوی استفادہ کیا۔ اور یہ آخری اثر ان کی طبیعت کے مناسب تھا، اِس لئے وہ دیرپا ہے اور اَب تک کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ اِن شعرا کے اثرات کا اختلاف ایک اور طرح بھی ظاہر ہو سکتا ہے۔

"اقبال نے داغ" کے انتقال پر اظہار غم کیا۔

بلبل دلی نے باندھا اِس چمن میں آشیاں
ہمنوا ہیں سب عنادل باغ ہستی کی جہاں
اَب کہاں وہ بانکپن وہ شوخی طرز بیاں
آگ تھی کافور پیری میں جوانی کی نہاں
تھی زبان داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلی معنی وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے

---

[1] اس کے مقابلہ میں غالب کی وہ غزل ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

جب تک دہان زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہ سخن وا کرے کوئی

اَب صبا سے کون پُوچھے گا سکوتِ گل کا راز
کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز؟
تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں

اِس سے بہتر مرزا خاں داغ کی شاعری کی تعریف نہیں ہو سکتی تھی۔ آخر میں اقبال کے جذبات محبت بھی پھوٹ پڑتے ہیں۔

"مرزا غالب" پر بھی ایک نظم لکھی ہے۔

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رَسائی تا کجا؟
تھا سَراپا روح تو، بزمِ سخن پیکر ترا
زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اِس حُسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شئے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سَرمایہ دار
جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیل سے ہے قدرت کی بہار
تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ زار
زندگی مضمر ہے تیری شوخیِ تحریر میں
تابِ گویائی سے جنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر
محوِ حیرت ہے ثریا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضمون تصدق ہے ترے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گلِ شیراز پر
لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں
ہو تخیل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہم نشیں

اِس سے بڑھکر کسی شاعر کی تعریف نہیں ہوسکتی۔ شاعر کے دل پر غالب کا زبردست قبضہ اور اس سے پیدا ہونے والے جذبات احترام پوری نظم میں ہر جگہ نمایاں ہیں یہی فرق غالب اور اقبال کے اثرات کا ہے۔

"قومی شاعری" کا مضمون حالی نے بہت ہردلعزیز بنا دیا تھا۔ اس کے باوجود اقبال اب تک اس طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے۔ اس طرف اِقبال کی توجہ کا سبب بھی ان کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہے۔

جب اِقبال لاہور کے ادبی خصوصاً شاعروں کے حلقے میں بازارِ حکیمان کے مشاعرے کی نظموں کی وجہ سے روشناس ہوگئے تو، اُن کے دوستوں نے اُنھیں اس خدمت پر بھی آمادہ کر دیا، جو اس سے پہلے حالی شبلی اور نذیر احمد انجام دیتے رہے تھے۔ لاہور کی انجمن حمایت اِسلام بڑا قدیم اِدارہ ہے اِس کے سالانہ جلسوں کی اِفتتاح بھی علی گڈھ کے یا اس سے متعلق چندوں کے جلسوں کی طرح ایک قومی نظم سے عمل میں آتی تھی۔ اِقبال بھی دوستوں کے مجبور کرنے سے، اِس خدمت کے بجالانے پر آمادہ ہوگئے' جو نظم پہلی دفعہ اُنھوں نے پڑھی وہ "نالہ یتیم" تھی۔ گویہ اِقبال کی پہلی نظموں میں سے ہے، لیکن اس کے مقابلہ میں آزاد، حالی، شبلی، اور نذیر احمد کی نظمیں نقش اولین معلوم ہوتی ہیں

جو تسلسل، جو عمق اور جو نتیجہ زائی اِس نظم میں ہے، وہ اگلی کسی نظم میں نہیں۔

یہ گویا اِقبال کی "قومی نظم" نگاری کی ابتدا تھی۔ اس کے بعد کئی اور "قومی نظمیں" جیسے "ابرِ گہر بار" "فریادِ اُمت" وغیرہ اُنہیں سالانہ جلسوں میں پڑھی گئیں۔

اسی زمانے کا ایک اور اہم واقعہ اقبال کی سر شیخ عبدالقادر سے ملاقات ہے جس کا ذکر شیخ صاحب نے دیباچہ "بانگِ درا" میں کیا ہے۔ شیخ صاحب اُس وقت اُردو کے سب سے بہتر رسالے "مخزن" کو مرتب کیا کرتے تھے۔ اور اقبال سب سے اچھے شاعر بن رہے تھے۔ دونوں میں یگانگت کا پیدا نہ ہونا تعجب کا سبب ہوتا یہ اَدبی دوستی، اِنگلستان میں زیادہ مستحکم ہوگئی۔ چنانچہ اقبال جب یورپ سے متاعِ علم لوٹ کر، وطن واپس آنے لگے، تو مالِ غنیمت سے اپنے وطن کی ذہنی تزئین میں شیخ صاحب کی مدد کے طلب گار ہوتے ہیں۔

اُٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا اُفقِ خاور سے
بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کر دیں

ایک فریاد ہے مانندِ سپند اپنی بساط
اسی ہنگامہ سے محفل تہ و بالا کر دیں

اہلِ محفل کو دکھا دیں اَثرِ صیقلِ عشق
سنگِ اِمروز کو آئینہ فردا کر دیں

اِس چمن کو سبق آئینِ نمو کا دیکر
قطرۂ شبنمِ بے مایہ کو دریا کر دیں

رختِ جاں بتکدۂ چیں سے اُٹھالیں اپنا
سب کو محوِ رُخِ سعدیٰ و سُلیمیٰ کر دیں

دیکھ یثرب میں ہوا ناقۂ لیلیٰ بیکار
قیس کو آرزوئے نو سے شناسا کر دیں

گرم رکھتا تھا ہمیں سردیٔ مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اُسے وقفِ تماشا کر دیں

شمع کی طرح جلیں بزم گہہ عالم میں
خود جلیں، دیدۂ اغیار کو بینا کر دیں

اِس میں اقبال کے اِس انقلاب خیال کے جراثیم موجود ہیں، جو قیام یورپ میں واقع ہوا اس کے علاوہ اُن کی آئندہ شاعری کی عمارت کا نقشہ بھی موجود ہے۔ جس سے ہم آگے مفصل بحث کریں گے۔ شیخ صاحب کی کئی خدمات میں اردو کی ایک یہ خدمت بھی نہایت مہتم بالشان ہے کہ انھوں نے ایک بھٹکے ہوئے شاعر کو رستہ پر لگا دیا۔ یورپ میں اقبال نے شاعری کو ترک کرنیکا جو ارادہ کر لیا تھا وہ شیخ صاحب ہی کی حکمت عملی سے فسخ ہو گیا۔ اقبال کی شاعری کو سمجھانے میں بھی شیخ صاحب نے یہ اِحسان کیا کہ سب سے پہلے اس کے تین نمایاں دوروں کا پتہ لگایا۔ جس پر اکثر بعد کے تنقید نگاروں کے خیالات بنی ہیں۔ اِقبال کی بعض بہترین نظمیں جیسے "ہمالہ"، "تصویر درد" وغیرہ شیخ صاحب کے رسالے "مخزن" ہی میں پہلے پہل شائع ہوئیں۔

گورنمنٹ کالج لاہور سے اِقبال نے بی، اے، اور ام، اے کے امتحانات اِمتیاز کے ساتھ کامیاب کئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں پہلے اورنٹیل کالج لاہور، اور پھر اپنی قدیم درسگاہ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ اس وقت تک اقبال کی شاعری مخصوص اداروں یا مشاعروں کی غزل خوانی سے آزاد ہو کر عام ہو گئی تھی۔ اَب نظموں کو پڑھکر سنانے کا موقع باقی نہیں رہا تھا

عوام اُن کا اِستقبال کرنے کے لئے ہر جگہ تیار رہتے تھے۔ اور یہ اخبارات اور رسائل کے ذریعہ اُن تک پہنچ جاتیں، شاعر کا مضمون مخصوص نہیں ہوتا، اس کا دل مصوری کا آلہ ہوتا ہے جس میں ہر وہ چیز منعکس ہو جاتی ہے جو اس کے سامنے آجاتی ہے۔ اس وقت ہندوستان کی غلام قوموں کے مابینی اِختلافات اور ان کی خیالی بنیادوں پر جاں توڑ کش مکش نے ہر جگہ ادھم مچا رکھا تھا۔ اِقبال بھی ہر دردمند کی طرح اِس حالت کو دیکھ دیکھ کر متاثر ہوتے اور فریاد کرتے ہیں۔ اِسی سبب سے ان کی اس دور کی شاعری میں وطن پرستی کا جز غالب ہے۔ "ہمالیہ" "صدائے درد" "تصویر درد" "نیا شوالہ" "ترانۂ ہندی" وغیرہ نے اِقبال کو حالی اور اکبر کی صف میں نمایاں جگہ دلا دی۔

۱۹۰۵ء میں اقبال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے یورپ گئے۔ جاتے ہوئے بجائے دنیوی سفارشات فراہم کرنے کے، وہ روحانی اِستعانت کے لئے حضرت محبوب الٰہی کی درگاہ پر گئے۔ مزار پر جو نظم پڑھی وہ کئی پہلو سے اہمیت رکھتی ہے۔ پہلے تو اس سے شاعر کی طبیعت کا رجحان معلوم ہوتا ہے پھر جو اِلتجا کی ہے وہ دنیوی طالبوں کی طرح عزت و ثروت یا شہرت کی نہیں بلکہ ایک اعلیٰ علمی معیار کے حصول کی ہے جو شاعر کا نصب العین تھا۔

نظر ہے ابر کرم پر درخت صحرا ہوں
کیا خدا نے نہ محتاج باغباں مجھ کو

فلک نشیں صفت مہر ہوں زمانے میں
تری دعا سے عطا ہو وہ نردباں مجھ کو

مقام ہم سفروں سے ہو اس قدر آگے
کہ سمجھے منزل مقصود کارواں مجھ کو

مری زبانِ قلم سے کسی کا دل نہ دُکھے
کسی سے شکوہ نہ ہو زیر آسماں مجھ کو

یورپ میں اقبال نے اِسی نصب العین کے حاصل کرنے کی سعی کی۔ اُنہیں جو بچپن سے عربی، فارسی اور پھر فلسفہ کا شوق تھا۔ تحقیقات بھی کی تو اُنہیں سے متعلق۔ ڈاکٹری کے لئے "ایران او رمابعد الطبیعات" پر مقالہ لکھا۔ لندن سے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا۔ باقی وقت ان کا مشرقی اور مغربی زبانوں کے شاہکاروں کے مطالعہ میں صرف ہوا۔ جن میں فلسفہ کی حد تک شوپن ہار۔ ہیگل۔ کانٹ۔ برگساں۔ لاک اور شاعری میں شکسپیر، بائرن براؤننگ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

یورپ کے قیام میں اقبال کی ملاقات بعض ایسے علماء سے ہو گئی جنکی دنیا میں کافی شہرت ہے۔ یہ پروفیسر براؤن، آنجہانی، ڈاکٹر نکلسن وغیرہ ہیں۔ ان میں بعض کی دوستی کو اقبال کی حیات کے ساتھ خاص تعلق ہے۔ ڈاکٹر نکلسن اُن کی شاعرانہ قابلیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ جب اقبال نے اپنی شہرۂ آفاق نظم "اِسرارِ خودی" لکھی تو ڈاکٹر نے اس کا انگریزی میں ترجمہ کر کے تعلیقات کے ساتھ اس کو شایع کیا اِس ترجمہ نے دراصل اقبال کو انگریزی اور دوسرے مغربی علما کے وسیع تر حلقوں سے روشناس کیا یورپ ہی میں اقبال کی فارسی شاعری کی ابتداء اور شہرت ہوئی۔ اس کی ابتداء کا واقعہ سر شیخ عبد القادر نے اپنے مقدمہ "بانگ درا" میں بیان کیا ہے (ص ۹) پہلی ہی غزلیں لکھنے کے بعد اقبال کو معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت فارسی شعر گوئی میں بھی ویسی ہی رواں ہے، جیسی اُردو میں تھی۔ یہ ایک انکشاف تھا، جس سے اقبال نے بے حد فائدہ اُٹھایا۔ اُن کی بہترین شاعری فارسی میں ہے۔ اُردو میں اس کے فطری حدود

کے لحاظ سے اُن کی شاعری ہندی اور ہندوستانی تھی لیکن فارسی شاعری کا مخاطب تمام عالم اسلامی ہوگیا۔ فارسی شاعری میں اس وسعت کا پیدا ہونا ایک فطری امر تھا۔

یورپ ہی کے قیام سے متعلق ایک اہم بات اور رہ گئی ہے۔ یہاں رہ کر اقبال نے جس طرح علمی خزانوں کو ٹٹولا اسی طرح ذہنیتوں اور معاشرہ کا بھی بغور مطالعہ کیا جو انقلاب ان مشاہدات سے ان کے نقطۂ نظر میں پیدا ہوا۔ وہ ان کی فارسی سے کم مگر اُردو شاعری میں بے حد نمایاں ہے۔ کیونکہ فارسی شاعری دراصل یورپ کے بعد شروع ہوئی۔ لیکن یورپ جانے سے پہلے کی اُردو شاعری، بعد کی شاعری کے لئے موازنہ کا کام دیتی ہے۔

پروفیسر آرنلڈ ہندوستان سے جانے کے بعد لندن یونیورسٹی میں عربی کے معلم مقرر ہو گئے تھے اتفاق سے جن دنوں اقبال یورپ میں مقیم تھے، پروفیسر صاحب کو کسی مجبوری کی وجہ سے رخصت لینی پڑی تھی۔ اُن کے غیاب میں اقبال ان کا کام انجام دیتے رہے۔ یہ ایک ہندوستانی کے لئے، اس کی قابلیت کا قابل فخر اعتراف ہے۔

۱۹۰۸ء میں اقبال ولایت سے وطن واپس ہوئے۔ اور تھوڑے عرصہ کے بعد گورنمنٹ کالج کی ملازمت کو ترک کر کے وکالت شروع کر دی! اقبال کی شاعری کا یہی بہترین اور پختہ کارانہ دور ہے۔ یہ دور شاعری کی کیفیت اور کمیت دونو لحاظ سے بے حد اہم اور درحقیقت پہلی شاعری کا منتہا ہے۔

ہم نے اوپر کہیں اس کا ذکر کیا ہے کہ سب سے پہلے سر شیخ عبدالقادر نے اقبال کی شاعری کے تین دوروں کا پتہ لگایا۔ پہلا دور ابتدائی مشق سے لیکر ۱۹۰۵ء میں اقبال کے یورپ جانے تک ہے۔ دوسرا دور قیام یورپ کا اور

تیسرا ۱۹۰۸ء میں وطن لوٹنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ شاعر کے کلام اور اس کی ذہنیت کا ارتقاء معلوم کرنے کے لئے خاص خاص زمانوں میں شاعر کے میلانات کا پتہ لگانا ضروری ہے خصوصاً وہ شاعر جو اپنے عہد کی پیداوار ہو۔ اقبال کی شاعری میں ان تینوں زمانوں کا فرق اس قدر نمایاں ہے کہ وہ نقاد جو ان کی حیات، ماحول اور ان کی طبیعت پر ان کے اثرات سے ناواقف ہو شاید ان کی بعد کی یا پہلی نظموں کو ان کے نام سے منسوب کرنے میں پس و پیش کرے۔ بعض حالات میں ان کا نقطہ نظر اِس قدر بدل گیا ہے کہ پہلے سے متضاد معلوم ہوتا ہے۔

پچھلے صفحات میں اقبال کی حیات کے ان تمام اہم پہلوؤں پر ہم نے کافی روشنی ڈالی ہے، جن سے ان کی شاعری مختلف اوقات میں متاثر رہی ہمیں اُمید ہے کہ ان امور کی مدد سے ان کی شاعری کی اسپرٹ کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

اگلے اور پچھلے تمام شاعروں کی طرح اقبال کو بھی نمود حاصل کرنے سے پہلے شاعر سازی کے کارخانے سے بھی گزرنا پڑا۔ متقدمین کی طرح اقبال کی ابتداء بھی غزل کی شاعری سے ہوئی۔ انہیں قدیم استادان فن کی شاگردی بھی کرنی پڑی جس کی تفصیلات پیچھے گزر چکی ہیں۔ اقبال نے قدیم شاعری کی مشق سے اتنا ہی فائدہ اُٹھایا جتنا کسی پہلے اساتذہ سخن نے اُٹھایا تھا۔ لاہور میں انہیں ارشد گورگانی سے بہتر شاعر نہیں مل سکتا تھا۔ اقبال نے اُن سے تلمذ حاصل کیا۔ پھر جب نظر اور وسیع ہوئی۔ تو داغ جیسے استاد فن کو غزل دکھائی اس طرز سے بھی سیری ہو گئی تو پھر وہ غالب کی شاعری سے اِستفادہ کرنے میں مصروف ہو گئے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان تینوں اساتذہ سے اِستفادہ کرنے کے بعد بھی

اقبال نے ایک سچے شاعر اور متلاشی حقیقت کی طرح، دنیا کے دوسرے بڑے بڑے شاعروں کے کلام سے الہام حاصل کیا۔ جو کچھ سیکھا تھا اس پر قانع ہونے کی بجائے اُنھوں نے اپنی اپچ سے کام لیکر، قدما کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ کیا۔ غزل کی شاعری میں جب یہ پختہ کار ہو گئے تو مغربی شعراء کے کلام سے بہترین خیالات اور بہترین اسالیب کو اُنھوں نے اپنا نمونہ بنایا۔ بڑھنے والی اقوام کے افراد کا یہی اُصول رہا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اقبال کی غزل کی شاعری کا بڑا حصہ ہماری نظر کے سامنے نہیں ہے۔ اور جو کچھ باقی رہ گیا ہے، وہ بھی صرف ان کے نام کی نسبت کی وجہ سے پڑھا جاتا ہے۔ غرض اس باقیات الصالحات کے متعلق جو بھی کہا جا سکے سب صحیح ہے۔ لیکن اس کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں۔ اس سے غزل کی صنف پر ان کی قدرت کا پتہ چلتا ہے جہاں داغ کی پیروی کی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ داغ کی روح کو اپنے جسم میں داخل کر لیا ہے۔ وہی سادگی، وہی شگفتگی اور وہی زبان کا چٹخارا ہے جو داغ کے کلام کی خصوصیت ہے۔ بعد میں جب غالب کے کلام نے ان پر تسلط جمایا تو یہ غالب ہی کے رنگ میں کہنے لگے تھے۔ اگر یہی مشق سخن جاری رہتی تو ہمیں توقع ہے کہ اُردو میں ایک دوسرا غالب پیدا ہو جاتا۔ داغ کی شاعری سے زبان کی روانی اور سلاست سیکھنے کے بعد غالب کی سنگین فکر کے تتبع نے اُنہیں ایک مکمل غزل گو شاعر بنا دیا تھا۔ یہ ابتدائی مرحلے، آئندہ شاعری کا پیش خیمہ ہیں۔

اساتذہ فن کی شاگردی سے نکل کر شاعر نے جب اپنے اطراف پر نظر ڈالی تو اس کے سامنے آزاد، حالی، شبلی، اور اسمٰعیل کی شاعری کے نمونے موجود تھے۔ اقبال کے پاس ان کا مطالعہ یہ معنی تو رکھ نہیں سکتا تھا۔

کہ آنکھ بند کر کے اسی روش پر گامزنی شروع کر دی جائے۔ اُن کے مطالعہ کے ساتھ ہی اُن کے خیالات اور مطمحِ نظر کی طرف توجہ کا منعطف ہونا ضروری تھا۔ فطرتاً اقبال بھی حالیؔ اور اکبرؔ کی قومی اور معاشرتی فضا میں چلنے پھرنے لگے۔ ہر نوعمر انگریزی خواں کی طرح وطن اور قوم کی محبت کے جذبات اُن کے دل میں بھی اُبھرنے لگے ہندوستانیوں کی جو حرکت ان کو ناگوار معلوم ہوتی وہ اس کا اظہار کر دیتے تھے۔ عوام کے افعال میں مستقبل کا خیال بہت کم رہتا ہے۔ حالیؔ کی طرح قوم کی غلطیوں سے اقبال بھی اسے مطلع کر دیتے تھے چنانچہ فرقہ وارانہ مناقشات پر ان کا جی جلتا تھا۔

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیطِ آبِ گنگا تو مجھے

سرزمیں اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو اک قربِ فراق آمیز ہے

بدلے یک رنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب

لذتِ قربِ حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاطِ موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو
کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

وطن کی فکر کر ناداں قیامت آنیوالی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

ذرا دیکھ اس کو جو کچھ ہو رہا ہے ہونے والا ہے
دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو!
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

وطنی نظمیں اقبال کی اس قدر مقبول ہوئیں کہ بچے بچے کی زبان پر چڑھی ہوئی ہیں۔ خصوصاً وہ نظم جس کا عنوان "ہندوستان ہمارا ہے"، "صدائے درد" "ہمالہ" "تصویر درد" وغیرہ میں بھی وطنیت کا احساس شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

اِن نظموں کے علاوہ اقبال کی ابتدائی شاعری کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو مغربی شعرا جیسے ٹینی سن، امرسن، گوئٹے وغیرہ کے کلام سے ماخوذ ہے یہ درحقیقت اقبال کی موضوعی نظموں کا اولین نقش ہیں۔ اس دور کے اکثر شعرا جنھوں نے مغربی نظموں کے مقابلہ میں نظمیں لکھنے کی کوشش کی ہے وہ پہلے پہل مغربی شعراء کے کلام کو نمونہ بناتے رہے ہیں۔ ماخوذ خیالات میں اقبال نے عموماً ایسی فلسفیانہ نظمیں اِنتخاب کی ہیں، جو اردو میں آنے کے بعد اس کا ایک جز معلوم ہونے لگی ہیں۔ یہ تقلید کی بڑی کامیابی ہے۔ ایسی نظمیں اقبال نے عموماً بچوں کے لئے لکھی ہیں۔ لیکن وہ اردو ادب میں ایک اِضافہ ہیں۔

فطرت کی عکاسی اور قلبی جذبات کے اظہار کے حقیقی اَسالیب اُردو میں میر حسن، میر انیس، اور نظیر اکبرآبادی کے زمانہ سے پیدا ہو چکے تھے لیکن اس نقطہ نظر سے ان شعراء کے کلام کو حالی سے پہلے بہت کم اہمیت دی گئی، آزاد اور حالی نے جب شاعری کا رُخ بدل دیا، تو فطرت نگاری

کی اہمیت خواص وعوام پر روشن ہوئی۔ اسمٰعیل میرٹھی نے اردو شاعری کے اس خاص پہلو کو حد کمال تک پہنچا دیا۔ اقبال کی شاعری جب شروع ہوئی تو لوگوں کی توجہ قدیم طرز کی شاعری سے ہٹ کر، اسی طرح کی فطری شاعری پر جم گئی تھی۔ گو تنوع کے نہ ہونے سے یہ میدان اس وقت تک صرف حالی اور اسمٰعیل میرٹھی کی شاعری پر محدود تھا لیکن اقبال کی فطری نظموں نے نہ صرف اس میدان کو وسیع کیا، بلکہ آئندہ شعراء کے لئے بے شمار راستے کھول دیئے "ہمالہ" "گل رنگیں" "ابر کہسار" "آفتاب صبح" "پیام صبح" "چاند" "صبح کا ستارہ" وغیرہ۔ اقبال کی منظر نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ اسی طرح جذبات کا صحیح مگر شاعرانہ اظہار جس طرح "مرزا غالب" "داغ" "تصویر درد" کنار روائی میں کیا گیا ہے، ان سے پہلے کی اُردو نظموں میں شاید ہی مل سکے خود حالی کی نظمیں اس حیثیت سے بہت معمولی ہیں۔ اسمٰعیل کی منظر نگاری میں اقبال سے زیادہ گھلاوٹ اور سلاست ہے۔ گو ان میں اقبال کی سی گہرائی نہیں ہے۔

ان تمام خصوصیات کے علاوہ ابتدائی نظموں میں اقبال کا شخصی عنصر اور ذاتی خیالات کی جھلک بھی بے حد موثر ہے۔ فکر عمیق کے آثار اقبال کی چھوٹی سی چھوٹی اور سطحی سے سطحی نظم میں صاف ظاہر ہیں۔ اقبال نہ صرف فلسفہ کے متعلم ہیں بلکہ اچھے مفکر بھی ہیں۔

اقبال کے اسلوب اور اکبر الہ آبادی کے اسلوب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہ ہنسوڑ ہیں۔ اور وہ متقطع۔ لیکن اقبال کے کلام میں چند ظریفانہ نظمیں بھی ہیں۔ اُن کے ماخذ کی تلاش کے لئے اکبر کے کلام کے اثر کی طرف راہنمائی بے جا نہ ہوگی۔ کوئی وجہ نہیں کہ نو عمر اقبال اکبر کے مقبول طرز شاعری

سے کورے رہے ہوں۔ ذیل کے اقتباس کو کون اکبر کے اثر سے محفوظ خیال کرسکتا ہے۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی
ڈھونڈھ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر
وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین
پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ
دفعِ مرض کے واسطے "پِل" پیش کیجئے
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دِل پیش کیجئے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بل پیش کیجئے"

اکبر کا یہ اثر اقبال پر بہت ہی نام نہاد ہے۔ اصلی اثر وہ ہے جس سے ان کی شاعری کی اُصولی تعمیر میں مدد ملی۔ اردو شاعری کے اِرتقاء کا یہ وہ رشتہ ہے، جو میر حسن سے شروع ہوکر، انیس، نظیر، آزاد، حالی اور اسمٰعیل سے گزرتا ہوا، اقبال تک پہنچ رہا ہے۔ حالی اپنی بنیادی کوششوں میں جن شعراء کا خواب دیکھ رہے تھے، وہ درحقیقت اِقبال ہی جیسے سخن آراء ہیں۔

شاعری کا ایک پہلو تربیتی بھی ہوتا ہے۔ شاعروں کے خیالات اقوام کی درستی میں بڑا حصہ لیتے رہے ہیں۔ اس حیثیت سے قدیم اردو شاعری بہت کم اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ قوم کی کسی حالت سے تعرض نہیں کرتی۔ بعض شعراء کے کلام میں اخلاقی نکتے ملتے ہیں۔ لیکن یہ زیادہ تر تصوف کے ضمن میں ظاہر ہوئے ہیں۔ اور اس قسم کے اشعار اس قدر تھوڑے ہیں کہ اُن کا عدم اور وجود برابر ہے۔

گو آزاد جدید شاعری کے سب سے پہلے علم بردار ہیں۔ لیکن اُن کی نظمیں قومی حالت سے بے تعلق ہونے کی وجہ سے'' انہیں حالی کے مقابلہ میں عقبی زمین میں ڈال رہی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ تاریخ اُدب کے سوا شاعر کی حیثیت سے آزاد کا ذکر آئندہ نسلوں میں بالکل نہ ہو اس کے برخلاف حالی کی شاعری باوجود سیدھی سادھی ہونے کے زندہ ہے۔ اور ہمیشہ زندہ رہیگی۔ وہ قوم کی زندگی سے وابستہ ہو گئی ہے۔ اس نے نہ صرف شاعری کے بنیادی خیال میں ایک انقلاب برپا کیا، بلکہ موجودہ تعلیم اور معاشرت کے بہت سے مسائل سے وہ واصل ہے۔ اور قوم کے اخلاق، خیالات، کردار کو درست کرنے کی کوشش کرتی ہے وہ قوم کو بیدار کرتی ہے اور اس کے سامنے ایک نصب العین بھی قائم کرتی ہے۔ یا جیسے بعض وقت کہا گیا ہے۔ حالی کی شاعری کا ایک معین "پیغام" ہے۔

پھرو تم اُدھر کو جدھر کی ہوا ہو

گویا حالی ایک جدید قوم کی تعمیر کرنے والے ہیں۔ اسمٰعیل کی شاعری فروعات میں حالی سے بالکل مختلف ہے۔ لیکن اس کی اصلی اسپرٹ وہی ہے جو حالی کی شاعری کی ہے۔ بلکہ ایک جز یعنے فطرت نگاری میں وہ حالی سے

مشترک بھی ہے۔

اکبر قدامت پرست طبیعت کے انسان تھے۔ اس لئے حالی کی جدید تعمیر سے، وہ پوری ہمدردی نہیں رکھ سکتے تھے۔ وہ قوم کو غفلت سے بیدار کرنا چاہتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی اس کو مغربی تقلید کے غار میں اندھے کی طرح گرتے ہوئے دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی اپنی قدیم روایات کو برقرار رکھ کر ترقی کی راہیں اختیار کریں۔ زمانے کی ہر آن تبدیلی کے ساتھ اپنی حالت کو بدلنا انہیں پسند نہیں تھا۔

ہوس پرستوں کو کیوں یہ کد ہے ان انقلابوں کی کیا سند ہے
اگر زمانہ بدل رہا ہے۔ بدلنے ہی کو بدل رہا ہے

قومی اور وطنی جذبات سے لبریز دل اقبال جب اس اختلاف پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو انہیں قوم کی زبون حالت پر حالی کے ساتھ ماتم کرنا پڑتا ہے ابتدائی دور کی شاعری میں اقبال کے پاس یہ اثر بہت زیادہ نمایاں ہے لیکن مرض کے علاج کا اُن کے پاس کوئی معین نسخہ نہیں ہے۔ اس لحاظ سے اس دور کی شاعری کے متعلق ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اپنے اور اپنے ہم قوموں کے لئے کیا راستہ تجویز کرتے ہیں۔ اسی واسطے اس دور کی شاعری کو بعض بزرگوں نے تذبذب، تلاش اور اضطراب کی شاعری بھی کہا ہے۔ اقبال کی طبیعت کا یہ انتشار نہ صرف قومی نظموں سے ظاہر ہے، بلکہ دوسری نظمیں بھی اس سے خالی نہیں ہیں "شمع" "خفتگانِ خاک سے استفسار" "شمع اور پروانہ" وغیرہ سے یہ خصوصیت صاف ظاہر ہے حقیقت جو شاعر دنیا کی ہر چیز کی ماہیت دریافت کرنا چاہتا ہے۔ لیکن ابھی فطرت کے راز اس کی سمجھ سے بالا معلوم ہوتے ہیں

آخرش وہ پریشان ہو کر کہنے لگتا ہے۔

دنیا کی محفلوں سے اکتا گیا ہوں یا رب
کیا لطف انجمن کا جب دل ہی بجھ گیا ہو

پھر وہ خدا سے دعا کرتا ہے کہ یہ رازہائے فطرت جو اس کے لئے معمہ ہیں اس پر منکشف ہو جائیں۔

لذت سرود کی ہو چڑیوں کے چہچہوں میں
چشمے کی شورشوں میں باجا سا بج رہا ہو
گل کی کلی چٹک کر پیغام دے کسی کا
ساغر ذرا سا گویا مجھ کو جہاں نما ہو
مانوس اس قدر ہو صورت سے میری بلبل
ننھے سے دل میں اس کے کھٹکا نہ کچھ مرا ہو

بعد کے دور کی نظموں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو عشق کی تلاش تھی۔ جس کے بغیر زندگی بے لطف ہو رہی تھی۔ تنہائی میں اور مجمعے میں غرض ہر جگہ وہ اپنے آپ کو اجنبی پاتا ہے۔ اس کی زندگی کا کوئی نصب العین ابھی تک معین نہیں ہوا۔ جس کے لئے وہ بے چین ہے۔ یہ انتشار یورپ میں جانے کے بعد رفع ہو جاتا ہے اور شاعر وہیں سے آئندہ کے لئے ایک تجویز سوچ کر وطن واپس آتا ہے۔

غرض اس دور میں اقبال مجموعی حیثیت سے وطن پرست شاعر رہے۔ قومی نظموں سے ہٹ کر انھوں نے جو نظمیں اس دور میں لکھیں وہ بھی بلند پایہ ہیں۔ ان کا آئندہ اعلیٰ فلسفیانہ اور صوفیانہ کردار ان نظموں میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ "گل رنگیں" "خفتگان خاک سے استفسار"

"شمع" "ماہِ نو" "انسان اور بزم قدرت" "بچہ اور شمع" وغیرہ ایسی نظمیں ہیں جن میں شاعر نے کائنات کے اہم بالشان مسائل، جیسے حیات، حیات کے ماخذ، حیات کا مقصد، انجام حیات اور حیات بعد الموت اور عشق اور حسن وغیرہ سے بحث کی ہے ان میں سے ہر ایک کی تہ تک پہنچنے کی وہ کوشش کرتے ہیں۔ کہیں تو وہ اس عالم صغیر یعنے انسان اور اس کی قوتوں پر غور کرتے ہیں۔ کہیں وہ انسان اور بیرونی کائنات کو بالمقابل رکھ کر دونوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اُنہیں انسان کی ہنگامہ آرائی اور نیچر کی خاموش کارگزاری میں بڑا فرق نظر آتا ہے۔ جس چیز کی ماہیئت کو سمجھنے سے وہ قاصر رہ جاتے ہیں، اس کے لئے خدا سے استعانت طلب کرتے ہیں۔

یہ دور "التجائے مسافر" پر ختم ہو جاتا ہے۔ جس نظم میں شاعر نے اپنے اعلیٰ نصب العین کے حصول میں استقلال کی اس درگاہ سے دعا مانگی ہے۔

اقبال کی شاعری کا دوسرا دور قیام یورپ کا ہے۔ یورپ میں اقبال کا زمانہ بہت مصروف گزرا۔ ایک طرف تو وہ علمی سرمایہ کو سمیٹ رہے تھے۔ دوسری طرف یورپ کی معاشرت، تمدن اور سیاست پر بھی ان کی نظر جمی ہوئی تھی۔ ان کا مضمون چونکہ اسلامی فلسفہ اور خاص کر ایرانی فلسفہ تھا۔ اس لئے اُن کی طبیعت جس کو پہلے سے عربی اور فارسی سے خاص لگاؤ تھا۔ اس مضمون میں خوب منہمک ہوئی۔

یورپ میں اقبال کی شاعری کا جو زاویہ نظر بدلا اس کے بے شمار قدرتی اسباب ہیں۔ پہلے تو یہ کہ فطری لگاؤ کی وجہ سے مقالہ کے لئے جو موضوع اختیار کیا، وہ اُن کو اسلامی فلسفہ سے بخوبی روشناس کروانے والا تھا۔ دوسری اتفاقی بات یہ ہے کہ اقبال کو اپنی فارسی زبان پر قدرت کا انکشاف یہیں ہوا۔ تیسرے

انھوں نے یورپ کی معاشرت کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ اگر اس سے پہلے اُن کے خیالات یورپ کو اپنا نمونہ بنانے کے تھے تو وہ بدل گئے۔ چوتھی چیز یہ ہے کہ پہلے وہ صرف ہندوستانی اور خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کے شاعر تھے۔ ہندوستان سے باہر نکل کر انھوں نے جب تمام عالم اسلامی پر ایک عام مصیبت کو مسلط دیکھا، تو اُن کی ہمدردی وسیع تر ہوگئی۔

اسلامی فلسفہ کی تحقیق نے اقبال کو حقیقی اسلام، اس کے سادہ ترین اور مہتم بالشان اصول زندگی اس کے سطح نظر اور اگلے مسلمانوں کی عظمت سے کما حقہٗ روشناس کر دیا اگلی عظمت کے مقابلہ میں موجودہ مصیبت کو دیکھ کر ان کے ہمدردانہ جذبات میں تحریک پیدا ہوئی۔ اور انھیں یہیں سے آئندہ نظموں کا موضوع مل گیا۔ پہلے اقبال کا یہ خیال تھا کہ مسلمان وطن پرست بھی ہو سکتا ہے لیکن اب یہ خیال کمزور پڑ گیا۔ خصوصاً اس لئے بھی کہ ہندوستانیوں میں جو خیالی تفریق پیدا ہوگئی تھی، وہ دور ہوتی ہی نظر نہیں آ رہی تھی ؎

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبار راہ حجاز ہو جا

اس بے سود کام پر اپنی ہمت ضایع کرنے کو انھوں نے فضول سمجھا۔ اس کی بجائے بالواسطہ طریقوں سے مسلمانوں میں رواداری کا احساس پیدا کرنے کی کوشش شروع کی۔ کیونکہ نصیحت براہ راست ہمیشہ زبوں گوش ہوتی ہے اس کے علاوہ اس تبدیلی خیال میں یہ حکمت بھی مضمر تھی کہ جب تک قومیں کسی اعلیٰ نصب العین کے حصول میں سرگرم نہ ہوں، وہ اختلافات کے خیالات ہی کو اپنا میدان عمل سمجھتی رہتی ہیں۔

اب دقت یہ تھی کہ اردو جو ہندوستان کی زبان ہے۔ صرف ہندوستان ہی تک محدود ہے۔ بیرونی مسلمانوں تک اس کی رسائی ناممکن ہے۔ اس کا حل

اُنہیں اتفاقاً ہاتھ آگیا تھا۔ فارسی میں بھی یہ آسانی سے شعر لکھنے لگے تھے۔ اس لئے اُنھوں نے فارسی زبان کو اپنی شاعری کا ذریعہ بنالیا تاکہ مسلمانوں کا زیادہ وسیع حصہ اس کو پڑھ سکے۔ یورپ سے لوٹنے کے بعد زیادہ توجہ اقبال نے فارسی شاعری پر صرف کی گو اردو میں بھی وہ برابر لکھتے رہے۔

یورپ کی سیاسی اور معاشرتی حالت کے مشاہدے اور مطالعہ نے اقبال کو اُن کی خامیوں سے واقف کیا۔ یورپ کی سیاست جس قدر پیچیدہ ہے۔ اس سے زیادہ سقیم بھی ہے۔ پیچیدگی یہ ہے کہ ان اقوام کا جو اصول ہے اس پر ان کا عمل نہیں۔ اور جب اُصول اور عمل دونوں موجود ہوں تو ان میں صداقت نہیں۔ یورپی قومیں آزاد اپنے آپ کو اسی وقت سمجھتی ہیں جب کہ ان کا کوئی غلام ہو۔ اور وہ کسی قوم کی عزت اسی وقت کرتی ہیں، جب وہ اس سے ڈریں۔ اُن کی سیاست کی بنیاد اس پر ہے کہ جس قدر ممکن ہو، مادی اور سائنس کے وسائل سے دنیا کی دوسری قوموں کو تباہ اور برباد کر دیا جائے تاکہ ان کا بول بالا ہو۔ معاشرتی حالت میں جو اسقام ہیں اُن کا تفصیلی ذکر ایک کتاب چاہتا ہے۔ سرمایہ دار اپنے ہی ہم جنس اور ہم قوم غریبوں اور مزدوروں کا خون چوسنے کے لئے بے چین ہیں۔ ادنیٰ طبقے زندگی کی کم سے کم ضروریات کے لئے بھی دوامی کش مکش میں مبتلا ہیں۔ مگر امرا کو اپنے عیش و آرایش سے سیری ہی نہیں ہوتی، پھر اُن اقوام میں ظاہر پرستیاں ایسی ہیں کہ جن کی زندگی کے لئے قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ یورپ اپنے سائنس اور دوسرے مادّی وسائل کی مدد سے دُنیا کو خدمت کے بہانے تباہ کر رہا ہے۔

جب اقبال دنیا کی راہنما قوموں کی حالت سے مایوس ہو گئے تو انہیں مجبوراً صدرِ اسلام کی زندگی کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اسلام کے وسیع اصول

مساوات، حریت اور اخوت، اور ان پر سختی کے ساتھ عمل پیرا ہونے ہی میں اقبال کو نجات نظر آنے لگی۔ اسلام ہی کا نظام معاشرت اُن کے لئے اَب دار الامان باقی رہ گیا تھا۔ فطرةً وہ ادھر متوجہ ہو گئے۔ اُن کے دل میں مقصد حیات کا جو احساس پیدا ہو گیا تھا وہ مطمئن ہو گیا۔ کیونکہ بنی نوع انسان کی فلاح کا خیال پختہ ہو گیا۔ اَب وہ تمام عالم میں کسی کو اپنا اور غیر ہی نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ ان کا دار الامان سب کے لئے تھا۔ گویا "عشق" کی چنگاری جو اُن کے دل میں فروزاں ہوئی تھی بھڑک کر شعلہ بن گئی۔ اَب وہ تذبذب جاتا رہا۔ اور متلاشی حقیقت کو حقیقت کا پتہ لگ گیا۔

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا
بزم کو مثلِ شمعِ بزم حاصلِ سوز و ساز دے
تارے میں وہ قمر ہیں وہ جلوہ گہِ سحر ہیں وہ
چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے

یہ خیالات درحقیقت الہام ربانی سے کم نہیں ہیں۔ آگے چل کر وہ صاف طور سے بیان کرتے ہیں۔ یہ "عشق" جس کی دنیا کو ضرورت ہے یورپ کو نہیں مل سکتا۔

پیرِ مغاں فرنگ کی مے کا نشاط ہے اثر
اس میں وہ کیفِ غم نہیں مجھ کو نہ تو خانہ ساز دے
تجھ کو خبر نہیں ہے کیا؟ بزم کہن بدل گئی
اَب نہ خدا کے واسطے، اُن کو مئے مجاز دے

یہی پیامِ محبت اُنھوں نے یورپ سے علی گڈھ کالج کے طلبہ کے نام بھیجا تھا۔

اور دل کا ہے پیام اور رہبر ا پیام اور ہے
عشق کے درد مند کا طرز کلام اور ہے

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں
کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے

جذب حرم سے ہے فروغ انجمن حجاز کا
اس کا مقام اور ہے، اس کا نظام اور ہے

موت ہے عیش جاوداں ذوق طلب اگر نہ ہو
گردش آدمی ہے اور گردش جام اور ہے

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشت کلیسا ابھی

۱۹۰۷ء میں ایک غزل اقبال نے لکھی تھی۔ اس میں اپنے زاویہ نظر کی تبدیلی، اور حقیقت حال کے آشکار ہونے کی تفہیم عجب شگفتہ انداز میں کی ہے ؎

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

سنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا
سفینۂ برگ گل بنالے گا قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا کے پار ہوگا

اسی غزل میں اپنی عالم دوستی کا اظہار یوں کیا ہے۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

نظر اس قدر وسیع ہو جانے کے بعد، اقبال کے ذہن سے وطینت کا خیال بھی نکل جانا ضروری تھا۔

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملّت کی اتحاد وطن نہیں ہے
کہاں کا آنا کہاں کا جانا فریب ہے امتیاز عقبیٰ
نمود ہر شئے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے

انہیں خیالات کو انھوں نے بعد کی ایک فارسی نظم میں بھی ظاہر کیا جو "پیام مشرق" میں شایع ہوئی ہے۔

از من اے باد صبا گوئے بدانائے فرنگ
عقل تا بال کشودہ است گرفتار تر است
برق را ایں بجگر می زند آں رام کند
عشق از عقل فسوں پیشہ جگر دار تر است
کیمیائے سازہ ریگ رواںش زر گرد
بر دل سوختہ اکسیر محبت کم کرد

وائے بر سادگی ما کہ فسونش خوردیم
رہزنے بود کمیں کردہ رہ آدم زد
ہنرش خاک برآورد ز تہذیب فرنگ
باز آن خاک بہ چشم پسر مریم زد

رزم بر بزم پسندیدہ وپا ہے آراست
تیغ او جز بہ سرو سینہ یاران نہ نشست
رہزنی راکہ بنا کرد، جہاں بانی گفت
ستم خواجگئ او کمر بندہ شکست

گو اقبال مغربی تہذیب سے مایوس ہو گئے تھے۔ لیکن انھوں نے یورپ کے اکثر علما، جیسے شوپن ہار، نیٹشے، ٹالسٹائی، کارل، مارکس، ہیگل، آئین اسٹائین، بائرن، پٹوفی، آگسٹس کومٹ، گوئٹے، برگساں، لاک، کانٹ، براؤننگ، شکسپیر، وغیرہ میں سے جس کسی کی تعریف کی ہے، اس قدر دل کھول کر کی ہے کہ ان کی وسیع نظری کا اس سے پتہ چل جاتا ہے۔

اس دور میں اقبال کی ذہنیت کس قدر بلند ہو گئی تھی اس کا ثبوت پہلی ہی نظم سے ملتا ہے جس کا عنوان "محبت" ہے یہ نظم محبت کے اجزائے ترکیبی سے آگاہی حاصل ہونے یا دوسرے الفاظ میں عشق کی حقیقی ماہیت کے دل پر القا ہونے کے بعد لکھی گئی ہے۔ حقیقت حسن کو بھی وہ اب سمجھ جاتے ہیں

ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی
وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی

اِن حقایق کے اِنکشاف کے بعد وہ دنیا کو اپنا پیام سُناتے ہیں۔

عشق نے کر دیا تجھے ذوقِ تپش سے آشنا،
بزم کو مثلِ شمعِ بزم حاصلِ سوز و ساز دے
شانِ کرم پہ ہے مدار عشقِ گرہ کشائے کی
دیر و حرم کی قید کیا، جس کو وہ بے نیاز دے!
صورتِ شمع نور کی ملتی نہیں قبا اُسے
جس کو خدا نہ دہر میں گریۂ جاں گداز دے
تارے میں وہ قمر میں وہ جلوہ گہِ سحر میں وہ
چشمِ نظارہ میں نہ تو سرمۂ امتیاز دے
عشقِ بلند بال ہے رسم و رہِ نیاز سے
حسن ہے مستِ ناز اگر تو بھی جوابِ ناز دے

اِس نظم سے اور ذیل کی نظم سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی سعی کا محور بدل گیا۔ لیکن ان کا مذہب وہی باقی رہا جو پہلے تھا یا اگر بدلا تو رنگ و بو کے امتیاز یا مسالک و عقاید کے اختلاف پر مبنی نہیں بلکہ یہ مذہب بسیط عشق ہے۔ مذہب یا عقائد کے لحاظ سے وہ کسی کے دوست ہیں نہ دشمن عقائد میں وہ صوفی ہیں۔ اور نظام معاشرت میں مسلمان۔

شانِ کرم پہ ہے مدار عشقِ گرہ کشائے کی
دیر و حرم کی قید کیا، جس کو وہ بے نیاز دے

اسی خیال کو "سوامی رام تیرتھ" کے عنوان کی نظم میں اس طرح ادا کیا ہے۔

نفیِ ہستی اِک کرشمہ ہے دلِ آگاہ کا
لَا کے دریا میں نہاں موتی ہے اِلَّا اللہ کا

توڑ دیتا ہے بُت ہستی کو ابراہیم عشق
ہوش کا دارو ہے گویا مستیٔ تسنیم عشق

اُن کی حقیقت شناس نظر نے یورپ سے بھی کئی مفید باتیں اخذ کیں اُن میں سب سے نمایاں "پیغام عمل" ہے جو یورپی اقوام کا بڑا سرمایہ اِمتیاز ہے اس کی تلقین ہر جگہ فارسی اور اردو شاعری میں کرتے ہیں۔

مرا صاحبدلے این نکتہ آموخت
زمنزل جادہ، پیچیدہ خوشتر

ہمائے علم تا افتد بدامت
یقین کم کن، گرفتار شکے باش
عمل خواہی؟ یقین را پختہ ترکن
یکے جوئے و یکے بین و یکے باش

پختہ تر ہے گردش پیہم سے جام زندگی
ہے یہی اے بیخبر رازِ دوامِ زندگی
اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیرِ کن فکان ہے زندگی

یورپ سے نکلتے ہوئے اِقبال نے جو معرکتہ الآرا نظم "سر شیخ عبدالقادر کے نام" لکھی ہے۔ وہ گویا اس دور کی شاعری کا لب لباب اور آئندہ دور کی شاعری کا پیش نامہ ہے اس نظم کے لب ولہجہ کی بلندی کو دیکھ کر گرامی کا یہ شعر یاد آجاتا ہے۔

در دیدہ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نہ تواں گفت

اقبال کی شاعری کا آخری دور ۱۹۰۸ء کے بعد کا ہے اسی سنہ میں وہ ہندوستان واپس ہوئے یہ دور درحقیقت اقبال کی شاعری کا زرین دور ہے اس دور کی شاعری نے اقبال کے لئے دنیا کے لازوال شعرار کے زمرہ میں جگہ نکال لی ہے اور اس دور کی شاعری ہی اقبال کی زندگی کا ماحصل۔ اور ان کی شعری کوششوں کا منتہا ہے۔

اس دور کی شاعری کی تمہید بہت تھوڑی ہے۔ کیونکہ اس کا بیشتر حصہ دوسرے دور کے ضمن میں گزر چکا ہے۔

اقبال نے یورپ میں جو پلان شاعری کا پیدا کیا تھا، اب وہ عملی صورت اختیار کرنے لگا اُن کی ہمدردی کائنات کے ہر اس ذرہ کے ساتھ تھی جو مصیبت میں ہو۔

من درین خاک کہن گوہر جاں می بینم
چشم ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم
دانہ را کہ بآغوش زمین است ہنوز
شاخ در شاخ و برومند و جواں می بینم (پیام مشرق)

ان کا مذہب اور مسلک صوفیانہ یعنے عشق و محبت تھا۔ ایسا عشق کہ جو کائنات کے ہر ذرہ کے ساتھ ہو، ہر ذی حیات کے ساتھ ہو، ہر فرد بشر کے ساتھ ہو، اور حسن و حیات کے مخرج کے ساتھ ہو۔ اسی لئے اس دور کی شاعری میں "عشق" کی تلقین بڑے شد و مد کے ساتھ کی ہے۔ عشق ہی اُن کو دونوں عالم کا حکمران نظر آتا ہے۔ کائنات کے ہر ذرّہ کو دوسرے ذرّے

کے ساتھ عشق ہے۔ اس لئے ایسی حیات کو وہ بدتر از موت تصور کرتے ہیں جس میں عشق کی جھلک نہ ہو۔ پھر جس طرح قدیم شعرائے اردو نے عشق کے ساتھ وحشت یعنے حرکت کو ضروری سمجھا تھا یہ بھی حرکت یعنے عمل کو ضروری تصور کرتے ہیں۔ عشق تو ایک مذہب ہے اور اس کے ارکان عمل کے ذریعہ ظاہر ہوتے ہیں۔ یہ آخری ترمیم گویا اقبال کا اپنا اضافہ ہے۔

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکوں
کہتا تھا مور ناتواں لطف خرام اور ہے

راز حیات پوچھ لے خضر خجستہ گام سے
زندہ ہر ایک چیز ہے کوشش ناتمام سے

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈھنے والے کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

عمل کا میدان وہ صدر اسلام کے اصول کو بتلائے ہیں۔ شاعر کے عقیدے میں یہی دنیا کی موجودہ کش مکش کا حل ہو سکتا ہے۔ اور یہی دنیا کے لئے دار الامان بن سکتا ہے۔

خضر کا پیغام کیا ہے؟ یہ پیام کائنات

نسل، قومیت، کلیسا، سلطنت تہذیب و رنگ
خواجگی نے خوب چن چن کر بنائے مسکرات

کٹ مرا نادان خیالی دیوتاؤں کے لئے
سکر کی لذت میں تو لٹوا گیا نقد حیات

اُٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی دستور ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

کرمک ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی فطرت کی تجلی زار میں آباد ہو

اس آخری دور میں اقبال کی اردو شاعری فارسی شاعری کے مقابلے مدھم پڑ گئی تاہم اردو شاعری فارسی شاعری کا تتمہ رہی۔ فارسی شاعری کی پوری اسپرٹ اس میں موجود ہے۔ فارسی شاعری کے آغاز اور اس کی طرف زیادہ تر توجہ کے اسباب ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ لیکن ایک چیز جو یہاں خاص طور پہ قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ اقبال نے ایرانی فلسفہ کی جو تحقیقات کی تھیں اس سے انہیں بڑی مدد آئندہ فارسی شاعری میں ملی۔ اپنے مضمون کے لئے انہیں یوں تو سارے مسلمان فلسفیوں کے کارنامے پڑھنے پڑے لیکن وہ مولانا روم سے بے حد متاثر ہوئے۔ اقبال کے آخری کلام پر مولانا روم کے فلسفہ ہی کا اثر ہے حقیقت یہ ہے کہ اقبال کی ذہنیت کو معراج کمال پر پہنچانے والا رومی ہی کا کلام ہے۔ جو "مثنوی معنوی" اور "دیوان شمس تبریز" جیسی دو بے حد ضخیم کتابوں پر مشتمل ہے۔ اقبال کا تصوف ان کی نظر افروزی، وسعت جذبات، حیات کے رازوں سے آگاہی، کائنات کے ساتھ اُنس و محبت اور عشق، غرض پوری شاعری کا ڈھانچہ وہ بڑی حد تک حضرت رومی ہی کا ممنون احسان ہے۔ اقبال نے خود اس کا جابجا اعتراف کیا ہے۔

"می کشودم شبے نباخنِ فکر
عقدہائے حکیم المانی
آنکہ اندیشہ اُش برہنہ نمود
ابدی رازِ کسوت آنی
بیش عرض خیال او گیتی
مجل آمد زتنگ دامانی
چوں بدریائے او فرو رفتم
کشتیِ عقل گشت طوفانی
خواب بر من دمید افسونے
چشم بستم زیاتی و فانی
نگہہ شوق تیز تر گردید
چہرہ بنمود پیر یزدانی
آفتابے کہ از تجمل او
افق روم و شام نورانی
شعلہ اُش در جہان تیرہ نہاد
بہ بیابان چراغ رہبانی
معنی از حرف او ہمی روید
صفتِ لالہ ہائے نعمانی
گفت با من چہ خفتہ برخیز
بہ سرابے سفینہ رانی

زخرد راہ عشق می پوئی
بہ چراغ آفتاب می جوئی (جلالؔ ہکل)

عشق است کہ در جانت ہر کیفیت انگیزد
از تاب و تب رومی تا حیرت فارابی
مُرشد رومی حکیم پاک زات
سرِّ مرگ و زندگی بر ما کشاد (پیام مشرق)

اقبال پر رومی کا اِس قدر زبردست اثر تھا کہ اُنھوں نے اپنی مثنوی "اِسرار خودی" اور "رموز بے خودی" کی بنیاد ہی "مثنوی معنوی کی طرز پر رکھی ہے۔ دونوں مثنویوں کی بحر وہی ہے اور اسلوب وہی آغاز بھی مثنوی ہی کے اشعار سے ہوتا ہے۔ مولانا روم کا اثر اقبال پر بہت قدیم ہے چنانچہ پہلے دور کی نظموں میں بھی اس اثر کا سُراغ مِلتا ہے۔

پنہاں درون سینہ کہیں راز ہو ترا
اشک جگر گداز نہ غمّاز ہو ترا
گویا زبان شاعرِ رنگیں بیاں نہ ہو
آواز "نے" میں شکوۂ فرقت نہاں نہ ہو
میری مانند تو بھی اِک برگ ریاض طور ہے
میں چمن سے دور ہوں تو بھی چمن سے دور ہے

"نے" "شکوۂ فرقت برگ ریاض طور" اور "چمن" اِسی "نیستان" کی طرف اِشارہ ہے، جو مثنوی معنوی کے پہلے ہی شعر میں ہے۔
نہ صرف یہ بلکہ اقبال کا مہتم بالشان فلسفہ "خودی" بھی مولانا ہی سے

متاثر ہے صوفی عقاید کے بموجب جب انسان اپنی حقیقت سے واقف ہو جاتا ہے یا اپنی ہستی کو مٹا دیتا ہے تو دونوں صورتوں میں اس کی قوت لامحدود ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں کائنات پر حکومت کرنا بھی اس کے لئے ایک معمولی بات ہے۔ لیکن اس خودی کے احساس سے اقبال نے جو کام لیا ہے وہ ان کا اپنا قابل قدر کارنامہ ہے۔ جس کا تعلق بڑی حد تک ہماری موجودہ حالت اور ضرورت سے ہے۔

اقبال نے اب تک جس قدر فارسی نظمیں لکھی ہیں وہ چار کتابوں کی صورت میں شایع ہوئی ہیں۔ (۱) زبور عجم۔ (۲) اسرار خودی (۳) رموز بے خودی۔ (۴) پیام مشرق ان میں سے آخری تین بے حد اہم ہیں۔ پیام مشرق میں ایک طویل نظم کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی متفرق نظمیں بھی شامل ہیں۔ یہ سب نظمیں بلند پایہ ہیں "پیام مشرق" کے ذریعہ اقبال نے مغرب کے لئے مشرق کا تحفہ بھیجا ہے۔ یہ المانوی شاعر گوئٹے کے دیوان کا جواب ہے، جو مغربی دیوان کے نام سے شایع ہوا تھا۔

"رموز بے خودی" میں ملت اسلامی کے ارکان سے بحث کی ہے۔ لیکن "اسرار خودی" محکوم اقوام کے لئے بڑی اہم نظم ہے۔ بظاہر یہ متصوفانہ معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں، یہ محکوم اقوام کی اصلاح ذہنیت کا بڑا آلہ ہے۔ اس میں حاکم اور محکوم ذہنیتوں کا فرق بڑی حکیمانہ قابلیت سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کا اصلی مقصد اس پستی کو دور کرنا ہے، جو محکوم اقوام کے معاملے کی وجہ سے ان کی ذہنیتوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ نظم اقبال کی اکثر نظموں کی طرح بے حد اور بجنل خیالات پر مشتمل ہے۔

اس دور کی اردو نظموں میں چار یا پانچ بڑی اور باقی چھوٹی نظمیں ہیں

ان میں اکثر نظموں کا تعلق مسلمانوں کی موجودہ حالت سے ہے۔ تمام نظموں کو ہم ذیل کے چار عنوانات کے تحت تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) قومی اور وطنی۔ (۲) معاشرتی اور اخلاقی

(۳) حکیمانہ (۴) تاریخی

قومی اور وطنی نظموں میں بڑی اور معرکتہ الآرا نظمیں شکوہ، جواب شکوہ، خضر راہ، اور طلوع اسلام ہیں۔ ان کے علاوہ کئی مختصر نظمیں جیسے "ترانۂ ملی" "وطنیت" خطاب بہ نوجوانان اسلام " "مسلم" خاص طور سے توجہ طلب ہیں۔ ان کے متعلق کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے۔ ہر نظم قومی جذبہ میں حقیقی معنوں میں ڈوبی ہوئی ہے۔ پھر جن الفاظ سے قوم کو جگانے کی کوشش کی گئی ہے اعجاز معلوم ہوتا ہے۔ "ترانۂ ملی" اور وطنیت دور اول کی اسی موضوع کی نظموں کی توسیع یا ترمیم ہے پہلے دور میں اقبال نے کہا تھا ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اب اس میں یہ ترمیم کی کہ :-

چین و عرب ہمارا۔ ہندوستاں ہمارا مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اس اختلاف کی توجیہہ وہ خود اس طرح کرتے ہیں۔

تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

نیز " بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے"

"شکوہ" "جواب شکوہ" "خضر راہ" اور "طلوع اسلام" میں سے کسی نظم کا جواب اردو میں نہیں ملتا۔ "شکوہ" اور "جواب شکوہ" میں جس شاعرانہ انداز سے مسلمانوں کی پستی کا شکوہ خدا سے کیا ہے، اور پھر ابھرنے کی جو ترکیب بتلائی ہے وہ زبان الہام کی شان رکھتی ہے۔ یہ نظمیں اقبال کی عمر بھر کی کمائی ہیں۔

معاشرتی اور اخلاقی نظموں کے تحت وہ تمام نظمیں آجاتی ہیں جو تمدن یا تعلیم پر ہیں یا کسی متعلق مضمون پر لکھی گئی ہیں۔ یہی وہ نظمیں ہیں جو بالکل اکبر الٰہ آبادی کے نقطہ نظر کو پیش کرتی ہیں اس دور کی اہم ترین نظمیں اقبال کی حکیمانہ، فلسفیانہ اور متصوفانہ نظمیں ہیں ان میں اقبال کا اصلی کردار جس قدر جھلک رہا ہے کسی اور عنوان کی نظموں میں نہیں تاریخی نظمیں اقبال کی اسی وسیع نظری کا ثبوت ہیں جن کا اوپر تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ ان میں گو اسلامی تاریخ سے متعلق نظمیں زیادہ ہیں، لیکن حقیقت میں تخصیص کسی کی نہیں۔ تاریخ کا جو اہم پہلو شاعر کو متاثر کرتا وہ اس پر خیال آرائی کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ ان میں حضرت صدیق اکبر پر ایک نظم ہے تو دوسری رامچندر جی پر ہے۔ یہ نظمیں گویا شاعر کے تاریخی تاثرات کی یادگار ہیں۔

آخر میں اقبال کی شاعری کی ادبیت کے متعلق بھی چند الفاظ ناگزیر ہیں۔ کیونکہ شاعری میں "کامل فکر" اور "تخیل" کے ساتھ ساتھ جب تک زبان پر بھی پوری قدرت حاصل نہ ہو، "حسن گویائی" پیدا نہیں ہو سکتا زبان اور خیال دونوں شعر کے لئے ویسے ہی ضروری لوازم ہیں جیسے جان کے لئے قالب۔ بلکہ شعر میں زبان کا جز اس سے زیادہ اہم ہے کیونکہ یہ ممکن ہے ایک اعلیٰ فہم اور ذکی شخص میں اس کے جسمانی حسن کا فقدان اس کی عظمت پر کوئی اثر نہ ڈالے۔ لیکن بہترین خیالات ہی کیوں ہوں جب تک وہ بہترین اسلوب میں ادا نہ کئے جائیں، ادب میں بڑا درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اسی لئے بعض نقادوں نے شعر کی یہ خوبی مقرر کی ہے "کہ بہترین خیالات بہترین الفاظ میں ادا کئے جائیں"

بعض اردو رسالوں نے اقبال کی زبان پر غیر منصفانہ تنقیدیں شایع کی تھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے رسالوں نے اقبال کے ان اشعار کو تنقید کے لئے انتخاب

کیا جن میں روزمرہ یا محاورے کے لحاظ سے کوئی خامی نظر آئی تھی بعض بزرگوں نے اقبال کی توجہ فارسی شاعری کی طرف زیادہ دیکھ کر اس کی توجیہہ یہ فرمائی کہ اردو رسائل میں اسی طرح کی مضحکہ خیز تنقیدوں نے اقبال کو اردو شاعری سے بددل کر دیا ہے۔ لیکن اقبال کی ذہنیت والے شاعر کے متعلق یہ خیال زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ہم نے پہلے ہی فارسی شاعری پر اقبال کے زیادہ ہمت صرف کرنے کا سبب بتلادیا ہے۔

اقبال کی شاعری کے اس پہلو پر غور کرتے وقت تنقید نگار کو کئی امور کا لحاظ رکھنا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ اقبال کا پورا فارسی کلام سلاست اور روانی کے ایک ہی اعلیٰ معیار پر نہ ہو اور یہ ہو نہیں ہو سکتا یا اس کے ہر شعر میں حافظ کی سی شیرینی اور سعدی کی سی سادگی اور صفائی موجود نہ ہو۔ لیکن اس سے ان کی عظمت پر کیا حرف آسکتا ہے جبکہ خود مولانا روم جیسے شاعر کا پورا کلام خوبی کے ایک ہی معیار پر نہیں ہے نہ صرف یہ بلکہ مولانا رومی کو بھی بعض جگہ محاورے اور روزمرہ کی پابندی سے ہاتھ دھونا پڑا ہے۔ اردو کلام پر اعتراضات کا بھی یہی جواب ہے۔ اردو میں میرؔ اور سوداؔ جیسے قدیم شاعروں کو چھوڑ کر جن کی ہر بات متوسطین کے لئے نمونہ تھی، انیسؔ سے لیکر حالیؔ تک بھی کسی شاعر کا کلام اعتراضات سے محفوظ نہ رہ سکا انیسؔ کے پرستار شبلی اکثر اعتراضات کو دور کرنے کے بعد بھی خامیوں کے واضح کرنے سے نہ رک سکے۔ اقبال کا کلام پھر کس طرح خطا سے پاک رہ سکتا ہے؟ ایک بڑے نقاد نے سچ کہا ہے کہ سقم ہی کسی کارنامے کے انسانی ہونے کی دلیل ہے۔

فارسی کی طرح اردو میں بھی غزل کی زبان اس قدر منجھ گئی ہے کہ کسی غزل گو شاعر کو زبان کی تمام پابندیوں کا لحاظ رکھنے میں دقت نہیں ہوتی اور جو لوگ خیال کو قربان کر کے صرف زبان کا غلام بننا اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ وہ اس

لکیر سے کسی کو ہٹتے دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔ حالانکہ تغزل کے علاوہ دوسری شاعری کا اُصول ہی جُدا ہے۔ خاص کر اس شاعر کے لئے جس کا مطمح نظر مضمون موضوع اور خیال کی اہمیت ہے، زبان کی بعض غیر اہم بندشوں کو چھوڑنا پڑتا ہے اگر شکسپیر قدیم زمانے کا شاعر تھا تو براوننگ جیسے جدید شاعر کے خیالات بھی بعض وقت زبان کی پابندیوں کو توڑ کر باہر نکل جاتے ہیں۔ انگریزی کی طرح فارسی اور اردو شاعری پر بھی ایک دور لفظی صناعی کا گزرا ہے۔ اس زمانے کے لسانی معیار کو سامنے رکھیں تو یقیناً بعد کے شاعروں کا کلام کہیں کہیں پھیکا یا سقیم نظر آئے گا۔ نقاد کو ہر معاملے میں نصب العینی ہی نہ بن جانا چاہیئے۔ بلکہ حقایق بھی اُس کے پیش نظر رہیں۔

فارسی اور اُردو دونوں میں اِقبال کا کلام ایک قابل قدر اِضافہ ہے۔ خواہ زبان کی حیثیت سے ہو یا مضامین کی۔ فارسی زبان میں اقبال نے اپنے زمانہ کی ضروریات سے متعلق بہت سی اہم اصطلاحات الفاظ اور ترکیبوں کا اِضافہ کیا اس زمانے میں جب کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران میں بھی شاعری قدما کے معیار سے بالکل مختلف اور جدید الفاظ اور ترکیبوں کا مرکب بن گئی ہے، اقبال نے قدما کے معیار زبان ہی کو ہر جگہ برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے اُن کے کلام کو پڑھ کر اکثر جگہ کسی قدیم شاعر کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔ یہی چیز ہے جو اقبال کو اپنے زمانے کا بڑا فارسی شاعر بنا رہی ہے۔

اُردو زبان کی جو خدمت اقبال کی شاعری انجام دیتی ہے، وہ فارسی سے زیادہ مہتم بالشان ہے۔ غالب کی غزلوں کو چھوڑ کر اُردو میں سوائے اقبال کے کوئی شاعر ایسا موجود نہیں ہے، جس کے کلام میں اعلیٰ خیالات بھی ہوں اور پاکیزہ زبان بھی۔ اقبال کے کلام کے مقابلے میں آزاد بلکہ خود حالی کے کلام میں بھی

شعریت اور ادبیت کم معلوم ہوتی ہے۔ اقبال کی شاعری کو میر، سودا، درد، میر حسن، میر انیس، ذوق، مرزا غالب اور داغ کے معیار سے جانچنا ہی ظلم ہے۔ اقبال کا میدان اپنا جدا ہے جس کے وہ تنہا مالک ہیں۔ انھوں نے اپنے لیے شاعری کی جو دنیا پیدا کی ہے، اس کے لوازم حسن، صرف محاورہ بندی اور روزمرہ نہیں ہیں۔ اقبال نے اردو میں جتنے نئے اور خوبصورت الفاظ تراشے ہیں جتنی ادبی ترکیبیں وضع کی ہیں، اور نفیس تشبیہوں اور استعاروں کا جس قدر ذخیرہ فراہم کر دیا ہے۔ اس کی تفصیل کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے

غلام محمد بی۔ اے
(عثمانیہ)

کلامِ اقبال کا تحلیلی مطالعہ

"خداوندان مکتب" سے اقبال کی شکایت بیجا نہ تھی[1]۔ کیا آج بھی خود اُن کے کلام کو "درس خاکبازی" کا آلہ کار بنایا نہیں جارہا ہے؟ ——— کسی کی فہم نارسا نے "ہمالہ" کے دامن میں ایک "نیا شوالہ" تعمیر کرکے "قومیت متحدہ" کے بھجن گانے کو کلام اقبال کا منشاءِ اصلی تصور کیا[2]۔ کسی کی خیرہ نگاہیں اقبال کے انقلاب کی صحیح روشنی سے فیضیاب نہ ہوسکیں اور "ثبات ایک

---

[1] ملاحظہ ہو بال جبریل ؎

شکایت ہے مجھے یارب خداوندان مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

[2] اس خیال کا اظہار نظام کالج کے استاد ادبیات اردو مولوی آغا حیدر حسن صاحب نے یوم اقبال منعقدہ ۱۳۵۲ف (بمقام زہرہ محل ٹاکیز) میں فرمایا تھا۔

تغیر کو ہے زمانہ میں ،، مراد اسی قسم کا انقلاب سمجھا جیسا کہ روس میں پیدا کیا گیا[1] غرض جتنے اِس قسم کے ،، خداوندان مکتب ،، ہیں اتنی ہی ،، خاکب زی ،، کی تاویلات بھی کی جاتی ہیں۔ اُن کے متعلق بجز اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

خرد کی تنگ دامانی سے فریاد نگہہ کی نامسلمانی سے فریاد

دنیا کے کسی بڑے مفکر کے فکر کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ ،،عمر فکری ،، بالکل ،،عمر حیوانی ،، کے مماثل ہے حیوانی عمر میں اگر لڑکپن، جوانی اور بڑھاپا پایا جاتا ہے تو عمر فکری میں بھی طفلی، شباب اور پختگی کے ادوار نمایاں نظر آتے ہیں ——— مغرب کے شاعر فطرت ورڈز ورتھ کو لیجئے اُس نے خود اپنی نظم Lines above the Tintem Abbey میں اپنی عمر فکری کی تشریح کی ہے ... ہر بڑا شاعر و مفکر ابتداء ہی سے خاص صلاحیتوں کا حامل ہوتا ہے۔ لڑکپن میں بھی ورڈز ورتھ فطرت کے حسین اور دلکش نظاروں سے محظوظ ہوتا تھا۔ لیکن یہ حظ غیر شعوری تھا اُسے پتہ نہ تھا کہ آخر خوشی کے یہ ولولے دل میں کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ پھر دور شباب آیا تو شاعر میں ایک طرح کا شعور پیدا ہوا اب وہ شاہد فطرت کی اداؤں کو سمجھنے لگا لیکن قوت اِظہار اب بھی مفقود رہی خود ہی سمجھتا اور خود ہی لطف اندوز ہوتا لیکن دوسروں کو شریک مسرت نہ کرسکتا تھا اس کے فوراً بعد پختگی کا دور آیا جس میں نہ صرف وہ فطرت کی گوناگونیوں کو سمجھنے اور انبساط حاصل کرنے لگا بلکہ فطرت کے رازہائے سربستہ کو واشگاف کرنے لگا اور دوسرے بھی اس سے

---

[1] یہ تاویل اشتراکیت کے پیرو مخدوم محی الدین صاحب ایم۔ اے عثمانیہ نے اسی جلسہ میں فرمائی تھی۔ دراصل انہی دو محرکات کا نتیجہ حسب بالا مضمون ہے۔

مزہ اٹھانے لگے۔

علامہ اقبال پر بھی اسی قسم کے ادوار گزرے ہیں ہم ان کے کلام کو اوّلاً دو شقوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) بہ لحاظِ فکر (۲) بہ لحاظِ اثراتِ ماحول ——— شق اول کو پھر تین ذیلی شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(i) دورِ استفہام۔ (ii) دورِ تجسّس (iii) دورِ پختگی ......

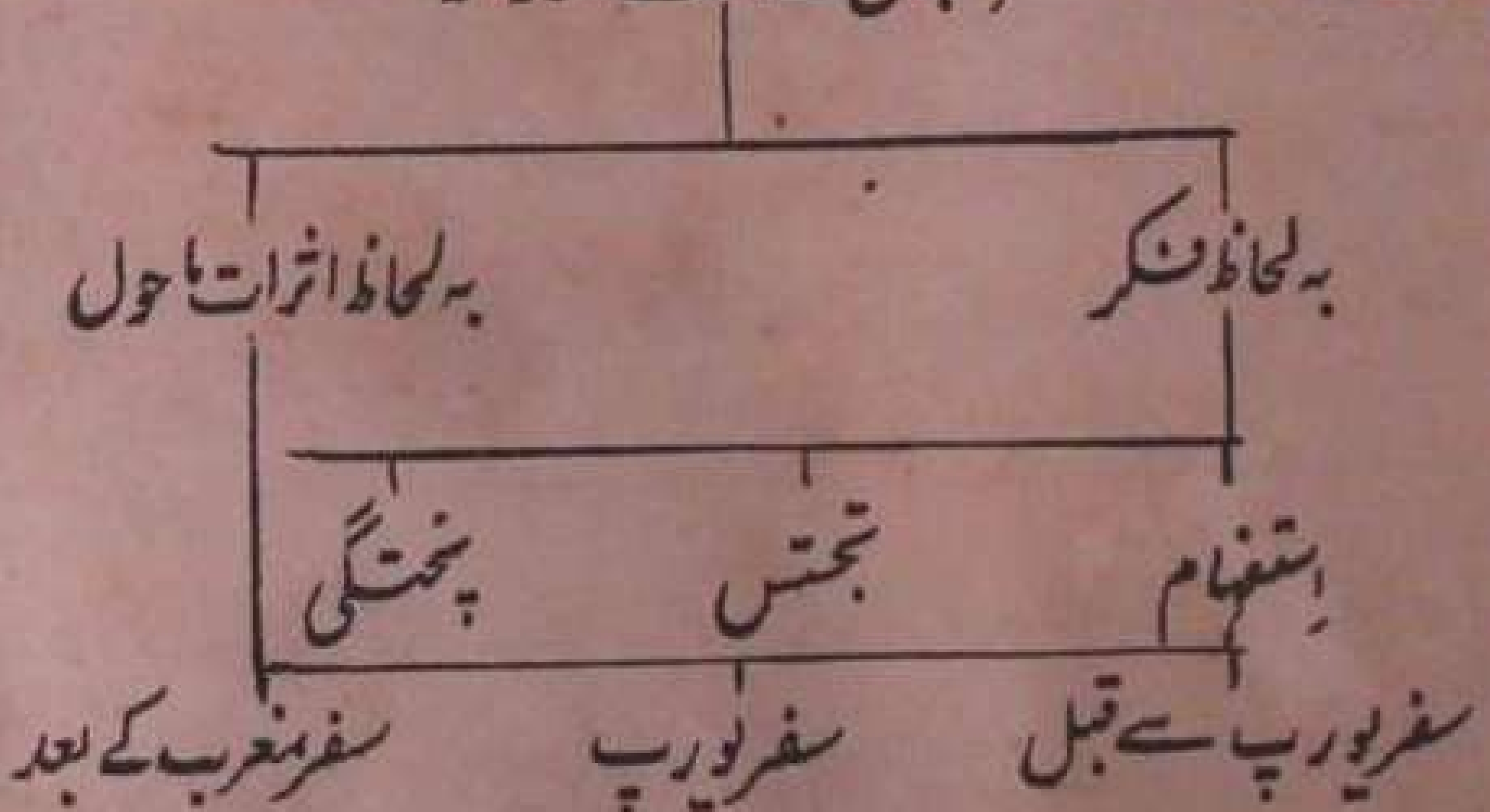
اسی طرح دوسری شق کے بھی تین ذیلی حصے ہو جاتے ہیں۔

(i) سفر یورپ سے قبل کا ہندوستانی زمانہ (ii) مغربی سیاحت کا دور (iii) سفر مغرب کے بعد کا حصۂ عمر جو ہندوستان میں گزرا ہے[1]

دَورِ استفہام فکری نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کریں تو پہلے ایک ایسا دور ملتا ہے جس میں شاعرِ مشرق، شاعرِ مغرب کی طرح فطرت کے حقائق کے سمجھنے سے عاری ہیں ابھی نہ تو شرحِ صدر ہوا ہے اور نہ ان کی نظر، "نظرِ ہوشیار" بنی ہے یہی وجہ ہے کہ ہر چیز دکھائی دیتی ہے سجھائی نہیں دیتی "گلِ رنگین" کے حسن و جمال کا نظارہ کرتے ہیں، باوجود بلبل کی بیتابی کے گل کو خاموش پاتے ہیں

---

[1]



بلبل کی حالتِ زار سے دِل بھر آتا ہے ترس کھا کے گُل سے پُوچھ اُٹھتے ہیں :-

تو شناسائے خراشِ عقدۂ مشکل نہیں
اَے گُلِ رنگیں ترے پہلو میں شاید دل نہیں

دُنیا کے مصائب و آلام پر نظر ڈالتے ہیں تو "قیدِ حیات" اور "بندِ غم" دونوں لازم و ملزوم بلکہ ایک ہی دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن جب عاقبت کا خیال آتا ہے تو عالمِ عقبیٰ کی حقیقت سمجھ میں نہیں آتی۔ آخر "خفتگانِ خاک سے اِستفسار" کرتے ہیں :-

آدمی واں بھی حصارِ غم میں ہے محصور کیا ؟
اُس ولایت میں بھی ہے اِنساں کا دِل مجبور کیا ؟

اِس جہاں میں اِک معیشت اور سو اُفتاد ہے
روح کیا اُس دیس میں اس فکر سے آزاد ہے
کیا وہاں بجلی بھی ہے، دہقاں بھی ہے خرمن بھی ہے
قافلے والے بھی ہیں اندیشۂ رہزن بھی ہے ؟

"شمع و پروانہ" پر نظر پڑتی ہے لیکن پتہ نہیں چلتا کہ آخر شمع میں وہ کونسی جاذبیت اور حسن ہے کہ پروانہ اُس پر نثار ہوا جاتا ہے شمع سے دریافت کرتے ہیں۔

"پروانہ تجھ سے کرتا ہے اَے شمع پیار کیوں ؟
یہ جانِ بیقرار ہے تجھ پر نثار کیوں ؟"

"آزارِ موت میں اُسے آرامِ جاں ہے کیا ؟ شعلے میں تیرے زندگیٔ جاوداں ہے کیا ؟"

آفاق کی حقیقت کو نہ سمجھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ انفس میں غور کریں۔ "کائناتِ صغیر" کی حقیقت کو عریاں دیکھنا چاہتے ہیں تو خود پر نظر ڈالتے ہیں لیکن سمجھ یہاں بھی کام نہیں کرتی۔

میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں
کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

کائناتِ صغیر کی اجمالی حقیقت کی فہم سے عاجز آ کر جزوی مطالعہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں "دل" کو لے کر اس پر غور کرنے لگتے ہیں۔ پروانۂ فکر کے بال و پر یہاں بھی جل جاتے ہیں۔ آخر تنگ آ کر سرچشمۂ عقل سے پوچھنے لگتے ہیں۔

"یارب اس ساغرِ لبریز کی مے کیا ہوگی؟
جادۂ ملک بقا ہے خطِ پیمانۂ دل"

غرض اس دور کا کلام پورا کا پورا استفہام سے بھرا پڑا ہے[1]۔

دورِ تجسّس اس دور سے گزر کر علامۂ موصوف ترقی کا ایک اور زینہ چڑھتے ہیں جسے میں منزلِ جستجو سے تعبیر کرتا ہوں یہاں استفہام کے بجائے تلاشِ حقیقت کی کوشش نمایاں نظر آتی ہے۔ اقبال سراپا تجسس بن جاتے ہیں سمندِ استقلال پر سوار دشت تجسس میں سرگرداں نظر آتے ہیں کبھی محمل کو پالیتے ہیں اور کبھی محض غبار راہ میں پریشان و متحیر رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ "انسان" والی نظم میں قدرت سے گلہ کرتے ہیں۔

بیتاب ہے ذوق آگہی کا — کھلتا نہیں بھید زندگی کا
حیرت آغاز و انتہا ہے — آئینے کے گھر میں اور کیا ہے

---

[1] ملاحظہ ہو ابتدائی حصہ بانگِ درا۔

لیکن باوجود اس "تحیر" کے تجسس کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور برابر فکر عمیق میں مستغرق رہے اور یہی وجہ تھی کہ حقیقت کو پالیا۔

جستجو جس گل کی تڑپاتی تھی اے بلبل مجھے
خوبیٔ قسمت سے آخر مل گیا وہ گل مجھے"

عشق کی گرمی سے شعلے بن گئے چھالے مرے
کھیلتے ہیں بجلیوں کے ساتھ اب نالے مرے

اب وہ بھانپ چکے ہیں کہ انسان "عبث" پیدا نہیں کیا گیا[1] بلکہ اس کی آفرینش کا کچھ نہ کچھ مدعا ضرور ہے ——— آفرینش انسانی کو فعل عبث نہ سمجھتے ہوئے حقیقت خلقت کی جستجو اس شعر سے بخوبی واضح ہے۔

اگر کوئی شئے نہیں ہے پنہاں تو کیوں سراپا تلاش ہوں میں
نگہ کو نظارہ کی تمنا ہے "دل کو سودا ہے جستجو کا"

اسی مسلسل اور متواتر تجسس کا نتیجہ ہے کہ اقبال حسن فطرت کو خود پر طاری کر رہے ہیں اور اس طرح اس میں کھو کر حقیقت کو بے نقاب دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جب سے آباد ترا عشق ہوا سینہ میں
نئے جوہر ہوئے پیدا مرے آئینہ میں"

دورِ پختگی

یہ دونوں ادوار کل عمر فکری کی مناسبت سے بہت مختصر رہے "تجسس" کے فوراً بعد "پختگی" کا زمانہ آیا کلام اقبال کا بیشتر حصہ اسی دور سے متعلق ہے "شاعر مغرب" کی طرح اب اقبال کی

---

[1] جیسا کہ خود قرآن مجید میں فرمایا گیا "اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا"

نظر ہوشیار بھی حقائق فطرت کو اُن کی پوری جلوہ تابیوں کے ساتھ دیکھ رہی ہے۔ ایقان کامل پیدا ہو چکا ہے، شک و شبہ کو کوئی دخل نہیں۔ اسی وجہ سے سربستہ رازوں کو پورے تیقن کے ساتھ واشگاف دیکھ رہے ہیں اور دکھا رہے ہیں۔

کھلے جاتے ہیں اسرار نہانی گیا دور حدیث لن ترانی[1]

اب حقیقت زندگی کوئی معمہ نہیں ہے اس لئے علی الرؤس کہہ رہے ہیں

چوں خبر دارم زساز زندگی با تو گویم چیست راز زندگی
غوطہ در خود صورت گوہر زدن پس زخلوت گاہ خود سر بر زدن
زیر خاکستر شرار اندوختن شعلہ گردیدن نظرہا سوختن[2]

مقصد وجود جو پہلے سجھائی نہ دیتا تھا اب نہ صرف معلوم کر چکے ہیں بلکہ دوسروں کو بتلا رہے ہیں۔

"وجود کیا ہے فقط جوہر خودی کی نمود
کر اپنی فکر کہ جوہر ہے بے نمود ترا[3]

حقیقت عشق جو دور اول میں حد فہم سے باہر تھی اب کامل طور پر فہمیدہ ہے، چنانچہ عشق اور زندگی کا باہمی تعلق اس طرح واضح فرماتے ہیں۔

"عشق در جاں چوں بچشم اندر نظر
ہم درون خانہ ہم بیرون در[4]

---

[1] بال جبریل صفحہ ۱۴۱۔

[2] ملاحظہ ہو اسرار خودی" انداز میر نجات نقشبند المعروف بہ بابائے صحرائی کہ برائے مسلمانان ہندوستان رقم فرمودہ است۔

[3] ضرب کلیم بہ" افرنگ زدہ" [4] اسرار خودی: بہ دعا"

حیات کے لئے تو عشق کو ضروری قرار دیا لیکن خود عشق کی پختگی کے لئے دو شرائط عائد کیں ——— اولاً

"عشق را از شکل "لا" آگاہ کن
آشنائے رمز "اِلا اللہ" کن"

پھر فرمایا:-

شرع محبت میں ہے عشرت منزل حرام
شورش طوفان حلال لذتِ ساحل حرام"[1]

حیات انسانی کی حقیقت، اُس کی غرض اور اُس کے ادعا کو کس خوبی سے واضح فرمایا۔

دلا رمز حیات از غنچہ دریاب ۔۔۔ حقیقت در مجازش آشکار است
ز خاک تیرہ محار دید و لیکن ۔۔۔ نگاہش بر شعاع آفتاب است[2]

اسی طرح "حیات دوام" کا صحیح مفہوم بھی بتلایا۔

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل
چیست حیات دوام سوختن نا تمام"

غرض اس دور میں تمام اسرار آشکار ہیں۔ اب فہم اقبال نہ کہیں عاجز نظر آئے گی اور نہ متحیر کیونکہ اب وہ "ہوشیار" ہو چکی ہے ——— تو خود حدیث مفصل بخواں ازیں مجمل۔

آیئے کچھ شق دوم یعنی اثراتِ ماحول کا بھی جائزہ لیں ———

---

[1] ضرب کلیم:- "علم و عشق"

[2] پیام مشرق صفحہ (۱۰۸)

ابتدائی ہندوستانی دور

مغربی سیاحت سے پہلے کا دور اقبال کی فکر و شاعری کا ابتدائی زمانہ ہے۔ اس میں ان کی نظر محدود ہے۔ اسلامی حقائق قلب میں پوری جلوہ افروزیوں کے ساتھ موجود نہیں اسی لئے کبھی "نیا شوالہ" تعمیر کر کے "قومیت متحدہ" کے گن گانے لگتے ہیں[1] تو کبھی۔

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا"[2]

کا نعرہ بلند کر کے جذبۂ وطنیت پیدا کرنا چاہتے ہیں یہی نہیں بلکہ ع

"خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے"

کی صدا بلند کر کے کٹّر وطن پرستوں کے زمرہ میں شامل ہو جاتے ہیں اسی دور کے بعض اشعار کو لے کر آج کل کے خیرہ نظر افراد اقبال کو "قوم پرست" اور "وطن پرست" ثابت کرنے کی سعیٔ عبث کرتے ہیں اور آئندہ ان بتوں پر جو ضرب لگائی گئی اس پر نظر دوڑانا گوارا نہیں کرتے وجہ صرف یہ ہے کہ حقیقت کے متلاشی نہیں بلکہ پرستار نفس بنے ہوئے ہیں۔

مغربی سیاحت

غرض اس کے بعد جب حضرت اقبال رحؒ کو مغربی سیاحت کا موقع ملا تو وسعتِ مشاہدہ سے وسعتِ نظر بھی پیدا ہو گئی اسلامی تہذیب و تمدن کا مغربی کلچر سے مقابلہ کیا ہر شئے کو بنظر غائر دیکھا اور ہر چیز کا گہرا مطالعہ کیا ——— وہاں کی ہر "تعمیر" میں بجز "تخریب" کے کچھ

---

[1] بانگ درا: "نیا شوالہ"

[2] بانگ درا: "ترانہ ہندی"

نہ دکھائی دیا۔ حقیقت شناس مردِ خدا کہہ اُٹھا۔

"دیارِ مغرب کے بسنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے

کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہی زرِ کم عیار ہوگا

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی

جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

مغربی جنس کو جب اس جوہری نے اسلام کی کسوٹی پر پرکھا تو اسکی ظاہری نظر فریبی حقیقت کو روپوش نہ کر سکی اور جوہری پکار اُٹھا۔

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب

کہ اس کی مدنیت رہ سکی نہ عفیف [1]

فرنگی مدنیت جو سطحی نظروں کے لئے بڑی "فاتحانہ" دکھائی دیتی ہے نظرِ ہوشیار کے آگے اُس کی شکست اِس طرح عریاں ہے۔

بیکاری و عریانی و میخواری و افلاس

کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

بہرکیف مغربی ماحول کے اثرات جو موصوف کے قلب و دماغ پر مترتب ہوئے اُن کا اِجمالی خاکہ ان اشعار سے بخوبی ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

"جلوۂ او بے کلیم و شعلۂ او بے خلیل

عقلِ ناپروا متاعِ عشق را غارت گر است

در ہوایش گرمیِ یک آہ بیتابانہ نیست

رندِ ایں میخانہ را یک لغزشِ مستانہ نیست [2]

---

[1] ضربِ کلیم: "مغربی تہذیب"   [2] بالِ جبریل صفحہ (۱۴۶)

آخری زمانہ اس سفر سے جب علامہ موصوف واپس ہوئے تو چونکہ شرقیت اور مغربیت کے حقائق یکساں طور پر واضح ہو چکے تھے پھر ان کے مقابل اسلام کی حقیقت اور کاملیت بھی ظاہر ہو چکی تھی اس لیے اب ان کا ایمان اور ایقان پختہ تر ہو چکا تھا۔ قرآنی حقائق ان کے قلب میں ایقانِ کامل کے درجہ تک پہنچ چکے تھے ——— وہ ایک حقیقت کے متلاشی تھے ان کی طبیعت میں "تقویٰ" تھا یہی وجہ ہے کہ کلام اللہ سے انھوں نے صحیح رہبری حاصل کی حقائق و معارف کھلنے لگے اور کیسے نہ کھلتے جب خود بھیجنے والے تعٰلی نے اپنی کتاب بھیجتے ہوئے بتلایا تھا ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ[1] غرض جوں جوں اسرار کھلتے گئے علامہ نے ان کو بلاکم و کاست ہمارے سامنے رکھدیا۔ جو غلط تخیلات دور اول میں پیش کر چکے تھے ان کی بلا تذبذب تردید کر دی کیونکہ اس وقت ان کے خیالات اور نتائج نکراٹل نہ تھے اور اب ان کا فلسفہ مستحکم بنیادوں پر قائم ہو چکا تھا ——— یہ چیز ان کی وقعت کو گراتی نہیں بلکہ "جویائے حقیقت" ہونے پر دلالت کرتی ہے اور حقیقتاً یہی وہ مقام ہے جو اقبال کو عام مفکرین سے ممتاز کر دیتا ہے۔ حقانیت کے عصا سے انہوں نے غلط تخیلات کے بت خانہ پر جو ضرب کلیمی لگائی اس سے وہ مردانِ حق کی صف میں شامل ہو گئے۔ اگر وہ اس بت خانہ پر ضرب نہ لگاتے تو نہ راستہ چھوٹتا اور نہ وہ جلوۂ حقیقت سے دوچار ہوتے جو صرف "مومنین" کا مقام ہے۔ اس دور کی ہر بات سے نہ صرف صداقت اور پختگی ٹپکتی ہے بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمات محمدیؐ ان کے قلب و

---

[1] پارہ الٓمٓ۔

دماغ کے آئینوں سے منعکس ہو کر ہم تک پہنچ رہی ہیں۔

اگر اقبال نے پہلے وطنیت کے راگ الاپے تھے تو سننے والے سنیں کہ اسی بربط سے اب کچھ دوسری ہی لَے نکل رہی ہے جو حقیقتاً پہلے سے کہیں زیادہ دلکش اور دلنشین ہے، دیکھیں کہ اس اژدہائے وطنیت کو عصائے صداقت نے ہضم کر لیا ہے پھر اَب اس کا ذکر کیا! علامہؒ نے فرمایا اور بجا فرمایا۔

"اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اُس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے"[1]

اگر اقبال نے ابتداءً "ترانۂ ہندی" لکھا تھا تو کیا نظریں اَب "ترانۂ ملی" کو نہیں دیکھ سکتیں جو انہیں کی فکر کی پیداوار ہے؟

دیکھو اَب حقیقت بین نے قومیت کے زہریلے اثرات کو جان کر اُس کی تردید کر دی ہے اَب وہ "قومی" نہیں بلکہ "بین الاقوامی" بن چکا ہے، جب ہی تو کہہ رہا ہے۔

"چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مُسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا"[2]

اب علامہؒ زماں و مکان کے قیود سے بالاتر ہو چکے ہیں اور ہر مُسلم کو ایسا ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔

"مسلمانیم و آزاد از مکانیم   بروں از حلقۂ نُہ آسمانیم"[3]

---

[1] بانگ درا: "وطنیت"۔ [2] بانگ درا: "ترانۂ ملی"
[3] ارمغان حجاز: "حضور حق"

کسی خاص خطۂ زمین سے غیر وابستگی اور صرف اس ایک سے لگاوٹ، جس سے بغیر رشتہ جوڑے نہ اخوت ممکن ہے نہ ترقی، مسلم کا شعار ہے۔ اسی چیز کو علامہ موصوف نے پیام مشرق میں یوں پیش کیا۔

"نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم"[1]

غرض اسی دور کی بات اسی اقبال کا منشاء و مقصد یا پیام تصور کی جا سکتی ہے کیونکہ یہی دورِ فکر کی پختگی اور کاملیت کا ہے اس دور میں جس چیز کی دعوت دی گئی وہی اُن کا منشاء اصلی قرار دیا جا سکتا ہے شپرہ چشم اُن کی ابتدائی تاریکی میں تو کچھ دیکھ لیتے ہیں لیکن اس دور کی تابانیوں سے چوندھیا جاتے ہیں اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اگر یہ حقیقت ہے تو چشمۂ آفتاب کا کیا گناہ؟ خیرہ نگہی قابل ملامت ہے ......

اقبال کے منشاء اصلی کے سمجھنے کے لئے اُن کی یہ نصیحت بہت کافی ہے۔

"بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبیست"

اس تحلیلی مطالعہ کی غایت یہ ہے کہ یہ بات واضح ہو جائے کہ اُن خیالات کو لے کر جن کی خود حضرت اقبال نے بعد میں تردید فرما دی یہ سمجھنا کہ اُنھوں نے وطنیت یا قومیت کا درس دیا سراسر غلطی ہے۔ کیا اقبال حامل وحی تھے کہ اُن کی حرکتِ زبان سے نکلا ہوا ہر کلمہ اور جنبش قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ صحیح ہوتا؟ وہ پیغمبر نہیں بلکہ ایک "مردِ مومن" تھے۔

---

[1] پیام مشرق۔

حقیقت جُو اور حقیقت شناس اِنسان تھے۔ جب اُنھوں نے خود کسی خیال کی تردید کردی تو پھر اُسی کو اُن کا منشا یا پیام قرار دینا اُن پر ظلم نہیں بلکہ کہنے والے کی نفس پرستی پر دلالت کرتا ہے۔ اقبال یقیناً انقلاب کے خواہاں تھے لیکن کیسا انقلاب؟ وہ جو روس میں بپا کیا گیا؟ جس میں بربریت تھی اور بہرحال انسانیت کو برباد کرنیکا جذبہ[1] موجود تھا ——— نہیں ہرگز نہیں وہ پہلے " النفس" میں انقلاب پیدا کرنا چاہتے ہیں اور پھر " آفاق" میں ایک ایسا انقلاب جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے رحمت العالمین ؐ نے پیدا کیا تھا جس میں مردم کُشی نہ تھی۔ بلکہ باطل کُشی تھی اور جس میں اس وجہ سے کل انسانیت کے لئے فلاح دارین تھی ——— اِنسانی غارت گری کے اِنقلاب دنیا بہت دیکھ چکی اس لئے اقبال کی روح اَب ایسے اِنقلاب کے لئے تڑپ رہی ہے جو باطل کو جلا کر خاکستر کردے ..... جو اِنسانیت کے لئے باعث رحمت ہو۔

---

[1] اشتراکیت میں اگر مزدوروں کو اُبھارا جاتا ہے تو دوسری طرف سرمایہ دار طبقہ کو موت کے گھاٹ اُتارا جاتا ہے اِس طرح بربریت یہاں بھی پائی جاتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیئے کہ سرمایہ کی مساوی تقسیم اس طرح ہو کہ نہ سرمایہ دار مزدور کو پنجۂ تغلّم میں جکڑ سکے اور نہ مزدور آتش انتقام میں سرمایہ دار کا گلا گھونٹے ——— تاریخ عالم شاہد ہے کہ ایسا انقلاب جس میں باطل مٹ جائے لیکن اِنسانیت متاثر نہ ہو صرف اسلام ہی نے پیدا کیا جس میں سب کے اذہان بدل دیئے گئے جو برتری یا کمتری کے جذبات کے حامل تھے، اور جن میں توازن قائم ہونے سے خود بخود مساوات پیدا ہو گئی۔

میر ولی الدین
ایم، اے، پی، ایچ ڈی
(لندن)

اقبال اور حدیثِ جبر و قدر

مرید۔ اے شریکِ مستیٔ خاصانِ بدر — میں نہیں سمجھا حدیثِ جبر و قدر
پیر۔ "بال بازاں را سوئے سلطان برد — بال زاغاں را بہ گورستاں برد"

(بالِ جبریل)

میں نہیں سمجھا حدیثِ جبر و قدر! آغازِ فکرِ انسانی سے یہی آواز بار بار مضطربانہ انداز سے بلند ہوتی رہی ہے لیکن انسان نے اس مسئلہ کو محض نظری کہہ کر اس پر غور و فکر کرنا بھی ترک نہیں کیا۔ کیوں؟ آخر اس مسئلہ میں جاذبیت کیا ہے؟ اس کے ذکر کے ساتھ ہی عامی سے عامی شخص تک کے کان کیوں کھڑے ہو جاتے ہیں؟ واقعہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ محض نظری نہیں، ہمارا سارا نظامِ دینیات سیاسیات، تعلیمات، معاشیات اور جرمیات اسی مسئلہ کے فہم و افہام پر مبنی نظر آتا ہے۔

اگر ہم مجبور ہیں تو دینیات ہمیں سمجھائے کہ دوزخ ہمارا ٹھکانہ کیوں ہو، جرمیات ہمیں بتائے کہ چور کو سزا دینے کے کیا معنی اور تعلیمات تزکیہ اخلاق و

تصفیہ قلب پر اتنی مُصر کیوں ہے؟ اگر ہم آزاد ہیں تو پھر بقول اسپنوزا کیوں ہمیں اپنی زبان تک پر بھی اختیار نظر نہیں آتا؟ جذبات کا شر رو شور مردانگن کیوں ہوتا ہے اور عقل شہوات کی غلام کیوں رہی ہے؟ آتش انتقام سے مشتعل ہو کر بچہ بھی تو یہی سمجھتا ہے کہ وہ اپنے دشمن پر آزادانہ حملہ کر رہا ہے۔ مدہوش شرابی کو یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ اس کی زبان سے نکل رہا ہے اس میں اس کے اختیار اور مرضی کو پورا دخل ہے گو بعد میں پچھتاتا ہے کہ یہ بکواس اس کی زبان سے نہ نکلی ہوتی! "انسان اپنے کو آزاد و مختار اس لئے سمجھتا ہے کہ اس کو اپنے افعال کا تو شعور ہوتا ہے لیکن وہ ان اسباب وعلل سے جاہل ہے جو ان افعال کا تعین کرتی ہیں"

(اسپنوزا)

ہماری رائے میں اس قدیم مسئلہ کے حل میں عقل نظری ناکامیاب رہی ہے! یہ مسئلہ اب بھی لاینحل ہے یہ مسئلہ نہیں گتھی ہے! عقل کے اس عجز ہی کو دیکھ کر پیغمبر اسلام (فداہ ابی وامی) نے فرمایا کہ "اذا ذکر القدر فامسکوا"[1] (جب تقدیر کا ذکر کیا جائے تو تم خاموش ہو جاؤ) یہ حکم ہوا عوام کو، عالم اور خبیر سے فرمایا گیا، "لا تکلموا فی القدر فانہ سر اللّٰہ فلا تفشوا اللّٰہ سرہ"[2] (تقدیر میں گفتگو نہ کیا کرو کیونکہ وہ خدا کا ایک راز ہے پھر اللہ کے راز کا افشا نہ کرو) اس دوسرے قول سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے ان لوگوں پر اس اہم مسئلہ کو فاش کر دیا ہے جو اس کے سمجھنے کی اہلیت رکھتے ہیں، جن کی شان میں فرمایا گیا ہے "لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید"[3] اسلام کے رب

---

[1] طبرانی عن ابن مسعود کذا فی الجامع الصغیر للسیوطی [2] ابو نعیم فی الحلیۃ کذا فی کنز العمال

[3] جس کے پاس دل ہے، اور کان لگایا اس حال میں کہ وہ خود حاضر ہے ۱۲

بڑے صوفی فلسفی شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی بھی یہی رائے ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں :-

" فسر القدر من اجل العلوم یفہمہٗ اللہ تعالیٰ الا لمن اختصہٗ اللہ بالمعرفۃ التامۃ[1] ۔ سرِ قدر بزرگ ترین علوم سے ہے اور اس سے حق تعالیٰ سوائے اس کے کسی کو آگاہ نہیں کرتے جس کو انھوں نے معرفت تامہ کے ساتھ مختص کر لیا ہے "!

ہم اقبال سے " سرِ قدر " دریافت کر رہے ہیں ۔ اگر اقبال محض شاعر ہوتے تو ہم بھلا اس فلسفیانہ گتھی کو اُن سے سلجھانے کیوں جاتے؟ گو اس میں شک نہیں کہ بمصداق ان من الشعر لحکمۃ[2] علوم و حقائق شعراء کے ہاں بھی مل سکتے ہیں لیکن مسئلہ کی عظمت ہمیں ایک شاعر کے ہاں جانے سے روکتی ۔ اگر اقبال محض فلسفی ہوتے تو بھی ہم اس مسئلہ پر اُن سے بحث کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے کیونکہ ہم نے دیکھ لیا ہے کہ یہاں فلسفہ کی کھیتی پکتی نظر نہیں آتی ۔ اقبال علاوہ سحر بیان شاعر اور جید فلسفی ہونے کے ہمیں عارف بھی نظر آتے ہیں جن پر " صحبت پیر روم " نے بہت سے معارف کا دروازہ کھول دیا تھا مثلاً :-

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سربجیب ایک کلیم سربکف
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

(بال جبریل)

---

[1] فصوص الحکم، شاہ مبارک علی ایڈیشن ص۱۳۷ فص عزیزیہ

[2] بعض اشعار حکمت ہیں (حدیث بخاری)

فلسفہ کی لم ولا نسلّم سے اُکتا کر اُنھوں نے اپنے مولیٰ سے معروضہ کیا تھا:۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا ہوں　　میرے مولیٰ مجھے صاحب جنوں کر

(بال جبریل)

وہ جان گئے تھے کہ:۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں　　اس کی تقدیر میں حضور نہیں

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب　　آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

علم میں بھی سرور ہے لیکن　　یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

(بال جبریل)

جب اُنہیں حضور کی لذت حاصل ہونے لگی تو وہ اب عقل نظری کے اِستدلال سے متنفر نظر آتے ہیں اور "دانش برہانی" میں حیرت کی فراوانی" کے سوا انھیں کچھ نہیں نظر آتا۔

مجھے وہ درس فرنگ آج یاد آتے ہیں
کہاں حضور کی لذت کہاں حجاب دلیل

(بال جبریل)

عارف کا مرتبہ ومقام اِقبال اچھی طرح جانتے ہیں ؎

علم کی حد سے پرے بندۂ مومن کے لئے
لذتِ شوق بھی ہے نعمتِ دیدار بھی ہے

(بال جبریل)

اِقبال کی اس حیثیت سے واقف ہو کر ہم دریافت کر رہے ہیں کہ حدیث جبر وقدر کے متعلق اُن کے "پیر" نے اُنھیں کیا سکھایا ہے؟ جواب میں اِقبال کا پوزیشن اس شعر سے صاف ظاہر ہو رہا ہے ؎

"چنیں فرمودہ سلطان بدر اَست
کہ ایمان درمیانِ جبر و قدر است"

(زبور عجم)

ظاہر ہے کہ اقبال مسئلہ کا صحیح حل وہی سمجھ رہے ہیں جو اُن کے آقائے نامدار صلعم نے بیان کیا ہے کہ انسان مجبور بھی ہے اور مختار بھی اور علم صحیح کی یافت اگر ہو سکتی ہے تو اسی طرح کہ راستہ جبر و قدر کے درمیان اختیار کیا جائے۔

پہلے جبر کے پہلو پر نظر کیجئے۔ جس کسی کا خدا پر یقین ہے وہ خدا کو خالق افعال مانے بغیر رہ نہیں سکتا۔ جس طرح خدا ہمارے جسموں اور روحوں کا خالق ہے وہ ہمارے افعال کا بھی خالق ہے۔ یہ عقیدہ قرآن میں بصراحت النص پایا جاتا ہے توجیہ تاویل کا امکان تک نہیں۔ اِن شواہد پر غور کیجئے۔

اِنا کل شئ خلقنٰہُ بقدرٍ
وکل شئ فعلوہ فی الزبر

(سورہ ۵۵، ۴۹، آیت ۵۲)

"ہم نے ہر چیز بنائی ہے پہلے ٹھیرا کر
اور جو چیز انھوں کی لکھی ہے ورقوں میں"

"شئ" میں افعال بھی داخل ہیں اور چونکہ حق تعالیٰ "خالق کل شئ" ہیں لہذا یہ ضروری طور پر لازم آتا ہے کہ وہ "افعال" کے بھی خالق ہیں۔

اگر افعال مخلوق نہ ہوتے (باوجود اس امر کے کہ ان پر "شی" کا اطلاق ہوتا ہے) تو پھر حق تعالیٰ بعض اشیاء کے خالق ہوتے اور بعض کے نہ ہوتے اور اُن کا یہ قول کہ وہ "ہر شئے کے خالق" ہیں کذب محض ہوتا تعالیٰ اللہ من ذلک علوا کبیرا

اِس حجت قیاسی کی بھی ہمیں کوئی ضرورت نظر نہیں آتی قرآن میں یہ صاف

طور پر کہا گیا ہے کہ

واللہ خلقکم وما تعملون

اور اللہ نے پیدا کیا تمھیں اور جو تم کرتے ہو

(سورہ والصفٰت آیت ۹۶)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ ہمارے افعال کے خالق ہیں۔ یہ تھا ایجابی طرز بیان، ذرا سلبی طریق گفتگو پر بھی غور کر لیجئے۔

یہاں حق تعالیٰ اس امر سے انکار کر رہے ہیں کہ ان کے سوا کوئی خالق اور بھی ہے:-

"ام جعلوا للہ شرکاء خلقوا کخلقہ فتشابہ الخلق علیھم قل اللہ خالق کل شیٔ وھو الواحد القھار"

کیا ٹھرائے ہیں انھوں نے اللہ کے لئے شریک کہ انھوں نے کچھ پیدا کیا جیسے پیدا کیا اللہ نے پھر مشتبہ ہو گئی پیدائش ان کی نظر میں کہہ اللہ ہے پیدا کرنے والا ہر چیز کا اور وہی ہے اکیلا زبردست "

(سورہ الرعد آیت ۱۶)

اب فرض کیجئے کہ خدا نے انسان کو پیدا کیا ہے اور انسان اپنے افعال پیدا کرتا ہے۔ یہ تو یقینی بات ہے کہ افعال افراد انسانیہ سے بہت زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ ہر شخص ان گنت افعال کو پیدا کرتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ لازمی طور پر نکلتا ہے کہ انسان کی پیدا کردہ چیزیں، جو خود خدا کی مخلوق ہے، اس خدا کی پیدا کردہ چیزوں سے زیادہ ہوں گی جو انسان کا خالق ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ انسان قدرت تخلیق میں خدا سے بھی زیادہ کامل ہے اور اس کی مخلوق خدا کی مخلوق سے شمار میں کہیں زیادہ ہے! یہ عقیدہ تو صریحاً احمقانہ ہے۔ مخلوق

خالق سے زیادہ قوی کیسے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا نتیجہ کے طور پر یہی ماننا پڑے گا کہ حق تعالیٰ نہ صرف انسان کے خالق ہیں بلکہ اس کے افعال کے بھی "واللہ خلقکم وما تعملون"۔ صرف حق تعالیٰ ہی خالق ہیں، فاعل ہیں، متصرف ہیں لا فاعل فی الوجود الا اللہ۔ ساری کائنات اُن کی مخلوق، انسان اور اس کے افعال سب کائنات میں شامل ہیں، لہٰذا یہ سب اُن کے مخلوق ہیں۔

جاوید نامہ میں اقبال اسی توحید فی الآثار و توحید فی الافعال کو بیان کر رہے ہیں:-

می شناسی طبع ادراک از کجا ست؟
جوہرے اندر بنگہ خاک از کجا است؟
طاقتِ فکر حکیماں از کجاست؟
قوتِ ذکر کلیماں از کجا است؟
ایں دل وایں واردات از کیست؟
ایں فنون و معجزات از کیست؟
گرمیٔ گفتار داری؟ از تو نیست؟
شعلۂ کردار داری؟ از تو نیست!
ایں ہمہ فیض از بہارِ فطرت است
فطرت از پروردگارِ فطرت است

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا اس کی تائید کلام نبوی سے بھی ہوتی ہے حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا "یا رسول اللہ ارایت

لہ صحاح ۱۲

ما نعمل فیہ علی امر قد فرغ منہ اذا مو نبتدأ؟ فقال علی امر قد فرغ منہ، فقال عمرأ فلا نتکل وندع العمل، فقال اعملوا فکل میسر لما خلق لہ؛ یعنی جس کام میں ہم لگے ہوئے ہیں اس کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟ کیا یہ کام پہلے ہی سے ختم ہو چکا ہے یا ہمیں نے اس کو شروع کیا ہے؟ فرمایا پہلے ہی سے ختم ہو چکا ہے۔ عمرؓ نے کہا تو کیا پھر ہمیں توکل نہیں کرنا چاہیئے اور ترک عمل نہ کرنا چاہیئے۔" یعنی جب پہلے ہی سے ساری چیزیں مقرر و معین ہو چکی ہیں تو پھر ہماری کوشش و عمل سے کیا فائدہ؟ رسول اللہ نے " فرمایا کام کئے جاؤ، ہر شخص کے لئے وہ کام آسان کر دیا گیا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔" عمرؓ نے کہا "الآن طاب العمل" اور اپنے کام پر لگ گئے۔ تقدیر کے بہانہ سے عمل ترک نہیں کیا جا سکتا۔ ادائے فرائض میں اب ایک لذت پیدا ہو جاتی ہے۔ کوشش کو تشویش و فکر سے نجات مل جاتی ہے ہم جان لیتے ہیں کہ ہر شخص کے لئے وہ کام آسان کر دیا گیا جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے۔"

ایک اور دفعہ رسول اللہ سے پوچھا گیا کہ ارایت رقی نسترقیھا ودواء نتداوی بہ ھل یرد من قدر اللہ تعالیٰ، فقال انہ من قدر اللہ[1] یعنی "جو فعل کہ ہم کرتے ہیں اور جو دوائیں کہ استعمال میں لاتے ہیں کیا یہ حق تعالیٰ کی تقدیر کو پھیر سکتی ہیں؟ فرمایا کہ یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی تقدیر سے ہوتا ہے۔ آپ کا یہ ارشاد تو اور بھی زیادہ صاف اور واضح ہے کہ "لا یؤمن احدکم[2] حتیٰ یؤمن بالقدر خیرہ وشرہ من اللہ تعالیٰ۔"

---

[1] رواہ احمد والترمذی وابن ماجہ کذا فی المشکوٰۃ ۱۲۔ [2] صحاح ۱۲

یعنی کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اس امر پر ایمان نہ لائے کہ خیر و شر کی تخلیق من اللہ ہے۔

تعلیم اسلام میں جبر کا یہ پہلو صاف ہے اور اس سے صرف یہی چیز سمجھ میں آتی ہے کہ ہر شئے کی تخلیق من اللہ ہے۔ اور اقبال یہ کہکر "ایں ہمہ فیض از بہار فطرت است۔ فطرت از پروردگار فطرت است" "ہمہ از دوست" کے نظریہ کے قائل اور حامی نظر آرہے ہیں۔ لیکن جبر کی یہ ساری تعلیم قدر یا اختیار یا آزادئ ارادہ کے منافی نہیں! بظاہر ہماری یہ بات عجیب و غریب نظر آتی ہے، دو متضاد چیزوں میں تطبیق واقعی عجیب بات ہے۔ لیکن قرآن کا یہی اعجاز ہے اور اقبال اس تضاد کو بڑی شدت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

جو کچھ میں نے کہا ہے اس کی تائید میں میرے یہاں دلائل موجود ہیں پہلے مجھے آزادئ ارادہ اور ذمہ داری کے نظریہ کی تشکیل کرنے دیجئے جو قرآن کریم میں پیش کیا گیا ہے، خلق من اللہ کے دعویٰ کے ساتھ ساتھ قرآن میں انسان کو اپنے افعال کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔ اس ظاہرا تضاد کی وجہ سے آپ کو جو ضیق محسوس ہو رہا ہے اس پر ذرا سا صبر کر لیجئے ممکن ہے کہ اس مقالہ کے ختم پر آپ کو تسکین ہو جائے۔

انسان اپنے افعال کا ذمہ دار ہے۔ وہ اپنے افعال کا 'کاسب' ہے، اسی لئے وہ جزا و سزا کا مستحق ہے اسی لئے اوامر و نواہی کا نزول ہوا ہے اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے اس کے ساتھ وعدے کئے ہیں اور وعید بھی کی ہے چنانچہ قرآن میں واضح طور پر بتلا دیا گیا ہے کہ

"لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت" اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے،

جس نے جو کمایا اس کو وہی ملتا ہے اور اسی پر پڑتا ہے جو اس نے کیا"
(البقرہ آیت ۲۸۶)

یہاں افعال کی ذمہ داری کا بار انسان پر رکھا گیا ہے۔ وہ اپنے خیر کا کاسب ہے اور شر کو بھگتتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فعل اخلاقی کا صحیح معنی میں اس وقت تک ارتکاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ فاعل اپنے فعل کا ذمہ دار نہ ہو۔ اگر ایک شخص سو رہا ہے یا اس کو دارو بے ہوشی دی گئی ہے، یا وہ پاگل ہے، یا طفل شیر خوار ہے تو وہ اخلاقیاتی معنی کے لحاظ سے فاعل قرار ہی نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس کا فعل اختیار اور عقلی ارادہ پر مبنی نہیں۔ اور جب قرآن میں یہ کہا جاتا ہے کہ

"ان احسنتم احسنتم لانفسکم وان اسأتم فلها
(اگر تم نے بھلائی کی تو اپنے لئے کی اور برائی کی تو اس کا وبال بھی تم ہی پر ہے)۔ تو انسان کو اس کے اختیار اور عقلی ارادہ کی بناء پر ذمہ دار قرار دیا جا رہا ہے۔ اسی مفہوم کو امام حسن رض ظاہر فرما رہے ہیں" ان اللہ تعالیٰ لا یطاع باکراہ ولا یعصی بغلبۃ ولم یہمل العباد من المملکۃ"
اللہ تعالیٰ کی اطاعت بجبر و اکراہ نہیں ہو رہی ہے اور نہ اس کی نافرمانی کسی قوت قاہرہ کی وجہ سے عمل میں آ رہی ہے اور اس نے اپنے بندوں کو اپنے ملک میں بیکار نہیں چھوڑ دیا ہے" لا اکراہ فی الدین" قرآن کا دستور ہے۔ فعل کے ارتکاب میں جبر ہو تو وہ اخلاقی فعل کیسے کہلایا جا سکتا ہے؟
سہل بن عبد اللہ رض کا ارشاد ہے کہ" ان اللہ لا یقوی الابرار بالجبر وانما قواھم بالیقین" یعنی حق تعالیٰ نے نیکوں کو اطاعت کی قوت جبراً عطا نہیں کی ہے بلکہ انھیں یقین کے ذریعہ

توثیق دی ہے:" اِس خصوص میں اکابر صوفیہ میں سے کسی کا یہ قول بمنزلہ قانون قرار دیا جا سکتا ہے۔

"من لم یومن بالقدر فقد کفر، ومن احال المعاصی علی اللہ فقد فجر۔"

"جو قدر پر ایمان نہ لائے وہ کافر ہے اور جو معاصی کو خدا کے حوالہ کرتا ہے وہ فاجر ہے۔"

حق تعالیٰ کی نافرمانی کے لئے آزادئ ارادہ کی ضرورت ہے، ان کی نافرمانی ممکن ہے، اور جب بھی معصیت کا ارتکاب ہوتا ہے نافرمانی وقوع پذیر ہو رہی ہے لہذا انسان کو انتخاب اور آزادی حاصل ہے جس کو وہ گناہوں کے ارتکاب کے وقت استعمال کرتا ہے۔

انسان کے اس اختیار کو، حریت کو، جبر سے آزادی کو اقبال بڑے جوش سے پیش کرتے ہیں ؎

بپائے خود مزن زنجیر تقدیر
تہ این گنبد گردوں رہے ہست

اگر باور نداری خیز و دریاب
کہ چون پا وا کنی جولانگہے ہست

(پیام مشرق)

جاوید نامہ میں ایک نئے انداز سے کہتے ہیں ؎

از ضیاں نقد خودی در باختند
نکتۂ تقدیر را نشناختند

رمز باریکش بہ حرفے مضمر است
تو اگر دیگر شوی او دیگر است
خاک شو، نذرِ ہوا سازد ترا
سنگ شو، بر شیشہ اندازد ترا
شبنمی؟ افتندگی تقدیر تست
قلزمی؟ پابندگی تقدیر تست

اَب ہمارے سامنے 'اِثبات' (Thesis) اور نفی (Anti-Thesis) دونوں صاف طور پر پیش کر دیئے گئے ہیں اِنسان اپنے افعال میں مجبور ہے حق تعالیٰ اِنسان کے خالق ہیں اور اس کے افعال کے بھی خالق ہیں "خلقکم وما تعملون" "بیان" انسان اپنے اِختیار و اِنتخاب میں آزاد ہے، اِسی لئے اپنے افعال کا ذمہ دار ہے، اور اسلئے سزا و جزا کا مستحق ہے "من عمل صالحاً فلنفسہٖ" نیز افرأیتم ما تحرثون" نقیض بیان:

اِس تضاد کو رفع کرنے کے لئے ہم آپ کو کچھ دیر کے واسطے تجرید فکری کی دعوت دیتے ہیں (تفکر بقول ہیگل کے کم زور دماغ کے لئے اسی قدر مشکل ہے جس قدر کہ کم زور پشت کے واسطے بار گراں کا اُٹھانا دونوں مجبور ہیں اور اِس لئے معذور۔ نہ ایک سے فکر ہوسکتی اور نہ دوسرے سے بوجھ اُٹھ سکتا ہے۔ یہاں ہمارا خطاب اہلِ فکر سے ہے۔ ان چند قضایا پر غور کیجئے۔ ہمارا یہ تو یقین ہے کہ حق تعالیٰ موجود ہیں اور وہ عالم مطلق بھی ہیں۔ اب عالم کے لئے "علم" اور "معلوم" کی ضرورت ہے۔ حق تعالیٰ کے ان تین اعتبارات میں ابتدا ہی سے صاف طور پر تمیز کی جا سکتی ہے۔ وہ اپنے ہی افکار و تصورات

کے عالم ہیں، یہی ان کے علم کے معلوم ہیں، معروض ہیں، علم بغیر معلومات کے ویسے ہی محال ہے جیسے قدرت بغیر مقدورات کے، سمع بے مسموعات اور بصر بے مبصرات کے۔ حق تعالیٰ چونکہ ازل سے عالم ہیں اور علم بغیر معلومات کے ناممکن، لہٰذا ان کے معلومات بھی ازلی ہیں۔ یعنی معلومات "غیر مجعول" یا غیر مخلوق ہیں۔ علم حق تعالیٰ کی ایک صفت ہے، اس کا اُن کی ذات سے انفکاک ناممکن ہے، ورنہ حق تعالیٰ کو جہل لازم آئے گا تعالیٰ اللہ عن ذلک چونکہ حق تعالیٰ غیر مخلوق اور ازلی ہیں ان کا علم بھی غیر مخلوق ہے اسی طرح چونکہ ان کا علم کامل ہے لہٰذا اُن کے معلومات بھی کامل ہوں گے۔

اب حق تعالیٰ کے معلومات کو فلاسفہ "ماہیات اشیار" کہتے ہیں اور صوفیہ "اعیان ثابتہ" (یا "صور علمیہ" یا "معلومات حق" یا حقائق الممکنات یا ازل ممکن) یہ، جیسا کہ کہا گیا، اولاً غیر مجعول ہیں اور ثانیاً کامل اور عدیم التغیر۔ ظاہر ہے کہ ہر "عین" کی اپنی خصوصیت ہوگی جکو اس کی فطرت کہا جا سکتا ہے اس کو دوسرے الفاظ میں "عین" کی قابلیت "یا" اقتضا "یا" قرآنی اصطلاح میں "شاکلہ" کہا جاتا ہے (قل کلٌ یعمل علیٰ شاکلتہ)

یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ اعیان چونکہ غیر مجعول و غیر متغیر ہیں لہٰذا اُن کے اقتضاءات یا قابلیات و شاکلات بھی غیر مخلوق و عدیم التغیر ہیں ؎

قابلیت بہ جعل جاعل نیست
فعل فاعل خلاف قابل نیست

بسرّ قدر کو سمجھنے کے لئے بس اِن ہی چند قضایا کا سمجھ کر تسلیم کرلینا کافی ہے۔ ہماری رائے میں، ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس سے آپ کو اختلاف ہو سکتا ہو۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات ازل سے ثابت ہے، وہ ازل سے عالم بھی ہیں یعنی صفت علم سے موصوف ہیں۔ چونکہ علم کے لئے معلوم کا ہونا ضروری ہے لہٰذا معلومات حق بھی ازلی ہیں اور غیر مجعول۔ معلومات ہی "ماہیات اشیاء" یا ذوات ممکنات کہلاتے ہیں۔ جب معلومات ازلی ہیں تو ان کی سارت قابلیات بھی ازلی ہوں گی۔

اب تخلیق کا تعلق ارادہ سے ہے۔ تخلیق ارادہ کا عمل ہے۔ حق تعالیٰ کا ارادہ ان کے علم کا تابع ہوتا ہے۔ اُن کا ہر فعل تحت حکمت ہوتا ہے اور اس کے لئے فعل کو علم کا تابع ہونا ضروری ہے۔ تخلیق نام ہے حق تعالیٰ کے معلومات یا اعیان کے خارج میں انکشاف کا۔ جو چیز خارج میں منکشف ہو رہی ہے وہ بحیثیت "تصور" یا "معلوم" علم الٰہی میں ازل سے موجود ہے۔ ان ہی معلومات یا تصورات یا اعیان کا جب خارج میں تحقق ہوتا ہے تو اُن کا نام "اشیاء" ہوتا ہے۔ اشیا داخلاً معلوم ہیں۔ خارجاً مخلوق ہیں اپنی انفرادیت اور تعین و تشخص کے لحاظ سے غیر ذات حق ہیں، ذات حق تمام تعینّات و تشخصات سے منزّہ ہے: لیس کمثلہ شئی وھوا لسمیع البصیر۔

اب ان حقائق کی روشنی میں مدیث جبر و قدر پر نظر ڈالو۔ تخلیق حق تعالیٰ کی طرف سے ہو رہی ہے لیکن اشیاء کے اقتضاءات یا قابلیات کے مطابق ہو رہی ہے۔ اشیاء کی یہ قابلیات بے جعل جاعل ہیں یعنی

غیر مخلوق و ازلی ہیں، اُن کو کسی نے مجعول نہیں کیا۔ یہ اپنے اقتضائے ذاتی کے لحاظ سے مستقل و مختار ہیں نہ کہ مجبور۔ یہی باریک بات جبری کی سمجھ میں نہیں آتی وہ اپنے عین یا ذات کو بھی مجعول و مخلوق خیال کرتا ہے، اپنی خصوصیات و قابلیات کو بھی آفریدہ سمجھتا ہے، حالانکہ یہ معلوم الٰہی ہونے کی وجہ سے ازلی ہیں، اگر یہ ازلی نہ ہوں، اور یہ جعل جاعل مجعول ہوں تو ضروری ہوگا کہ قبل جعل سلب ہوں گے، جو چیز سلب ہو وہ ہمیشہ سلب ہوگی موجود نہیں ہوسکتی، ورنہ قلب حقیقت لازم آئے گا، اور یہ محال و باطل ہے۔ اگر جبری اس نکتہ کو سمجھ لے تو وہ پھر یہ نہ کہے گا کہ میری فطرت اِس طرح کیوں بنائی گئی، فطرت، جس کو ہم اصطلاحی الفاظ میں عین ثابتہ یا معلوم کہہ رہے ہیں بنائی نہیں گئی، وہ مجعول ہی نہیں، یہ اور اس کے تمام اقتضاءات و قابلیات بے جعل جاعل ہیں اور اس طرح وہ اپنے اقتضائے ذاتی کے لحاظ سے مستقل و مختار رہے ہے۔ لیکن ان قابلیات و خصوصیّات کو حق تعالیٰ خارج میں ظاہر کر رہے ہیں، وجود بخشی ان کی جانب سے ہو رہی ہے۔ تخلیق ہمیشہ اللہ ہی کا فعل ہے۔ "خلقکم وما تعملون"۔

اُوپر جو کچھ کہا گیا اس کو ایک جملہ میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ یہی سِرّ قدر ہے۔

"لا یمکن بعین ان یظھر فی الوجود ذاتاً صفۃ و فعلاً الا بقدر خصوصیۃ واھلیتہ واستعدادہٗ الذاتی"۔ (شیخ اکبر)

یہاں جبر و قدر دونوں میں تطبیق ہو رہی ہے۔ اعیان ثابتہ جو معلومات حق ہیں (اور حق تعالیٰ اُن کے عالم ہیں) اپنی خصوصیّات و قابلیات و استعدادات کے موافق ظاہر ہو رہے ہیں۔ یہ ہے اختیار اور آزادی کا پہلو، لیکن ان کا ظہور حق تعالیٰ سے ہو رہا ہے یہ ہے جبر کا پہلو!

دیکھو " حرکت ایک ہے اور نسبت دو "

ایک نسبت حق کی جانب ہے ۔ یہ نسبت تخلیق ہے ۔ جملہ افعال کی تخلیق حق تعالیٰ کر رہے ہیں ۔ فاعل حقیقی وہی ہیں ۔ ذات خلق میں نہ حرکت ہے نہ قوۃ ، لاحول ولا قوۃ الا باللہ ۔ یعنی حرکت ۱۲ ۔ تخلیق افعال میں انسان مجبور ہے ۔ " ہمہ از دست "

دوسری نسبت خلق کی جانب ہے یہ نسبت " کسب " ہے ، یعنی افعال کی تخلیق عین ثابتہ یا ماہیت شئی کے بالکل مطابق ہو رہی ہے ، بالفاظ دیگر جو کچھ عین میں ہے بہ فعلیت خالق وہی ظاہر ہو رہا ہے ، یا یوں کہو ہر شئی کی فطرت کے مطابق ظہور ہو رہا ہے ، جب تمام وقوعات میری اقتضاء کے موافق ہو رہے ہوں اور کوئی شئے میری فطرت کے خلاف مجھ پر عاید نہیں کی جا رہی ہے تو پھر میں صحیح معنی میں آزاد ہوں اسی لئے شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ مایحکم علینا الا بنا بل نحن نحکم علینا بنا ۔ " جو کچھ ہم پر حکم لگایا جا رہا ہے وہ ہماری فطرت کے مطابق ہے ، بلکہ خود ہم اپنی ہی اقتضا کے مطابق حکم لگا رہے ہیں یہ ٹھیک قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق ہے :" اتاکم من کل ما سالتموہ[۲] یعنی وہ سب کچھ تم کو اس نے دیا جس کو تمہارے عین نے لسان استعداد سے مانگا " دوسری جگہ اور زیادہ صاف طور پر بیان کیا گیا ہے :۔

" انا لموفوھم نصیبھم غیر منقوص[۳] فللہ الحجۃ البالغۃ[۴]

" ہم ان کا حصہ پوری طرح بغیر کسی نقصان کے دیتے ہیں " صاحب گلشن راز حق تعالیٰ کی زبانی کہلواتے ہیں ؎

---

[۱] پ ۱۳ ع ۱۷ [۲] پ ۱۲ ع ۹ [۳] پ ۸ ع ۵

ہرچہ از زین و شین شما است
بر سرِ مقتضائے عین شما است

ہرچہ عین شما تقاضا کرد
جودِ فیض من آں ہویدا کرد

ہر شخص کا عین گویا ایک کتاب ہے جس میں اس کی تمام خصوصیات وقابلیات ذاتیہ درج ہیں۔ حق تعالیٰ کی تخلیق اس کے عین مطابق ہو رہی ہے جامیؒ سامی نے اُس کو بڑی خوبی سے ادا فرمایا ہے۔

" اے عین تو نسخۂ کتاب اوّل
مشروع دراں صحیفۂ اسرارِ ازل

احکامِ قضا چو بود در وے بدرج
حق کرد باحکام کتابِ تو عمل

اِسی مفہوم کو اور زیادہ اِصطلاحی زبان میں ادا کرو تو بات اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے اور تمام مسئلہ کی تلخیص حاصل ہو جاتی ہے۔ اعیان یا ماہیات دراصل معلومات حق ہیں اور حق تعالیٰ کا حکم اپنے معلومات کا تابع ہوگا؛

وللہ درمن قال ؎

حق عالِم و اعیان خلائق معلوم
معلوم بود حاکم و عالِم محکوم

بر موجب حکم تو کند با تو عمل
گر تو بہشل معذبی در مرحوم

(جامی)

اِس طرح حکم قدر عین ثابتہ کی طرف ہی رجوع ہوتا ہے یعنی تخلیق حق

تابع اقتضاآت عین ثابتہ ہے' اسی لئے کہا گیا ہے " القدر امانت والحکم لك " بلا شک اب اس راز کے معلوم ہو جانے کے بعد ہمیں ایک سکون حاصل ہو جاتا ہے اور غیر کے تعلق سے ہم کٹ جاتے ہیں، خیر و شر کا مبدا اپنی ہی ذات کو قرار دیتے ہیں، " از ماست کہ بر ماست " کے معنی ہم پر کھل جاتے ہیں، نہ ظلم کی نسبت خدائے تعالیٰ کی طرف کرتے ہیں (کیونکہ " ظلم باشد ز فعل او مسلوب " (ان اللہ لیس بظلام للعبید[1]) نہ ابنائے زمانہ ہی کو ملعون و مطعون قرار دیتے ہیں اور نہ ماحول ہی کو بدنام کرتے ہیں، بلکہ ذمہ داری اپنے کندھوں پر لیتے ہیں اور اپنے ہی نفس کو مخاطب کر کے کہتے ہیں " یداك کسبتا و فوك نفخ " تیرے ہی دونوں ہاتھوں نے کمایا ہے اور تیرے ہی منہ نے پھونکا ہے " یہ سچ ہے

" وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم "[2]

جبر و قدر کی اس تلفیق کے بعد جب ہم علامہ اقبال کی طرف رجوع کرتے ہیں تو یہاں بھی یہی حل ہمیں ملتا ہے۔ لیکن طرز بیان مختلف ہے اور اصطلاحات جدا ہیں۔ مگر تضاد اس شدت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور توضیح میں اس قدر اجمال سے کام لیا گیا ہے کہ تضاد بیانی تو نمایاں نظر آتی ہے لیکن تلفیق کا نشان غائب ہو جاتا ہے۔ ان کی فلسفیانہ کتاب (Recoas truction) میں ہمیں دو ایک عبارتیں ایسی واضح مل جاتی ہیں کہ اگر اقبال ان کی توضیح میں ذرا اور تفصیل سے کام لیتے تو بات کے سمجھنے میں زیادہ آسانی ہو جاتی۔ تاہم اقبال علم صحیح کے مطابق حل ضرور پیش کرتے ہیں، گو اجمالی طور پر اسی

---

[1] پ ۴ ع ۱۰ [2] پ ۲۵ ع ۵

اجمال کو یہاں کسی قدر کھولا جا رہا ہے۔
اپنی مذکورہ بالا کتاب میں "تقدیر" کی توضیح میں اقبال کہتے ہیں:۔

"As the Quran says:-" "'God created all things and assigned to each its destiny.' The destiny of a thing, then, is not an unrelenting fate working from without like a task master; it is the *inward reach of a thing, its realizable possibilities which lie within the depths of its nature* and *socially actualize themselves without any feeling of external compulsion.*"

(Ibid pp. 67-

یعنی "جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے "خلق کل شی وقدرہ تقدیرا"
تقدیر کوئی قوت قاہرہ نہیں جو خارج سے شی پر بجبر عمل کر رہی ہو۔ بلکہ وہ خود شی کی باطنی رسائی ہے اس کے وہ قابل تحقق امکانات ہیں جو اس کی فطرت میں مضمر ہیں جو بغیر کسی خارجی جبر کے اپنے وقت پر ظاہر ہوتے ہیں"
اسی ایک عبارت پر غور کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ اقبال شی کی قابلیات اور اقتضاآت کو یا اُن کے الفاظ میں "قابل تحقق امکانات" ہی کو اس کا "اختیار" قرار دے رہے ہیں، اس کے معنی یہ ہیں کہ اقتضاآت غیر مجعول و غیر مخلوق ہیں اور چونکہ ان ہی اقتضاآت کا خارج میں (بہ فعلیت خالق) ظہور ہو رہا ہے لہٰذا ذات شی پر کوئی جبر واقع نہیں ہو رہا ہے اور اس معنی میں "وہ آپ ہے تقدیر الٰہی"[1] شیخ اکبر نے اس مفہوم کو اس طرح ادا کیا تھا کہ "ان الحق لا یعطیہ

[1] اقبال بال جبریل۔

الا ما اعطاہ عینہ" حق تعالیٰ شی کو وہی عطا فرماتے ہیں جو اُس کے عین (یعنی معلوم) کا تقاضا ہے۔ اقبال اسی چیز کو دوسرے رنگ میں پیش کر رہے ہیں

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے (بال جبریل)

انسان اس معنی میں مجبور نہیں کہ اس کی "قابلیات" بھی تخلیق الٰہی قرار دیئے جائیں۔ انسان کی فطرت یا ماہیت بالفاظ دیگر اس کا "عین" (معلوم الٰہی ہونے کی وجہ سے، جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا ہے) غیر مخلوق ہے اور اسی لئے اس کو اختیار اور آزادی حاصل ہے اپنے الفاظ میں شاید اقبال اسی مفہوم کو ادا کر رہے ہیں ؎

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں
ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی
(بال جبریل)

حق تعالیٰ کی قدرتِ مطلقہ و حکمتِ بالغہ کا لحاظ کرتے جن کا اقبال دل و جان سے قائل ہے اس شعر کی توجیہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے جو ہم نے پیش کی ہے؟

آزادی اور اختیار کے اس مفہوم کے ساتھ جبر کا وہ مفہوم بھی یاد رکھو جو اقبال نے "ہمہ از دست" کے معنی میں لیا ہے اور تخلیق کی نسبت حق تعالیٰ کی جانب کی ہے تو تمھیں اس تضاد کی تلفیق سمجھ میں آنے لگتی ہے جس کو ہم نے دو جملوں میں ادا کیا ہے" الخلق من الحق والکسب من الخلق" یہی معنے ہیں اس مشہور قول کے جو امام جعفر الصادق کی طرف منسوب کیا جاتا ہے:

"لا جبر ولا قدر بل الامر بین الامرین"

بشنو سخن شکل و سرِّ مُغلق | ہر فعل و صفت کہ باشد باعبدِ ملحق
از یک جہت آں جملہ مضاف است بعبد | از وجہِ دیگر جملہ مضاف است بحق

(جامی)

اگر آپ نے سرِّ قدر کو سمجھ لیا ہے تو آپ کی سمجھ میں یہ بھی آجائیگا کہ کیوں "کاملین" جبر کے معنی "تخلیق من اللہ" لے کر ایک قسم کی قوت و طمانیت محسوس کرتے ہیں اور کیوں جاہل جبر کو سلب آزادی سمجھ کر ضیق میں گرفتار ہو کر اباحت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ قاضی محمود بحری کے انھیں نفیس اشعار میں سے ایک شعر اقبال اپنے مکالمہ میں "پیر" کی زبانی کہلواتے ہیں۔

جبر باشد پر و بالِ کاملاں! | جبر ہم زنداں و بند جاہلاں!
بال بازاں را سوئے سلطاں برد! | بال زاغاں را بگورستاں برد!

خواجہ غلام السیّدین

اقبال کا نظریۂ ادب

اِقبال کا نظریۂ ادب کیا ہے؟ اُس کے نزدیک ادب اور زندگی کا کیا تعلق ہے؟ ادیب اور شاعر کو زندگی کی جدوجہد اور کشمکش میں کیا رویّہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اُس پر بحیثیت ایک ادیب کے کیا فرائض عائد ہوتے ہیں؟ اگر اِس سوال کا جواب ادب کی شکل اِصطلاحوں میں دیا جائے تو وہ بہت لمبا اور گنجلک ہو جائے گا۔ اِس لیئے سیدھے سادھے الفاظ میں سُن لیجئے۔

بعض لوگوں کا خیال تو یہ ہے اور یہ رہا ہے کہ جب اِنسان زندگی کی کٹھن آزمائشوں اور تکلیفوں سے عاجز آجاتا ہے یا ہمت اور حوصلے کی کمی کی وجہ سے اُن کا مقابلہ ہی نہیں کرسکتا تو وہ اپنے اصلی اور واقعی ماحول سے بھاگ کر ادب اور شاعری کے دامن میں پناہ لیتا ہے اور وہاں اپنے لیئے جذبات اور خیالات کی ایک چھوٹی سی ستھری اور خوبصورت دنیا بسا لیتا ہے اور اس تمثیل کو حقیقت پر ترجیح دیتا ہے۔ اگر آپ دنیا کے ادب کا مطالعہ کریں تو ماننا پڑیگا کہ اکثر ادیبوں پر یہ تعریف پوری اُترتی ہے۔ وہ اپنے گردوپیش کی دنیا سے جہاں تک ممکن ہوتا ہے،

بے تعلق ہو جاتے ہیں۔ اُن کے ملک میں آگ لگی ہو لیکن وہ روم کے شہنشاہ نیرو کی طرح بیٹھے بانسری بجاتے ہیں۔ یہ وہ بزرگ ہیں جن کی شان میں اقبال نے خود کہا ہے ؎

شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق
افکار میں سرمست، نہ خوابیدہ نہ بیدار

ان میں سے بعض ایسے بھی ہوئے ہیں جن کا دل زیادہ حساس تھا اور وہ گرد و پیش کے حالات اور واقعات سے اثر لئے بغیر نہ رہ سکے لیکن انھوں نے اس اثر کا اظہار محض آنسوؤں اور آہوں اور دنیا کی نا اہلیت پر گریہ وزاری کی شکل میں کیا۔ البتہ انھوں نے اِن جذبات کو شعر اور ادب کے قالب میں ڈھالکر دلکش اور اثر آفریں ضرور بنا دیا۔ لیکن یہ لوگ بھی دراصل زندگی سے گریز کر کے ادب کی سرزمین میں پناہ لینا چاہتے تھے۔ وہ اس آہ وزاری کے ذریعہ اپنے جذبات کی شدّت کو ظاہر کر کے سکون حاصل کر لیتے تھے۔ اور کچھ کرنے کی ذمہ داری سے آزاد ہو جاتے تھے۔ وہ لوگ بھی جو اس ادب کے قدردان تھے جذبات کے اظہار کو عمل کا بدل قرار دیتے تھے کیونکہ یہ ادب اور شاعری عمل کی قوت کو کم کرتی ہے بڑھاتی نہیں۔ اس کی تہ میں یہ عقیدہ پنہاں ہے کہ فن کار ہمیشہ اپنے ماحول سے شکست کھاتا ہے اور زندگی کی عملی کشمکش میں شریک ہونے سے اس کی قوتِ تخیل اور نظر کی رسائی کم ہو جاتی ہے۔

جو ادب اس نظریہ پر مبنی ہے وہ محض ادیب اور شاعر کے ذاتی جذبات اور احساسات کا نقشہ کھینچتا ہے اور اجتماعی زندگی سے بیگانہ ہوتا ہے آپ بیتی بیان کرتا ہے، جگ بیتی سے سروکار نہیں رکھتا۔ ممکن ہے اس کے چاروں طرف

بشکریہ آل انڈیا ریڈیو۔

نہایت زبردست سیاسی سماجی اور تمدنی تحریکیں دنیا کے نظام کو درہم برہم کررہی ہوں۔ لیکن وہ شعوری طور پر اُن سے متاثر نہیں ہوتا اس کے اپنے چھوٹے سے دل کی خلش عالم انسانیت کے دکھ درد پر غالب آجاتی ہے اور اس دل کے ٹوٹنے کی صدائیں (جس کو ممکن ہے کسی نہایت نااہل خیالی محبوب نے توڑا ہو!) تمام انسانی ہنگاموں کا شور غائب ہوجاتا ہے۔ وہ اُس نفیس اور آرام دہ اُصول پر کاربند رہتا ہے کہ "ادب کو ادب کی خاطر" ہونا چاہیئے۔ اس کو زندگی کی آگ میں کودنے سے کیا کام؟ اقبال ایسے ہنروروں سے بھی بیزار ہے۔ ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا
اُن کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

موت کی نقش گری اُن کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر ان برہمنوں کا بیزار

چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

جہانتک موجودہ دور کا تعلق ہے حالیؔ پہلا شاعر تھا جس نے جان بوجھکر اور سوچ سمجھ کر اردو شاعری کے دھارے کا رخ بالکل پلٹ دیا اور جو شاعری دور زوال میں شاعروں کے چھوٹے اور اوچھے جذبات کا کھیل بن کر رہ گئی تھی اس کو قومی زندگی کے عروج و زوال کا ترجمان بنا دیا۔ اقبال شاعری کے اسی نظریہ کا معترف ہے۔ وہ گریز کا مخالف ہے اور چاہتا ہے کہ شاعر اور ادیب بھی دوسرے زندہ انسانوں کی طرح زندگی کے پرآشوب سمندر میں تیرنا سیکھیں یہ زندگی کبھی کڑوی ہے کبھی میٹھی۔ کبھی کامیابی اور فتح مندی سے ہم آغوش ہے

اور کبھی ناکامی اور حسرت کا منہ دکھاتی ہے۔ لیکن انسان کی سیرت اسی کشمکش میں ڈھلتی ہے اور شاعر اور ادیب اسی آگ میں تپ کر کندن بن سکتے ہیں ؎

سکندر با خضر خوش نکتہ گفت
شریکِ سوز و سازِ بحر و بر زی
تو این جنگ از کنارِ عرصہ بینی
بمیر اندر نبرد و زندہ تر زی

بہرحال اقبال کا نظریہ یہ ہے کہ جو ادیب اِس جنگ سے بھاگے گا وہ شاید ادب کو الفاظ کا کھیل بنا کے اپنا اور اپنے جیسے بے ہمت اپاہجوں کا دل بہلالے۔ لیکن اس کی تحریر میں وہ قوت اور جوش اور خلوص نہیں پیدا ہو سکتا جو افراد اور اقوام کی تقدیر بدل دیتا ہے وہ ساحل کی سلامتی سے رزم و خیر و شر کو دیکھتا ہے اور ساحل کے سنگریزوں سے کھیلتا ہے لیکن نہ طوفان کے تھپیڑے کھاتا ہے نہ اس کو موتی ہاتھ آتے ہیں۔ ادب اُس وقت حیات آفریں بنتا ہے جب اس کے ہاتھ میں زندگی کی نبض ہو اور وہ انسان کے دل میں زندگی کے اِمکانات اور اس کے حسن و شوکت کا زیادہ گہرا احساس پیدا کرے۔ اِقبال ہی کی زبان سے اس حقیقت کی تفسیر سنیئے :۔

اے اہلِ نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کہ حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ اَبدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

بے معرکہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

لہٰذا وہ ادب میں بھی ضرب کلیمی کی شان پیدا کرنا چاہتا ہے جو انسانوں میں اپنی غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا ولولہ پیدا کر دے اور ان کی کھوئی ہوئی یا سوئی ہوئی خودی کو بیدار کر دے۔ اُس کے نزدیک ادب اور تمام فنون لطیفہ کا اعلیٰ ترین مقصد خودی کا استحکام ہے جو ادب انسان کو اس کی خودی سے بیگانہ کرتا ہے اور تسخیر عالم کے لئے اس کو آمادہ نہیں کرتا وہ انفرادی اور قومی زندگی کے لئے ہلاکت کا پیغام ہے۔

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر
گہر ہیں اُن کی گرہ میں تمام یک دانہ

اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات
نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ

ہوئی ہے زیر فلک اُمتوں کی رسوائی
خودی سے جب ادب و دیں ہوئے ہیں بیگانہ

مشرق کے شاعر کے اس بلند اور اہم فرض کا احساس کرتے ہوئے وہ اس کو ان الفاظ میں دعوت عمل دیتا ہے:۔

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاج نفس نے
شاعر تیرے سینے میں نفس ہے یا نہیں ہے

تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم

اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو
شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے
ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے معرکہ ہاتھ آئے جہاں تختِ جم و کے
ہر لحظہ نیا طور نئی برقِ تجلّی
اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے!

اور پھر اقبال کا ادیب اور شاعر صرف اپنے ذاتی جذبات کی نمائش نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے کلام میں عالمِ انسانیت کا دل دھڑکتا ہے۔ وہ تمام قوتیں اور تحریکیں جو انسانوں کو بحیثیت انسان کے متاثر کرتی ہیں اور ان کی تقدیر کو بناتی یا بگاڑتی ہیں۔ اس کے دل کے تاروں کو چھیڑتی ہیں اور جب یہ نغمہ "ادب خوردۂ عقل" بن کر نکلتا ہے تو انسانوں کے لئے شمعِ ہدایت بن جاتا ہے۔ اقبال کا اپنا کلام اس اصول کی ایک بہترین مثال ہے —— کون سے اجتماعی مسائل تھے جنھیں اقبال نے اپنی شاعری میں بحث نہیں کی؟ فلسفہ۔ سیاست۔ معاشرت۔ مذہب۔ تعلیم، سبھی اس کا میدان تھے۔ لیکن یہ اس کی شاعری کا اعجاز ہے کہ اس نے ان اہم اور دقیق مسائل کو شعر کے حسین قالب میں اس عمدگی سے ڈھالا کہ ان کی شعریت میں فرق نہ آیا۔۔۔۔۔
تمام ادیبوں اور شاعروں کے لئے اس کا پیغام یہی ہے کہ وہ انسانیت کے بلند ترین مقاصد کی ترجمانی کریں اور ان کے حصول کے لئے جو جد و جہد جاری ہے اس میں علم برداری کے فرائض انجام دیں اور اپنی گوشہ نشینی اور آسائش پسندی کو چھوڑ کر اس عظیم الشان انسانی جہاد میں شریک ہوں۔

اے میان کیسات نقدِ سخن
بر عیارِ زندگی خود را بزن

مدّتے غلطیدہٗ اندر حریر
خو بہ کرپاس درشتے ہم بگیر

مثلِ بُلبل ذوقِ شیون تا کجا
در چمن زاران نشیمن تا کجا

اَے ہما از یمُنِ دامت ارجمند
آشیانے ساز بر کوہِ بُلند

"نئے اَدب" اور "ترقی پسند" اَدب کی جو مفید تحریک ہندوستان میں بڑھ رہی ہے۔ اس پر اقبال کا یہ اِحسان ہے کہ اس نے اپنے بعد آنے والے ادیبوں کی توجہ کو قومی اور اجتماعی مسائل کی طرف پھیرا تھا اور اُنھیں محض ذاتی جذبات اور مکروہات کے بندھنوں سے نجات دلائی تھی۔ ممکن ہے کہ ان میں سے بعض تنگ نظر یا ناسمجھ لوگ محض اس کے طرزِ بیان سے یا اُکی مذہبیت سے بدظن ہو کر اس بات کا اعتراف نہ کریں یا وہ اس بے لاگ تنقید اور محاکمہ سے جو قدیم اور جدید دونوں کو پرکھتا ہے۔ چراغ پا ہوں لیکن واقعہ یہ ہے کہ اگر حالی اور اقبال نے اردو شاعری اور ادب کو یہ نیا راستہ نہ دکھایا ہوتا تو جدید ادب کے یہ علم بردار نہ معلوم کن بھول بھلیوں میں گم ہوتے۔ محض دوسرے ملکوں کی تقلید سے راستہ پانا اور کوئی پائیدار کامیابی حاصل کرنا ممکن نہیں۔ جب تک ہم اپنی خودی کے سوتوں کو تلاش نہ کریں اور اُن کی قوت سے کام نہ لیں۔

میرے شرر میں بجلی کے جوہر   لیکن نیستان تیرا ہے نمناک!

تیرا زمانہ، تاثیر تیری
غافل نہیں یہ تاثیر افلاک

کامل وہی ہے رندی کے فن میں
مستی ہے جس کی بے منت تاک!

رکھتا ہے ابتک مے خانۂ شرق
وہ مے کہ جس سے روشن ہو اِدراک

اہل نظر ہیں یورپ سے نومید
اِن اُمتوں کے باطن نہیں پاک!

سید وحید اللہ وحید
(قادری)

اقبال حضور رسالتؐ میں

انسان کامل سے ان کا قلبی ربط اور نعت

در جہاں شمع حیات افروختی
بندگاں را خواجگی آموختی

(کائنات میں آپؐ ہی نے شمع حیات روشن کی، غلاموں کو سرداری سکھائی)

اُردو اور فارسی شاعری کے ہر دور میں نعت گوئی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ ان ہر دو زبانوں میں نعت شریف کا وافر ذخیرہ موجود ہے ہر دور کے چھوٹے بڑے شعرا بقدرِ ہمت اس سعادت میں شریک ہوتے رہے۔ دورِ حاضر کے شاعر اعظم علامہ اقبال نے بھی اپنی مخصوص عظمت کے شایان شان پورے جوش اور اخلاص سے اس میں حصہ لیا۔ اس لحاظ سے بھی کہ وہ مشرق کے شاعر اعظم تھے اس اعتبار سے بھی کہ وہ انسانیت کا پیغام پہنچا رہے تھے۔ ان کا یہ "پیام انسانیت"

. . . . ناقص رہجاتا اگر ان کا تصورِ انسانِ کامل تک رسائی حاصل نہ کرتا۔

علامہ اقبال کو ذاتِ رسالتمآب ؐ سے غیر معمولی عشق و محبت تھی۔ ان کے حکیمانہ دل و دماغ نے یہ محسوس کر لیا کہ حبّ نبوی ؐ کے بغیر سارا علم و عمل حجاب ہی حجاب ہے کیونکہ انسانیت کی حقیقی تعمیر کے لئے جس فکر و عمل کی ضرورت ہے اس کا مرجع اور مرکز ذاتِ رسالتمآب ؐ ہی ہے۔

ایں ہمہ از لطفِ بے پایاں تو
فکرِ ما پروردۂ احسان تو

(سب کچھ آپ ؐ کی عنایت بے پایاں ہی سے حاصل ہوا ہماری فکر آپ ؐ کی آغوشِ احسان کی پروردہ ہے)

علامہ اقبال کا یہ حُبّ اُن کے ترقی پذیر کلام کے ساتھ ساتھ تدریجاً نکھرتا اور ترقی کرتا گیا تا آنکہ جب اُن کا کلام انتہائی بلندیوں پر پہنچا تو ان پر مقاماتِ "نبوتِ کبریٰ" بھی اسی لحاظ سے منکشف اور منفتح ہوئے یہی وجہ ہے کہ جب حضور ؐ کا نام مبارک یا ذکرِ مبارک کسی کی زبان پر آجاتا تو اُن کی آنکھیں بے اختیار اشک آلود ہو جاتیں۔ اُن کی زندگی کے آخر کا ذکر ہے کہ "یوم اقبال" کے موقع پر مولوی اسلم صاحب جیراجپوری نیاز حاصل کرنے کے لئے گئے تھے۔ وہ اپنی اس ملاقات کا ذکر "جامعہ" میں یوں کرتے ہیں "دوسرے دن ہم ڈاکٹر اقبال سے ملے جو ہمارے منتظر تھے (۹) بجے تھے سلسلہ گفتگو ۱۲½ بجے تک رہا۔ امسال حج کی شرکت کا ارادہ رکھتے تھے مگر بیماری اور کمزوری کی حالت یہ تھی کہ کوٹھی سے باہر نکلنا مشکل تھا۔ کہتے تھے کہ میں دو سال سے ارادتاً سفرِ حج میں ہوں بلکہ وہ اشعار بھی لکھ لئے ہیں جو سفر سے متعلق ہیں۔ اُن میں سے کہیں کہیں کچھ سنایا بھی مکہ سے مدینہ کی روانگی کے وقت ایک غزل لکھی ہے جس میں اللہ کو مخاطب کر کے

کہتے ہیں ؎

تو باش اینجا و با خاصان بیامیز
کہ من دارم ہوائے منزل دوست

یہ شعر سناتے ہی گریہ ایسا گلوگیر ہو گیا کہ آواز بند ہو گئی اور آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔" ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعر بالکل آیۃ اِنَّ اللّٰہ وَمَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ علی النبی۔ (بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبیؐ پر درود بھیجتے ہیں) کے اِستغراق کا پُرکیف اِحساس ہے۔

نعت کے پاکیزہ موضوع پر علامہ اقبال کی مستقل نظمیں موجود ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف نظموں، رباعیوں اور غزلوں میں کہیں جستہ جستہ اور کہیں مسلسل شعر بھی پائے جاتے ہیں۔ اِسی سرمایۂ نجات و فلاح میں ایسے ایسے دُرِ شہوار موجود ہیں کہ آیندہ اہل دل اور اہل نظر کسب ضیا کریں گے۔ ملاحظہ ہو۔

"عندلیبِ باغِ حجاز" اپنے سینائے دل کی فضاؤں میں گرمِ پرواز ہو کر بارگاہِ صمدیت میں یوں شرفِ مخاطب حاصل کرتا ہے ؎

شکر شکوے کو کیا حسنِ ادا سے تو نے
ہم سخن کر دیا بندوں کو خدا سے تو نے

بارگاہِ قدس سے اپنے حبیبؐ کی صفت و ثنا میں ڈوبی ہوئی ندا آتی ہے۔ ؎

خیمۂ افلاک کا اِستادہ اِسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اِسی نام سے ہے
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمدؐ سے اُجالا کر دے

ذکرِ نبیؐ کی ابدیت اور رفعت کی نوید سنائی جاتی ہے ؎

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رفعنالک ذکرک دیکھے

اقبال کوئے حبیبؐ کا سکندر دماغ گدا ہے ماشاءاللہ کیا شان گدائی ہے کہ شوکتِ سلاطین اُس کا طواف کرے۔ ؎

کرم اے شہ عرب و عجم کہ کھڑے ہیں منتظر کرم
وہ گدا کہ تو نے عطا کیا ہے جنھیں دماغ سکندری

سبحان اللہ کیا سرفرازی ہے کہ فرشتے بارگاہِ رسالت میں لئے جاتے ہیں یہ "عندلیب باغ حجاز" یوں مخاطبت کی عزت حاصل کرتا ہے۔ ؎

کہا حضورؐ نے اے عندلیب باغ حجاز
کلی کلی ہے تری گرمیٔ نوا سے گداز

اقبال کا قلب صافی آٹھوں پہر سرخوش "جام ولائے محمدؐ" ہے اس کی شکست اور فتادگی غیرت وہ سجدہائے نیاز ہے۔ ؎

ہمیشہ "سرخوشِ جام ولا" ہے دل تیرا
فتادگی ہے تری غیرتِ سجودِ نیاز

حضور رسالتمآبؐ میں آبگینۂ دل نذر میں پیش کرتا ہے۔ جس میں امت کی آبرو اور طرابلس کے شہیدوں کا خون چھلک رہا ہے۔

چھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

حضرت صدیق اکبرؓ جن کا سینۂ آتش عشق و محبت کا مجمر تھا۔ ایک دن سارا سرمایۂ روزگار حضور نبویؐ میں خدمت اسلام کے لئے پیش کرتے ہیں اُن کے

احساس فدائیت کی ترجمانی حضرت اقبال کی زبان سے سُنیئے۔

اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعث تکوینِ کائنات
پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسُول بس

حضرت بلالؓ جن کی فطرت "نورِ نبوت" سے "مستنیر" تھی اُن کے بیتاب جان و دل کا بیان کیا خوب ہوا۔

نظر تھی صورت سلمان اداشناس تیری
شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تیری

حضرت بلالؓ کو مثل کلیم نظّارے کا سودا تھا۔

تجھے نظارہ کا مثل کلیم سودا تھا
اویس طاقت دیدار کو ترستا تھا

ادائے دید کے پردہ میں "نیاز" و "نماز" کی یکجائی کا نقشہ کس خوبی سے کھینچا ہے۔

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری
کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری

اشتیاقِ دید کی سعادت میں اقبال کا دِل کس درجہ شریک ہے اس کا اندازہ کیجیئے۔

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اس کا
خوشا وہ دور کہ دیدار عام تھا اُس کا

سیرۃ طیبہ میں معراج ایک مہتم بالشان حقیقت ہے اس کا فیضان

بقدر ظرف و ہمت ہر مسلم پر عام ہے۔

رہ اک گام ہے ہمت کے لئے عرش بریں
کہہ رہی ہے یہ مسلماں سے معراج کی رات

"نکتۂ معراج بہر سراپردۂ جان" ہے جس نے اس نکتہ کو سمجھا رفعتِ نظر کی ثریا اس کا ہدف بنی۔

ناوک ہے مسلمان ہدف اس کا ثریا
ہے سِرّ سراپردۂ جاں نکتۂ معراج

جس نے اس نکتہ کو نہ سمجھا اس کا مدوجزر چاند کا محتاج رہا تو معنی والنجم نہ سمجھا تو عجب کیا ہے تیرا مدوجزر ابھی چاند کا محتاج ہے۔ کہیں ملّت مرحومہ کی تباہ حالی پر اقبال بارگاہِ روح نبوی ﷺ میں عرض کرتے ہیں۔

شیرازہ ہوا ملّت مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے
اِس راز کو اب فاش کر اے روحِ محمدؐ
آیات الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

اُوپر عرض کیا گیا ہے جوں جوں اقبال کا ربطِ محبت ذات نبوت سے بڑھتا گیا اُن کے قلب مجلّیٰ پر مقامات نبوت کا انفتاح ہوتا گیا یہاں تک کہ انا من نور اللّٰہ کل خلقھم من نوری (میں اللہ تعالیٰ کے نور سے ہوں اور تمام مخلوق میرے نور سے) کے جاودانی کیف و سُرور کو اقبال کی بصیرت نے پالیا اور اُن کی یہ بصیرت اس قدر بلند ہوئی کہ بصارت پر چھا گئی۔ اب وہ خودی کی خلوتوں میں کبریائی اور اس کی جلوتوں میں مصطفائی کا تماشا بے حجاب کرنے لگے۔

خودی کی جلوتوں میں مصطفائی
خودی کی خلوتوں میں کبریائی

ظاہرش ایں جلوہ ہائے دل فروز
باطنش از عارفاں پنہاں ہنوز

اس موضوع پر نسبتاً علامہ اقبال کی فارسی نظموں میں نہایت لطیف اور نازک مضامین زیادہ آئے ہیں ان سب کا احاطہ اس موقع پر ناممکن ہے اس لئے فارسی کے چند شعر پیش کر کے مضمون ختم کئے دیتے ہیں۔

حضور کا ظہور، زندگی کا شباب ہے آپ کے جلوے کے بغیر زندگی ایک خواب بے تعبیر ہے۔

اے ظہور تو شباب زندگی
جلوہ ات تعبیر خواب زندگی

حضور کے ظہور نے کائنات کے مدارج بلند و بالا کر دئے۔ آپ کی دولت فقر نے کائنات کو ابدی حقایق کا سرمایہ دار بنا دیا۔ فقر محمدی کو سرمایۂ کائنات کہنا حقیقت کی کتنی پاکیزہ تعبیر ہے۔

از تو بالا پایۂ ایں کائنات
فقر تو سرمایۂ ایں کائنات

حقیقی فقر و شاہی اسی ذات کے فیضان سے ہے۔ یہ ساری تجلیاں اسی جلوے کی دریوزہ گری سے مالا مال ہیں:۔

فقر و شاہی واردات مصطفیٰ
این تجلیہائے ذات مصطفیٰ

"انیت کبریٰ" حضور کا مقام خصوصی ہے۔ اس مقام تک رسائی انسان کا

کمال اور معراج ہے۔ حضور کا آشکارا دیدار اور حضور کی حقیقت کا واضح ادراک ہماری سیر اور معراج کا منتہا ہے اور ہم حضور کے ضمیر پاک میں اپنی مسجد اقصیٰ (انتہائی مقام عبدیت) پا لیتے ہیں۔

آشکارا دیدنش اسرائے ما
در ضمیرش مسجد اقصائے ما

قندھار میں حضور کے خرقۂ مبارک کی زیارت کے بعد اقبال کے حیات کا ارتعاش اور جذبات کا تلاطم دیکھئے۔

رقص در اندر سینۂ اَم زور جنوں
تا ز راہ دیدہ می آید بروں

بوئے پیرہنِ پاک سے اُن کی مشام جان معطر ہو جاتی ہے تو یہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔

آمد از پیراہن او بوے او
داد مارا نعرۂ اللہ ہو

آپ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت بلالؓ کے سرود محبت کا مرانی سے محظوظ ہو چکے ہیں اب ذرا ابوجہل کے نوحۂ ہزیمت و شکست کو بھی گوش گزار فرمائیے عہد جاہلیت کے افکار و عادات کے خلاف اسلام نے وحدت، اخوت، مساوات وغیرہ کی جو تعلیم دی ہے وہ متکبر مخالفین کے خیال میں فضل عرب کی تباہی کا باعث تھی۔ ابوجہل اس پر نوحہ کرتا ہے۔ خصوصیات اور محاسن اسلام کا ذکر ابوجہل کے نوحہ میں نعت گوئی کا نادر پیرایہ ہے۔

منہ سے ثمر سے اقرار خیر کا مشاہدہ کیجئے۔

سینۂ ما از محمد داغ داغ
از دمِ او کعبہ را گل شد چراغ

اپنے تصورِ جہالت کے خلاف آوازے بوجہل کا دل و دماغ ٹھکانے نہیں اس لئے سارا معاملہ سحر ہی سحر نظر آتا ہے۔

ساحر و اندر کلامش ساحری
ایں دو حرف لا الٰہ خود کافری

حالات سے پریشان ہو کر کائنات کو انتقام پر آمادہ کرتا ہے۔

پاش پاش از ضربتش لات و منات
انتقام از وے بگیرائے کائنات

اس کا خیال ہے کہ حقیقت میں غائب سے وابستگی خطا ہے جو چیز چشم محسوس سے اوجھل ہے وہ معدوم ہے۔

دیدہ بر غائب فرو بستن خطا است
آنچہ اندر دیدہ می ناید کجا است

اِسلام نے ملک و نسب، فضل و شرفِ خاندانی کی پرستش پر پانی پھیر دیا ایک ممتاز قریشی کے ہاتھوں قبائلی اور نسلی بت کی شکست اس کے لئے حیرت انگیز ہے۔

مذہب او قاطع ملک و نسب
از قریش و منکر از فضل عرب

اسلام نے آقا و غلام رنگ و ملک کا اِمتیاز مٹا دیا، مساوات کے خلاف عادت عمل اس کے اِحساس تکبر پر ایک کاری ضرب ہے۔

در نگاہِ او یکے بالا و پست
با غلام خویش بر یک خواں نشست

حضرت اقبالؒ کا جس قدر کلام نعت میں ہے وہ اِس قدر بلند وسیع اور کثیر ہے کہ ایک ہی صحبت میں سب کا سب پیش نہیں کیا جا سکتا انشاء اللہ کسی اگلی صحبت میں اِس کی تکمیل ہو سکے گی۔ ؎

فروزاں ہے سینہ میں شمعِ نفس
مگر تابِ گفتار رکھتی ہے بس



مترجمہ احمد اللہ خاں
ایم۔ اے

تعلیماتِ اقبال

از مولٰنا محمد علی مرحوم

دسمبر ۱۹۱۶ء کا زمانہ تھا کہ ہمارے دوست (جو پیشہ اور علم کے اعتبار سے ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم، اے، پی، ایچ، ڈی، بیرسٹرایٹ لا کے نام سے موسوم ہیں) کے پاس سے یکے بعد دیگرے دو پتلی جلدیں وصول ہوئیں۔ گو ان کی وصولی کا درمیانی وقفہ زیادہ نہ تھا، تاہم ایسی نادر اور پر اثر تصانیف کا انتظار میرے لئے صبر آزما تھا۔

دیگر لاکھوں ہندی مسلمانوں کی طرح جو واقف ہونے کے باوجود اقبال سے ناواقف تھے، میں بھی برسوں سے "اقبال" کو جانتا تھا اور کچھ عرصہ سے جب کبھی مجھے کسی کام پر لاہور جانا پڑتا تو میں اُن کا مہمان ہوتا اور دیکھتا کہ وہ وکالت صرف اُسی حد تک کرتے کہ اُن کے حُقّہ کا معمولی خرچ نکل سکے۔ باقی وقت وہ اپنے پسندیدہ اَدبیات اور فلسفہ کے مطالعہ اور

زیادہ تر اُس پُر اثر شاعری میں صرف کرتے جس کے ذریعہ وہ ہندی مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کر رہے تھے۔

جبکہ دوسروں کو اقبال کی فطانت و ذہانت سے آگاہی حاصل کئے برسوں گزر چکے تھے میں نے اقبال کا ایک شعر بھی نہ پڑھا تھا، البتہ میں اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہوں کہ جب یکبارگی اقبال کے کلام نے مجھے مسحور کیا تو میں نے ایک حد تک مافات کی تلافی کی اور یہ اس طرح کہ اُردو رسالوں اور اخباروں میں ان کا جو کلام شایع ہوتا اس کو بار بار پڑھتا اور میرا اخبار (ہمدرد) پڑھنے والے اقبال کا کلام پڑھ کر جو مسرت محسوس کرتے میں اُن کی مسرت میں شریک ہوتا۔ میر کو مستثنیٰ کئے بغیر غالب (جو غالباً اُردو زبان کا سب سے بڑا شاعر ہے اور جو خود میر کی برتری کا معترف ہے) کے اشعار اردو صحافت میں کبھی اس قدر زیادہ نہیں پیش کئے گئے جتنا کہ کامریڈ میں۔ لیکن اَب کامریڈ اور ہمدرد کے کالم اقبال کے اشعار سے مزین ہونے لگے جو غالباً غالب کے انتقال کے بعد پیدا ہوئے۔

بحیثیت شاعر اقبال بیسویں صدی کے ہند میں اسلامی نشاۃ الثانیہ کے علمبردار تھے اور اسلامی ہند اس پنجابی گوشہ نشین اور شرمیلے بیرسٹر سے زیادہ کسی اور کا ممنون نہیں۔ اردو داں دُنیائے اسلام کا کوئی گھر ایسا نہیں جو اقبال سے ناواقف ہو اور بلا شبہ میں ان کا قدرداں اور عاشق تھا۔ اگر کسی نے اقبال سے عقیدت رکھنے میں مجھ سے برابری کی بلکہ مجھ سے بازی لے گیا وہ میرے بھائی (شوکت علی) تھے جو اپنی تقاریر میں اس والہانہ وارفتگی کے ساتھ جو ان کو اقبال کے کلام سے تھی اُن کے اشعار اس کثرت سے استعمال کرتے کہ میں جذبۂ رشک کو دبانے کی تمام کوششوں کے باوجود

اُن کا مذاق اڑاتا کہ وہ اپنی بے جان فصاحت و بلاغت سے سامعین کے جوش و خروش کو بیدار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکتے اگر وہ اقبال کے اشعار اس کثرت سے اِستعمال نہ کرتے۔

لیکن جب اُنھوں نے دیکھا کہ اس دفعہ اقبال نے اپنی مثنوی فارسی میں لکھی ہے جس کے لئے اُنہیں اور مجھے اس فارسی کی تحصیل کو تازہ کرنے کی ضرورت تھی جو ہم نے برسوں پیشتر اپنے لال داڑھی والے ملا صاحب سے رامپور کے مکتب میں کی تھی تو اُنھوں نے زور و شور کے ساتھ اپنی ناراضگی کا اِظہار فرمایا بہر حال ہم نے اقبالؒ کی اسرار خودی پڑھنی شروع کی اور بتدریج ان کا غصہ فرو ہونے لگا کیونکہ ہم نے محسوس کیا کہ اقبال کی یہ مثنوی ان کے گزشتہ کلام سے کہیں زیادہ بلند پایہ ہے اور اس کے ذریعہ وہ دنیائے اسلام کے ایک بڑے حصہ تک اپنی آواز پہنچا سکتے ہیں جو اُردو کے ذریعہ ممکن نہ تھا۔ اُن کے آتش فشانی اُردو کلام کے مقابلہ میں ابتداءً ان کی مثنوی بے جان اور سرد معلوم ہوئی لیکن جونہی ابتدائی باب ختم ہوا جس میں اُنھوں نے اپنے فلسفہ کا موضوع پیش کیا ہے اور اپنے مشرقی مطالعہ کنندگان کے آگے پرانی اِصطلاحات کے نئے معنوں کی وضاحت کی ہے اور جس کے بعد وہ بجائے پی، ایچ، ڈی کے شاعر کے روپ میں جلوہ گر ہوئے ہیں، ہم نے محسوس کیا کہ مرمر کی مورتوں میں بھی زندگی کا سیلِ آتش دوڑنے لگا ہے۔ کامریڈ کی ضمانت کے مقدمے میں جب مجھے متعدد مرتبہ لاہور جانا پڑا تھا تو میں نے اُن کی زبان سے انکی مثنوی کے بعض حصے سُنے تھے جبکہ وہ لکھی جا رہی تھی۔ لیکن جس طرح کہ قرآن مجید کے معاملہ میں ہوا تھا یہاں بھی میں سامنے کے درختوں کو دیکھ کر پیچھے کے عظیم الشان صحرا کا اندازہ نہ لگا سکا تھا، لیکن جوں جوں میں آگے بڑھتا گیا بتدریج پورا خاکہ

میری نظروں کے سامنے آ آ گیا اور میری خوشی کی کوئی اِنتہا نہ تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ فلسفی شاعر اپنے اَنوکھے انداز میں اِسلام کے انہی بنیادی حقایق کو پیش کرتا ہے جن کا خود میں نے یہ تمام مشکل ادراک کیا تھا۔

یہاں میں یہ واضح کر دوں کہ اسلامی ادبیات میں یہ چیز عام طور پر بیان کی جاتی ہے کہ اسلام کے معنے خدا کو کائنات کا حاکم مطلق تسلیم کرنا اور اس کی مرضی کے آگے اپنی گردن جھکا دینا ہیں۔ لیکن ہمارے مقتدایان دین کی نظر میں یہ بات اِتنی معمولی تھی کہ وہ اسے درخورِ اِعتنا نہ سمجھتے تھے اور ہم اس کی کنہہ سے بالکلیہ لاعلم ہونے کے باوجود یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ گویا پوری طرح واقف ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کی حقیقت ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی اور ضرورت تھی کہ نئی قوت اور پورے زور کے ساتھ اس کی اصل حقیقت سے لوگوں کو واقف کرایا جائے۔ اس امر کے لئے کہ مسلمان مقصدِ زندگی سے آگاہ ہو کر سچے مسلمانوں کی زندگی بسر کریں پورے منظر کو تبدیل کرنے کی ضرورت تھی اور یہی حقیقت تھی جس کا میں نے اپنے طور پر ادراک کیا تھا اور اسی نقطۂ نظر کو لئے اقبال پھر ایک دفعہ مسلمانوں کے ذہنوں پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے تاکہ حکومت الٰہیہ قائم ہو سکے۔ پیش پا افتادہ اِقدار میں تبدیلی کی ضرورت کا اندازہ اس وقت مشکل نہیں ہوتا جبکہ دوسری جلد (رموز بیخودی) میں اِقبال حلف لیکر بیان کرتے ہیں کہ ان کا لفظ لفظ قرآنی تعلیمات پر مبنی ہے نہ کہ جرمنی فلسفہ پر ——— جیسا کہ علماء نے خیال کرنا شروع کیا تھا۔

اقبال کی دوسری مثنوی رموز بیخودی اس شاہراہ کو نشان زد کرتی ہے جس کی زمین ہموار کرنے کا کام اُن کی پہلی مثنوی اسرار خودی نے کیا تھا۔

اور اب منزل مقصود کا پالینا ایک اندھے کے لئے بھی دشوار نہ تھا۔ جب تک ایک متعین مقصد کے ذریعہ راستہ صاف نہ کیا جائے اقبال کے نقطہ نظر سے زندگی ایک صحرا ہے اور خود آگہی یعنی خودی کی حقیقت کو پالینا گویا زندگی کے مقصد کو پالینا ہے۔ یہی وہ مشیت الٰہی ہے جس کے لئے حکومت الٰہی کا کائنات پر ظہور رہوا۔ جب ایک دفعہ آدمی مقصد حیات اور کائنات کی مخلوقات میں جاری و ساری مشیت الٰہی کو پالیتا ہے تو درمیانی تمام مزاحمتیں تاراج ہو جاتی ہیں حقیقی انا (خودی) کا ادراک اور اقرار گویا غیر حقیقی انا کا نابود کرنا ہے اور زندگی کی الجھنیں اپنی ناگزیر جنگ جوئی کے ساتھ اِسلام کے دیرپا امن عامہ کے دامن میں عافیت پاتی ہیں۔ اِسلامی پیغام اور اس کے دستور اخلاق کے اہم خدوخال کی تشریح کرتے ہوئے اقبال نے بھی قومیت کی مذمت کی ہے جو اِنسانی ہمدردیوں کے حلقہء اثر کو محدود کر دیتی ہے اور نوع اِنسانی میں تفریق و تشتت کا باعث ہوتی ہے۔

غلام دستگیر رشید
ایم۔ اے

اقبال در حضورِ آدم

اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

اقبال نے اپنے ایسے آثار چھوڑے ہیں کہ اُن کی شخصیت بڑی حد تک اُن میں جھلکتی ہے اور محرومی کا گلہ کسی قدر سرد ہو جاتا ہے۔ اُن کی صحبت میں ادب، حکمت، مذہب اور تاریخ کی بڑی بڑی حقیقتیں لطیف اور موثر شخصی کیفیتیں بن کر نکلتی ہیں۔ آہستہ آہستہ صحبت آشنا کی آنکھیں کھلتی جاتی ہیں اور سر جھکتا جاتا ہے۔ اُن کا فلسفہ و کلام، علم اور عشق کی دو آنکھوں کا ایک نور ہے۔

ایک دن حضرت اِقبال اپنی کوٹھی میں بیٹھے تھے۔ ایک جرمن یا آسٹرین سیّاح آیا اور قریب ہمہ تن گوش ہو بیٹھا اِقبال کی خدمت میں اپنی ایک بیاض پیش کی جس میں ہر ملک و قوم کے بڑے بڑے لوگوں نے اپنے قلم سے کچھ نہ کچھ لکھا تھا۔ اُس نے درخواست کی کہ ڈاکٹر صاحب بھی اس پر کچھ لکھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ایک فارسی قطعہ لکھدیا۔ پھر اُس سیاح نے پوچھا "آپ کس چیز کی تعلیم دیتے ہیں؟"

اقبالؒ نے جواب میں فرمایا "میرے آباؤ اجداد برہمن تھے۔ انھوں نے اپنی عمریں اِس سوچ میں گذار دیں کہ خدا کیا ہے؟ میں اپنی عمر اس سوچ میں گذار رہا ہوں کہ انسان کیا ہے"؟ یہ نکتہ، فکرِ اقبالؒ کی ایک کنجی ہے کہ ؎

غلامِ ہمّتِ آن خود پرستم
کہ از نورِ خودی بیند خدا را

انسانی تہذیب و تربیت کا جو نظام اقبالؒ نے پیش کیا ہے اُس کی بنیاد یہی اِنسانیت کا اِحترام اور اس کی حفاظت ہے اپنے وصال سے پہلے لاہور ریڈیو اِسٹیشن سے اُنھوں نے نوروز کے موقع پر جو پیام نشر کیا تھا وہ اُن کے اِسی خیال کی ترجمانی کرتا ہے۔ اُن کے اپنے الفاظ یہ ہیں:۔

"دورِ حاضر کو علومِ عقلیہ اور سائنس کی عدیم المثال ترقیات پر بہت بڑا فخر و ناز ہے اور یہ فخر و ناز بلاشبہ حق بجانب ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن اِن تمام ترقیات کے باوجود ملوکیّت کے جبر واِستبداد نے جمہوریت، قومیّت، فسطائیت خدا جانے اور کیا کیا نقاب اوڑھ رکھے ہیں اور اِن نقابوں کے نیچے دُنیا بھر کے گوشوں میں قدرِ حریّت اور شرفِ اِنسانیت کی وہ مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخِ عالم کا کوئی تاریک سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کرسکتا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یاد رکھو انسان کی بقا کا راز اِنسانیت کے اِحترام میں ہے۔ جب تک تمام دُنیا کی تعلیمی طاقتیں اپنی توجہ کو محض اِحترامِ اِنسانیت کے درس پر مرتکز نہ کردیں گی۔ یہ دُنیا بدستور درندوں کی بستی بنی رہیگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اِن واقعات سے صاف ظاہر ہے کہ قومی وحدت بھی ہرگز قائم و دائم نہیں۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوعِ اِنسان کی وحدت ہے۔ جو نسل، زبان، رنگ و قوم سے بالاتر ہے۔ جب تک اِس نام نہاد 'جمہوریت'، اِس ناپاک قوم پرستی

اور اس ذلیل ملوکیت کی لعنتوں کو پاش پاش نہ کر دیا جائے گا۔ اُس وقت تک انسان اپنے عمل کے اعتبار سے "الخلق عیال اللہ" کا قائل نہ ہوگا۔ جب تک جغرافیائی وطن اور نسل و رنگ کا امتیاز نہ ہٹ جائے گا انسان اس دنیا میں فوز و کامرانی کی زندگی بسر نہ کر سکے گا۔ اور اخوت، حرّیت اور مساوات کے الفاظ کبھی شرمندۂ معنیٰ نہ ہوں گے۔ آؤ اس نئے سال کو اس دعا پر ختم کریں کہ خدائے بزرگ و برتر اربابِ حکومت و اقتدار کو انسان بنائے اور انھیں انسانیت کی حفاظت کرنا سکھائے۔"

اجتماعی زندگی میں انسانیت کی حفاظت، بقار اور ترقی کے حقائق اور اصولِ اقبال نے اپنی کتاب "رموز بیخودی" میں بیان کئے ہیں۔ اگر ہم "اسرارِ خودی" پر غور کریں اور رموز بیخودی سے قطع نظر کریں تو فکر اقبال کا صرف ایک ہی پہلو سامنے ہوگا۔ رموز بیخودیٔ میں اجتماعِ انسانی کی صحیح تنظیم کا یہ راز بتاتی ہے بقول اقبالؔ "جماعتی زندگی اور ترقی حیات کا کمال یہ ہے کہ افرادِ قوم (یا مختلف اقوام و ملل) ایسے آئین کی پابندی سے جو مسلّم ہوں، اپنے ذاتی جذبات، میلانات، اور مفادات کے حدود مقرر کریں تاکہ انفرادی اعمال، یا قومی مفادات کا تناقص اور ان کی باہمی ٹکر مٹ کر اجتماعِ انسانی کے لئے ایک قلب مشترک پیدا ہو جائے۔ مقید اور محدود خودی اعلیٰ انسانی مقاصد کی تکمیل میں محو ہو جائے۔ اور انسان کے "اجتماعی انا" کا ظہور ہو سکے۔ رموز بیخودی میں تفصیلی بحث ہے کہ وہ آئینِ مسلّم کیا ہیں۔ ان کا سرچشمہ کیا ہے۔ ان کا عملی نمونہ کہاں پایا جاتا ہے۔

اپنے ایک بلند پایہ خطمیں اس حقیقت کی تشریح کے لئے ایک بلیغ مثال دی ہے کہ مسلمانوں کے انتہائی غلبہ اور طاقت کے زمانہ میں حبشہ کی

آزادی محفوظ رہی۔ لیکن مسولینی نے حبشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لئے پامال کیا تھا۔ فرق صرف اِس قدر رہے کہ مسولینی کی خودی کسی آئینِ مسلم کی پابند نہ تھی اور دوسری صورت میں خودی قانون الٰہی اور اخلاق کی پابند تھی۔ اِنسانیت کے اِجتماعی مفاد کی حفاظت اور اُس کے اِحترام کی یہی راہ ہے ؎

اصلِ تہذیب اِحترامِ آدم است

پروفیسر رشید احمد صدیقی

فلسفۂ بیخودی

ہر چیز ایک نظام کے ماتحت ہوتی ہے۔ ہماری زندگی فی الحقیقت علائق اور نسبتوں کی ایک نامتناہی زنجیر ہے۔ جز و کل کا ربط ناگزیر ہے۔ وہ ہر چیز جسے ہم انسانی زندگی سے تعبیر کرتے ہیں۔ تعینات مخصوصہ کا نام ہے اور تعین کا وجود تسلسل سے ہے افراد کا جماعت سے تعلق ہوتا ہے، جز کی بحث ہو چکی۔ اب کل کے ساتھ اُس کی نسبتوں پر نظر ڈالنی لازم آتی ہے، اِقبال نے اِس کا اعادہ ان الفاظ میں کیا ہے ؎

فرد و قوم آئینۂ یک دیگر اند
سلک و گوہر کہکشان و اختر اند

فرد می گیرد ز ملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلبت قلزم شود

فرد تنہا از مقاصد غافل ست
قوتش آشفتگی را مائل ست

ملت کا قیام اختلاط افراد پر ہے اور اس کی تعمیر و تکمیل نبوت سے ہوتی ہے، جماعت کا حقیقی مفہوم نفس نبوت کا ترجمان ہے ہر شئے خواہ وہ افراد سے متعلق ہو یا جماعت سے جب تک کوئی زندہ عقیدہ یا قانون اسے مربوط یا مستحکم نہ کرے، ربط کا کوئی حقیقی مفہوم پیدا نہیں ہوتا۔

تا خدا صاحبدلے پیدا کند
کو ز حرفے دفترے املا کند

ساز پردازے کہ از آوازۂ
خاک را بخشد حیاتِ تازۂ

زندہ از یک دم دو صد پیکر کند
محفلے رنگیں زیک ساغر کند

بندہا از پا کشاید بندہ را
از خداوندان رہاید بندہ را

گویدش تو بندۂ دیگر نہ
زیں بتانِ بے زباں کمتر نہ

تا سوئے یک مدعا کش می کشد
حلقۂ آئیں بپائش می کشد

ایک اسلامی شاعر ہونے کی حیثیت سے اقبال کے نزدیک اس عالم کی حقیقی نجات بالفاظ دیگر معاشرت کے تمام شعبہ جات کی کامیابی و کامرانی اسلامی اصول کی پابندی اور ان کے نفاذ سے وابستہ ہے۔ شاعری کا بڑا ر...

کام یہ ہے کہ وہ جذبات کو متاثر کرے اور ایک مذہب پرست کا شیوہ مذہبی عقاید کی ترویج و تلقین ہے وہ بھی اس طور پر کہ وہ اپنے عقاید کو محض عقائد کی حیثیت سے تسلیم کرائے۔ اِن نظریات کو ملحوظ رکھکر اقبال کی شاعری پر نظر ڈالی جائے تو یہ حقیقت محسوس ہوتی ہے کہ وہ باوجود شاعر اور مذہب پرست ہونے کے اِنسانی ذہن و فکر کے میلانات طبعی کو کبھی نظرانداز نہیں کرتے۔ وہ ارکانِ اِسلامی کی صداقت اور ہمہ گیری پر زور دیتے ہیں اِس لئے نہیں کر وہ خود مسلمان ہیں بلکہ محض اِس بنا پر کہ انسانی ذہن و فکر کا اِسلام سے اِنحراف کرنا ناممکنات سے ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اپنے شعر و شاعری میں الفاظ اور ترکیبیں تو ضرور شاعرانہ رکھتے ہیں لیکن بحث و اِستدلال ایک فاضل حکیم کی انداز سے کرتے ہیں۔ اِسلام کے ارکان اساسی میں توحید، رسالت، نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ کو مخصوص حیثیت حاصل ہے، آخرالذکر چار فرائض ایسے ہیں جو عمل سے متعلق ہیں، اقبال نے اُن کے فلسفہ پر خیالات ظاہر کئے ہیں لیکن پہلے دو حقیقتوں یعنی توحید اور رسالت پر رموزِ بیخودی میں نہایت شرح و بسط سے بحث کی ہے، توحید اور رسالت کا تعلق چونکہ معتقدات سے ہے اور یہیں سے دوسرے شعبہ جات کی ابتداء ہوتی ہے۔ اِس لئے اِقبال نے ان پر خصوصیت کے ساتھ بحث کی ہے، کیونکہ توحید اور رسالت کو دیگر ارکان اسلامی سے وہی تعلق ہے جو بقیہ دفعات قانونی کو تمہید یا "پری ایمبل" سے ہوتی ہے فرماتے ہیں ؎

اہلِ حق را رمزِ توحید از برست
در اِنّی الرّحمٰنِ عبداً مضمرست

دین از و حکمت از و، آئیں از و
زور از و، قوت از و، تمکین از و

اسود از توحید احمر می شود
خویش فاروقؓ و ابو ذرؓ می شود

ملت از یک رنگی دلہاستی
روشن از جلوهٔ این سیناستی

قوم را اندیشہا باید یکے
در ضمیرش مدعا باید یکے

جذبہ باید در سرشت او یکے
ہم عیار خوب و زشت او یکے

گر نباشد سوز حق در ساز فکر
نیست ممکن این چنیں انداز فکر

مدعائے ما مآل ما یکے ست
طرز و انداز خیال ما یکے ست

توحید ہی وہ حقیقت ہے جو انسان کو ان مکروہات سے محفوظ و مصئون رکھتی ہے جن میں اسیر ہو کر وہ زندگی کو پر آشوب تصور کرنے لگتا ہے۔ مایوس، محزوں یا مخوف ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یا تو انسان کو اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے یا پھر وہ کسی ایسے حکیم و قادر کا قائل نہیں ہے جو نہ کبھی غلطی کرتا ہے اور نہ کبھی ظلم گوارا رکھتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو یہہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے گی کہ خود اعتمادی کا اصلی راز بھی اسی عقیدہ

توحید میں مضمر ہے، ہم کو اپنے اُوپر اس لئے نہیں اعتماد ہے کہ ہماری قوت و حکومت کے ذرائع و وسائل نامحدود ہیں بلکہ اس کا باعث صرف یہ ہے کہ جہاں سے ہم قوت و قدرت حاصل کرتے ہیں وہ ایک ایسی ہستی اور حقیقت ہے جو کبھی غلطی یا زیادتی نہیں کرتی۔ اِس لئے جب تک ہم اِس حقیقت یا ہستی کی پیروی کرینگے ناکامیاب نہیں رہ سکتے۔ اقبال نے اس کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ؎

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزوست
زندگانی محکم از لَاتقنطوا ست

اے کہ در زندانِ غم باشی اسیر
از نبی تعلیمِ لَاتحزن بگیر

چوں کلیمے سوئے فرعونے رود
قلبِ او از لَاتخف محکم شود

بیم غیراللہ عمل را دشمن ست
کاروانِ زندگی را رہزن ست

بیم چوں بندست اندر پائے ما
ورنہ صد سیل ست در دریائے ما

ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلبِ تست
اصلِ او بیم ست اگر بینی درست

لابہ و مکاری و کیں و دروغ
ایں ہمہ از خوف میگیرد فروغ

ہر کہ رمزِ مصطفےٰ فہمیدہ است
شرک را در خوف مضمر دیدہ است

اسلام سے پہلے، انسانی ذہن و فکر کو وہ آزادی حاصل نہ تھی جسے آج ہم علم و تہذیب کا طرۂ امتیاز سمجھتے ہیں، انسان موجودات فطرت کی پرستش کرتا تھا اس لئے وہ کبھی اس پر جری نہ ہو سکا کہ ان کو اپنا تابع اور مسخر بنائے چاند، سورج، برق و باراں، پہاڑ، دریائیں. غرض کہ اس قسم کی تمام چیزیں اس کے نزدیک معبود کی حیثیت رکھتی تھیں. پھر یہ کس طرح ممکن تھا کہ وہ ان کا کسی طور پر تجزیہ کرتا یا ان پر قدرت حاصل کرنے کی جرأت کرتا اس سے ترقی کرکے انسان نے انسان کی پرستش شروع کی، اس کی مختلف صورتیں تھیں، کبھی اس نے اپنی ہی نوع کو مذہبی حیثیت سے قادر مطلق گردانا اور کبھی کسی جابر قہرمان کے آگے جھکا. اس کا ایک نہایت دل نشین خاکہ رموز بیخودی میں اقبال نے یوں پیش کیا ہے ؎

بود انساں در جہاں انساں پرست
ناکس و نابود مند و زیر دست

سطوتِ کسریٰ و قیصر رہزنش
بندہا در دست و پا و گردنش

کاہن و پاپا و سلطان و امیر
بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر

صاحب اورنگ و ہم پیرِ کنشت
باج بر کشت خراب او نوشت

در کلیسا اسقف رضواں فروش
بہر ایں صید زبوں دامے بدوش

برہمن گل از خیابانش ببرد
خرمنش بیخ زادۂ با آتش سپرد

از غلامی فطرتِ او دوں شدہ
نغمہ ہا اندر نئے او خوں شدہ

ایک دوسرے مقام پر اس کا اِعادہ یوں کیا ہے ؎

فکرِ انسان بت پرستے بتگرے
ہر زماں در جستجوئے پیکرے

باز طرحِ آذری انداختہ ست
تازہ تر پروردگارے ساختہ ست

کاید از خوں ریختن اندر طرب
نام او رنگ ست و ہم ملک و نسب

اگر غور کیا جائے تو اِسلام نے سب سے بڑی نعمت جو دُنیا کو تفویض کی وہ یہ ہے کہ ہر اِنسان علم و عمل کے لئے آزاد ہے اس طور پر بقول اِقبال اِسلام کو ایک وسیع علمی تحریک قرار دینا چاہیئے۔ یہ ایک حقیقت تھی جس کو اسلام سے قبل طرح طرح سے مستور رکھا گیا۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے اِس لئے اس نے اس حقیقت کو فطری ہی طور پر برافگندہ نقاب بھی کیا، اُس نے محض ایک مقولہ نہیں پیش کیا بلکہ ساتھ ہی ساتھ نمونہ بھی دُنیا کے سامنے لاکھڑا کیا اور وہ بھی اِس سہل اور سادہ انداز سے کہ معمولی سے معمولی عقل و تمیز بھی اس سے پوری طور پر آشنا ہو سکی۔ اِسلام کے خدا نے اسلام کا محض اپنے کلام و الہام سے اِعلان نہیں کیا بلکہ اس کو جناب رسالتمآبؐ کی ذات میں ثابت بھی کر دیا۔ رسالت مآبؐ کے وجود و حیات سے نہ صرف

یہ حقیقت واضح ہوئی کہ خدا کیا ہے بلکہ انسان کو کیا کرنا ہے اور جو کچھ کرنا ہے وہ کر بھی سکتا ہے، نظر برآں رسالت مآبؐ کی زندگی کو خدا سے وہی نسبت حاصل ہے جو انسانوں کو رسالتمآبؐ سے حاصل ہے۔ اِس لئے جہاں تک علم و عمل کا دخل ہے رسالت مآبؐ کی زندگی ہم انسانوں کے لئے خدا کی ذات و صفات سے زیادہ قریب، زیادہ قابل تقلید اور زیادہ ممکن العمل ہے۔ ممکن ہے اسی عقیدہ کا اظہار اقبال نے ان الفاظ میں کیا ہو ؎

معنی حرفم کنی تحقیق اگر
بنگری با دیدۂ صدیقؓ اگر

قوتِ قلب و جگر گردد نبی
از خدا محبوب تر گردد نبی

رسالت مآبؐ نے دُنیا کے سامنے جو دستور العمل اپنے نمونۂ زندگی سے پیش کیا ہے اس پر غور کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ "حریت" "مساوات" و "اخوت بنی نوع انسان" کی بنیاد اس کا نمونہ اور اس کا مقصود "رسالت محمدیہ" تھی، عالم انسان کی نجات ان ہی ہر سہ حقیقتوں کی تشکیل و تعمیم میں مضمر ہے۔ حریت نے ہر انسان کو انفرادی طور پر آزاد کیا، مساوات نے ان سب کو باعتبار فطرت ایک سطح پر لا کھڑا کیا اور پھر ان دونوں کو جس نے دُنیا کے لئے باعث رحمت و عافیت بنایا وہ "اخوت بنی نوع انسان" تھی۔
اسلام کے اصطلاحی اور محدود مفہوم سے قطع نظر کر لیا جائے تو اس کے تسلیم کرنے میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ ان صفات کے اعتبار سے اسلام زمان و مکان دونوں کی قید سے آزاد ہے۔ ممکن ہے یہی سبب ہو جس کی بنا پر

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد
بر رسولِ ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفلِ ایام را
او رسل را ختم و ما اقوام را
خدمتِ ساقی گری با ما گزاشت
داد ما را آخریں جامے کہ داشت
اِقبال کے زبان پر آیا ہو۔

حریت مساوات اور اِخوت کی بنا پر قومیّت کا جغرافیائی مفہوم
بالکل بے معنی ہو جاتا ہے "پین اِسلامزم" کا رمز ملک گیری میں نہیں بلکہ
"اِخوت بنی نوعِ انسان" میں مضمر ہے، ترکوں کا جدید رویہ جس کی بنا پر
اُنھوں نے جمہوریہ ترکی کو "وطنیت ترکیہ" پر قائم کیا ہے اس بنا پر صحیح نہیں
ہے کہ اُنھوں نے ترک یا ترکی اور اسلام کو دو مختلف حیثیتیں دیدی ہیں۔
عزل خلافت سے اُنھوں نے اِسلام کے مفہوم کو بھی مسخ کر دیا ہے۔ خلافت
کا کام یہ نہ تھا کہ اِسلام کے دینی اِقتدار کو دنیوی طاقت سے برقرار رکھا جائے بلکہ
اُس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ دنیوی اِقتدار کو اُن پابندیوں سے بے نیاز نہ ہونے
دیا جائے۔ جن سے آزاد ہو کر حکومت اور اس کی نعمتیں محض ایک ہی قوم اور
ایک ہی خطّہ تک محدود نہیں رہ جاتیں بلکہ دوسری اقوام اور دوسرے ممالک
کے لئے موجب آزار ہوتی ہیں۔ حکومت ترکی نے وطنیت ترکیہ کے قائم کرنے
میں یوں غلطی کی ہے کہ اُس نے نہ صرف اِسلام کی ہمہ گیری اور اُس کے فیض عام
کو ترکی تک محدود کر دیا اور شاید یہ بھی متیقن نہیں ہے۔ بلکہ ایک طور پر اُس نے
دوسرے اقوام کو بھی اِسلام کی خوبیوں سے بے خبر رکھنے کا اِرادہ کر لیا ہے

اِسلام صرف مسلمانوں کے لئے نہیں آیا ہے بلکہ یہ دوسرے اقوام اور دوسرے ممالک کے لئے بھی ایک پیامِ عمل و عافیت ہے، اِسلام صرف اسلامیوں کے لئے نہیں بلکہ بنی نوعِ اِنسان کے لئے ایک عام تبلیغ عمل ہے جس کو کسی صورت میں محدود نہیں کرنا چاہیئے۔[1] مِلتِ اِسلامیہ زمان و مکان دونوں قیود سے آزاد ہے اور یہی سبب ہے کہ اِسلام میں نسل و ملک کا کوئی مفہوم نہیں ہے

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست

ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست
رومی و شامی گِل اندامِ ماست

قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست
مرز و بوم او بجز اِسلام نیست

مسلم استی دل با قلیمے مبند
گم مشو اندر جہانِ چون و چند

می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم
در دلِ او یاوہ گردد شام و روم

عقدۂ قومیت مسلم کشود
از وطن آقائے ما ہجرت نمود

---

[1] مسلم استی بے نیاز از غیر شو
اہلِ عالم را سراپا خیر شو

حکمتش یک ملتِ گیتی نورد
بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد

ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم ست
ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم ست

صورتِ ماہی بہ بحر آباد شو
یعنی از قیدِ مقام آزاد شو

آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند
بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند

تا وطن را شمعِ محفل ساختند
نوعِ انساں را قبائل ساختند

مردمی اندر جہاں افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند

تا سیاست مسندِ مذہب گرفت
ایں شجر در گلشنِ مغرب گرفت

قصۂ دینِ مسیحائی فسرد
شعلۂ شمعِ کلیسائی فسرد

بادہ ہا خوردند و صہبا باقی ست
دو شہا خوں گشت و فردا باقی ست
در سفر یار ست و صحبت قائم ست
خود رہ گیر ست و ملت قائم ست
فرد بر می خیزد از مشت گلے
قوم زاید از دلِ صاحبدلے
گرچہ ملت ہم بمیرد مثل فرد
از اجل فرماں پزیرد مثل فرد
امت مسلم ز آیاتِ خدا ست
اصلش از ہنگامۂ قَالُوْا بَلٰی ست
از اجل این قوم بے پروا ستے
استوار از نَحْنُ نَزَّلْنَا ستے
سطوتِ مسلم بخاک و خوں تپید
دید بغداد آنچہ روما ہم ندید
تو مگر از چرخ کج رفتار پرس
زاں تو آئینِ کہن پندار پرس
آتشِ تاتاریاں گلزار کیست
شعلہ ہائے او گل دستار کیست
رومیاں را گرم بازاری نماند
آں جہانگیری جہانداری نماند

شیشۂ ساسانیاں درخوں نشست
رونقِ خمخانۂ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند
استخوانِ او تہِ اہرام ماند
درجہاں بانگِ اذاں بودست وہست
ملت اسلامیاں بودست وہست

ملت کی بنیاد اختلاط افراد پر ہے لیکن خود ملت کی شیرازہ بندی کے لیے بھی کسی آئین یا دستور کا وجود لازمی ہے۔ ایک ایسی ملت کے لیے جو تمام عالم کے لیے ابدالآباد تک ایک زندہ حقیقت کا درجہ رکھتی ہو ضروری ہے کہ اس کا آئین بھی اتنا ہی ہمہ گیر اور لازوال ہو، جیساکہ اس سے پہلے کہیں آ چکا ہے۔ افراد اور ملت دونوں کسی نہ کسی حد تک فنا پذیر ہیں لیکن مقصد حقیقی ان اسالیب عمل سے بلند و پائندہ تر ہوتا ہے، جس کی طرف اقبال نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے ؎

فصل گل از نسترن باقی ترست
از گل و سرو و سمن باقی ترست
کانِ گوہر پروری گوہر گرے
کم نہ گردد از شکستِ گوہرے

ملت اسلامیہ کا آئین قرآن مبین ہے۔ اقبال نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے ؎

نغمہ از ضبطِ صدا پیدا استی
ضبط چوں رفت از صدا غوغاستی

در گلوئے مانفس موج ہوا ست
چوں ہوا پابندِ نے گرد د نواست

تو ہمیں دانی کہ آئینِ تو چیست ؟
زیر گردوں سرِ تمکین تو چیست ؟

آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم
حکمت او لایزال ست و قدیم

حرفِ اورا ریب نے تبدیل نے
آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

نوعِ انساں را پیامِ آخریں
حاملِ او رَحْمَۃً لِّلْعَالَمِیْنَ

آنکہ دوشش کوہ بارش برنتافت
سطوتِ او زہرۂ گردوں شگافت

بنگر آں سرمایۂ آمالِ ما
گنجد اندر سینۂ اطفالِ ما

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآں زیستن

اسی سلسلے میں اقبال نے ایک نہایت نازک لیکن اتنا ہی معرکتہ الآرا مسئلہ بھی پیش کیا ہے جس پر اس زمانہ میں صبر و ایمانداری کے ساتھ غور کرنا اتنا ہی ناممکن معلوم ہوتا ہے جتنا یہ ضروری بھی ہے، یعنی زمانہ انحطاط میں تقلید اجتہاد سے بہتر ہے:

آج بیرونی اثرات کے سیلاب اور مذہبی ناواقفیت (جس میں علم د

عمل دونوں کا فقدان ہے) نے ہر شخص کو اس پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ اسلام کی تعلیم پر نظرِ ثانی کرے۔ کسی مسئلے پر مجتہدانہ انداز سے نظر ڈالنا قابل اعتراض نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ آج اجتہاد کے علم بردار کہے جاتے ہیں اُن کے میلاناتِ ذہنی یا اِستعداد علم وعمل کا تجزیہ کیا جائے تو حسب ذیل قوتیں برسرِ کار نظر آئیں گی جن کے موجود ہوتے ہوئے یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ ان نام نہاد اجتہادیوں کا طرزِ عمل صحیح نہیں ہے:۔

(۱)۔ عام طور پر یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب ہر حال میں مفید اور قابل تقلید ہے، اس وقت زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو تہذیب یورپ کو اسلام سے ہم آہنگ کرنا چاہتے ہیں۔ بعض ایسے مسلمان مصنفین جو یورپین تہذیب اور خیالات سے باخبر کہے جا سکتے ہیں یا کہے جاتے ہیں، اپنے سامنے یہ حقیقت رکھکر آگے بڑھتے ہیں کہ جو کچھ اس وقت یورپ میں تہذیب وتمدن کے اعتبار سے مفید اور بہتر خیال کیا جاتا ہے وہ اِسلام کی تاریخ اور تہذیب سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔ یہ اُصول غلط بھی ہے اور خطرناک بھی۔

(۲) اکثر ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ جو لوگ اِسلام کے بعض اُصول کو کسی طور پر کمزور یا قابل اصلاح سمجھتے ہیں وہ خود اپنے علم وعمل کے اِعتبار سے جامع نہیں کہے جا سکتے۔ جب تک اِسلام اور مغربی اصول دونوں کا صحیح اور مکمل تجربہ نہ ہو اس وقت تک کسی قسم کی ترمیم یا تنسیخ پیش کرنا صحیح نہ ہوگا۔

(۳)۔ یورپ کو اس وقت ایک حکمران کی حیثیت حاصل ہے۔ اس لئے اس کو وہ سب فطری سہولتیں حاصل ہیں جو اس کے تہذیب

وتمدن کو مقبول بنا سکتی ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ جہاں خالص اسلامی شریعت نافذ ہے وہاں اسلامی اصول کا نفاذ کہاں تک مفید یا مکمل ہے۔ اس سلسلہ میں ہم کو افغانستان کی مثال سامنے رکھنی پڑے گی۔ لیکن اندیشہ ہے کہ بعض حضرات ترکی کی مثال پیش کرنا زیادہ اہم سمجھیں گے، اب تک ترکوں یا کمالیوں کا اس بارۂ خاص میں جو رویہ رہا ہے۔ اُسے ملحوظ رکھتے ہوئے بے تامل کہا جا سکتا ہے کہ ترکی سلطنت صحیح معنوں میں سلطنت اسلامیہ نہیں ہے بلکہ محض سلطنت یا "وطینت ترکیہ" کی حیثیت رکھتی ہے۔ ترکی نے جو نیا ورق پلٹا ہے اس کا کچھ ہی سبب کیوں نہ ہو جن اسباب یا واقعات کی بنا پر اس نے اتنا زبردست انقلاب روا رکھا ہے وہ اسلام یا خلافت کی کوتاہیوں یا زیادتیوں کے سبب سے نہ تھا بلکہ اس کی اصلی وجہ خلفائے عثمانیہ یا دولت عثمانیہ تھی۔

(۵) انحطاط کے زمانہ میں قوائے جسمانی و ذہنی دونوں پژمردہ ہو جاتے ہیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسلاف کے کارنامے اپنے نظروں میں ناقابل رسائی معلوم ہونے لگتے ہیں، انسانی فطرت دشوار پسندی اور اولوالعزمی سے فطری طور پر کنارہ کش رہنا چاہتی ہے، قوم اور افراد دونوں فاتح کی حیثیت حاصل کرنے کی بجائے فاتحین کی ہم رکابی و ہمنوائی زیادہ پسند کرنے لگتے ہیں۔ اقبال نے اس حالت میں تقلید کو اجتہاد سے بہتر بتایا ہے ؎

عہد حاضر فتنہا زیرِ سر است
طبع ناپروائے او آفت گر است
بزم اقوامِ کہن برہم ازو

شاخسارِ زندگی بے نم از و
جلوہ اش ما را ز ما بیگانہ کرد
ساز ما را از نوا بیگانہ کرد
از دلِ ما آتشِ دیرینہ بُرد
نور و نارِ لَا اِلٰہ از سینہ بُرد
راہِ آبا رو کہ این جمعیت ست
معنیٔ تقلید ضبطِ ملت ست
اِجتہاد اندر زمانِ انحطاط
قوم را برہم ہمی پیچد بساط
ز اِجتہادِ عالمانِ کم نظر
اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر

جس طور پر ہر عمل کا کوئی خاص مقصد ہوتا ہے خواہ یہ انفرادی ہو یا اجتماعی اِسی طور پر ملت اسلامیۂ محمدی کا ایک نصب العین ہے اور وہ "حفظ و نشر توحید" ہے۔ افراد کو جو قوت جماعت کی شکل میں نمودار کرتی ہے وہ کسی مخصوص مقصد کی تبلیغ یا تشکیل ہے اگر ایسا نہ ہو تو افراد اور جماعت کبھی ایک دوسرے سے وابستہ نہ ہو سکیں اس لئے "جمعیت" کا مدار کسی مخصوص نصب العین کی تعمیر و تعمیم پر ہے لیکن "حقیقی جمعیت" اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب نصب العین بھی ہر طور پر مکمل و مستحسن ہو، اس عالم حیات کا اصلی راز تبلیغ توحید میں مضمر ہے اور چونکہ اِسلام کو دین فطرت ہونے کا دعویٰ ہے اس لئے مقصد بھی اِتنا ہی عالمگیر اور مقدس ہے ؎

ہمچو جاں مقصود پنہاں در عمل
کیف و کم از وے پزیرد ہر عمل

گردشِ خونے کہ در رگہائے ماست
تیز از سعیِ حصولِ مدعاست

صد نیستاں کاشت تا یک نالہ رست
صد چمن خوں کرد تا یک لالہ رست

نالہ ہا در کشت جاں کاریدہ است
تا نوائے یک اذاں بالیدہ است

نقطہ ادوار عالم لا الٰہ
انتہائے کار عالم لا الٰہ

زانکہ در تکبیر رازِ بود تست
حفظ و نشر لا الٰہ مقصودِ تست

جلوہ در تاریکیِ ایام کن
آنچہ بر تو کامل آمد عام کن

لرزم از شرمِ تو چوں روز شمار
پرسدت آں آبروئے روزگار

حرفِ حق از حضرتِ ما بردہٗ
پس چرا با دیگراں نہ سپردہٗ

حیاتِ انسانی کے تمام افعال و مشاغل باعتبار تعینات ہمیشہ متشکل ہوتے رہتے ہیں اور یہ محض اس لئے کہ مزید سعی و کوشش کے لئے ایک نمونہ سامنے ہو اور یہ معلوم ہوتا رہے کہ ہر سعی و حرکت کس طور پر اور کہاں تک

بار آور ہوئے اور جو کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے کیا وہ اس پایہ کی ہے کہ اس کے لئے مزید کوشش کی جائے یا اس کے قائم رکھنے میں مزید تگ و دو روا رکھی جائے۔ گویا ہر مزید کوشش ابتدائی کوشش کے لئے ایک سندِ جواز ہے۔ اس طور پر گویا زندگی کی یہ سعی بہیم ایک مقصد و مرکز کے لئے ہے۔ حیاتِ ملیہ کے لئے ضروری تھا کہ کوئی "مرکزِ محسوس" ہو، ملتِ اسلامیہ کا مرکز "بیت الحرام" ہے، اقبال نے اس تفصیل و تخصیص کی طرف یوں اشارہ کیا ہے ؎

در گرہ چوں دانہ دارد برگ و بر
چشم بر خود وا کند گردد شجر

خلعتے از آب و گل پیدا کند
دست و پا و چشم و دل پیدا کند

ہمچناں آئینِ میلادِ امم
زندگی بر مرکزے آید بہم

حلقہ را مرکز چو جاں در پیکر ست
خطِّ او در نقطۂ او مضمر ست

قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے

راز دار و راز ما بیت الحرام
سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرام

دعوئے او را دلیل استیم ما
از براہینِ خلیل استیم ما

در جہان مارا بلند آوازہ کرد
با حدوثش ما قدم شیرازہ کرد

تو ز پیوند حریمے زندۂ
تا طوافِ او کنی پائندۂ

در جہاں جانِ امم جمعیت ست
در نگر سرِّ حرم جمعیت ست

عبرتے اے مسلمِ روشن ضمیر
از مآلِ امت موسیٰؑ بگیر

داد چون آن قوم مرکز را ز دست
رشتۂ جمعیت ملت شکست

آج یورپ کی جو چیز ہم کو سب سے زیادہ قابل رشک معلوم ہوتی ہے وہ اس کے فرزندوں کی "تسخیر قوائے نظام عالم" ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جہاں تک قوائے نظام عالم کو مسخر کرنے کا تعلق ہے یورپ کی ترقی بہر نوع عظیم بالشان ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اِس حقیقت سے آشنا ہیں یا آشنا ہونا پسند کرتے ہیں کہ جو ترقیاں علم و عمل کی آج نظر آ رہی ہیں اُن کی آج سے بہت پہلے مسلمانوں نے یورپ میں ابتدا کی تھی۔ یورپ کو جو برکات مسلمانوں سے حاصل ہوئیں اُن کے شمار کرانے کا یہ موقع نہیں ہے، اس کا اعتراف خود اہل یورپ کر چکے ہیں مسلمان اکثر اس حقیقت پر غور نہیں کرتے کہ وہ عام عالم اسلام پر اس وقت جو انحطاط رونما پاتے ہیں وہ اِسلام کے اساسی تعلیمات کے سبب سے نہیں ہے بلکہ اس کا باعث مسلمان خود ہیں۔ مسلمانوں سے پہلے یہ تعلیم کسی

مذہب نے نہیں دی ہے کہ یہ سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، دریا، آبشار، برق و باد پرستش کے لیے نہیں ہیں، بلکہ انسان کے تابع کئے گئے ہیں اور وہ اس کے ذہن و فکر اور قوتِ عمل کی مختلف وسیع جولانگاہیں ہیں۔ اسلام تو ایک شریعت عمل تھا ہم نے اس کو یا تو متکلمین و معتزلہ کی ورزش دماغی سمجھ لیا یا پھر جاہل مولویوں یا واعظوں کا وسیلہ رزق۔ قوائے عالم کی تسخیر ڈرائینگ روم کی لطیف معصیتوں یا تکفیر کے فتووں سے نہیں کی جا سکتی اس کے لئے ضرورت تھی محنت اور قربانی کی جس سے ہم آج بھی بہت دور ہیں۔ ہم تو دوسروں کے ثمرۂ محنت سے مستفید ہونا ہی اپنا ایک بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ ہماری بڑی غلطی یہ ہے کہ ہم اسلام کی تعلیم کو محض "راہ نجات" یا "بہشتی زیور" کی تعلیم سمجھنے لگے ہیں، حالانکہ قرآنِ پاک ایک زندہ جاوید پیغام عمل ہے جس سے منحرف رہ کر مسلمان ہی نہیں کوئی قوم دنیا میں زندہ یا کامیاب نہیں رہ سکتی۔ حیات ملیہ اسلامیہ کا مقصد اسرارِ حیات کو اس طور پر بے نقاب کرنا ہے کہ دنیا میں امن و کامرانی کے امکانات وسیع ہوتے رہیں۔ اس لئے حیات ملی کے لئے لازم ہے کہ اس کا مقصد عین تسخیر قوائے نظامِ عالم ہو، اقبال نے اس کی تبلیغ یوں کی ہے ؎

اے کہ با نادیدہ پیماں بستۂ
ہمچو سیل از قیدِ ساحل رستۂ

چوں نہال از خاک ایں گلزار خیز
دل بغائب بند و از حاضر ستیز

ماسوا از بہر تسخیر ست و بس
سینۂ او عرضۂ تیر ست و بس

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد
عالمے از ذرۂ تسخیر کرد

کوہ و صحرا، دشت و دریا، بحر و بر
تختۂ تعلیم اربابِ نظر

نائبِ حق در جہاں آدم شود
بر عناصر حکمِ او محکم شود

آنکہ بر اشیا کمند انداختست
مرکب از برق و حرارت ساختست

علم اسما اعتبارِ آدم است
حکمتِ اشیا حصارِ آدم است

افراد کے سلسلے میں خودی کی بحث انھیں صفحات پر کہیں آچکی ہے اس لئے اس کا تذکرہ تحصیل حاصل ہوگا، جس طور پر افراد کے لئے اِستحکام خودی ضروری ہے اسی طور پر حیات ملیہ کے لئے بھی " احساس خودی" لازمی ہے، جہاں تک ان اصول وعقائد کا تعلق ہے جن کے حفظ، تعمیم و تشکیل کا وسیلہ ملت اِسلامیہ ہے یہ بحث اس سے پہلے آچکی ہے کہ ہماری حیات کا مقصد اور اس کا دارومدار لا اِلٰہ پر ہے لیکن امت کو جو نسبت رسول سے حاصل ہے وہ کئی حیثیت سے اہم ہے۔

خدا نے بعثت نبوی میں سب سے بڑا راز یہ رکھا ہے کہ وہ جو کچھ ہم بندوں سے کرانا چاہتا ہے اس کا ہم بندوں ہی میں سے نمونہ بھی پیش کر دیتا ہے تاکہ ہم اس کو اپنے لئے محض ایک آسمانی کرشمہ نہ سمجھیں جو بندوں کی فہم وادراک یا اُن کے سعی عمل سے بالا ہو۔ بلکہ ایک ممکن العمل

حقیقت تصور کریں۔ ٹھیک اسی طور پر ملّت کی ترقی و بقا کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم محض عقائد مجردہ کی علم برداری کرتے رہیں بلکہ ان روایات کا احترام کریں اور اس کو برقرار رکھیں جو ہمارے برگزیدہ اسلاف نے اپنے عمل سے ہمارے سامنے پیش کئے ہیں اقبال نے اس کی تفصیل و توضیح ایک نوزائیدہ بچّے سے کی ہے جو ابتدائے ہر شئے سے ناآشنا ہوتا ہے اور جس کا

بستہ با امروز او فرداش نیست
حلقہ ہائے روز و شب در پاش نیست

چشم ہستی را مثال مردم ست
غیر را بینندہ و از خود گم ست

رفتہ رفتہ :-

صد گرہ از رشتۂ خود وا کند
تا سرِ تارِ خودی پیدا کند

گرم چوں افتد بکارِ روزگار
ایں شعورِ تازہ گردد پائدار

نقشہا بردارد و انداز داد
سرگزشتِ خویش را می ساز داد

اسی طور پر :-

قوم روشن از سواد سرگزشت
خود شناس آمد زیادِ سرگزشت

سرگزشتِ او گر از یادش رود

باز اندر نیستی گم می شود

چشم پرکارے کہ بیند رفتہ را
پیش تو باز آفریند رفتہ را

ضبط کن تاریخ را پایندہ شو
از نفسہائے رمیدہ زندہ شو

سر زند از ماضی تو حالِ تو
خیزد از حالِ تو استقبالِ تو

مشکن از خواہی حیاتِ لازوال
رشتۂ ماضی ز استقبال و حال

موجِ ادراکِ تسلسل زندگی ست
می کشاں را شورِ قلقل زندگی ست

موجودہ زمانہ میں ہر حقیقت کی سند جواز یا عدم جواز یورپ سے حاصل کی جاتی ہے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یورپ کے اصول یا اس کے فیصلے نقائص یا غلطیوں سے مبرا ہوتے ہیں۔ بلکہ آج وہ فاتح کی حیثیت رکھتا ہے اور اپنے حوارئیین کو ممتاز اور مخالفین کو سرنگوں کرنے کے قابل ہے، ہم آج یہ نہیں دیکھتے کہ ہم میں کیا خوبیاں ہیں بلکہ یورپ کے بعض صریح نقائص کو بھی چاہتے ہیں کسی طور پر مستحسن ثابت کرسکیں قطع نظر دیگر مسائل کے جن کو معرض بحث میں لانا طوالت سے خالی نہیں ہے۔ ایک مسئلہ خواتین کی تعلیم حقوق اور آزادی کا ہے، یہاں اس سے بحث نہیں کہ یورپ نے عورتوں کو کیا سمجھ یا بنا رکھا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسلام نے عورتوں کا جو درجہ مقرر کیا ہے وہ ہماری نظروں میں کیا وقعت رکھتا ہے۔ تعدادِ ازدواج،

پردہ اور اس قسم کی اور چیزیں جو ہم روشن خیالوں کے لئے نہایت روح فرسا ہیں اور مغرب کے لئے جب "حلف وفاداری" اٹھاتے ہیں تو سب سے پہلے ہماری نظر عورت ہی پر پڑتی ہے اس کے بعد کوئی تعجب نہیں کہ اگر مذہب بھی زد میں آجائے۔ نام نہاد روشن خیال طبقہ کے کارناموں پر نظر ڈالی جائے یا اُن کی میلانات کا تجزیہ کیا جائے تو یہ حقیقت روشن ہو جائے گی کہ ان میں سے ہر ایک کی نظر صرف دو نقائص پر پڑتی ہے، ایک مذہب دوسری عورت۔ لیکن لطف، عبرت یا تعجب یہ ہے کہ یہی دو چیزیں ہیں جو شرق بالخصوص اسلام کے امتیازات خصوصی ہیں، اسلام نے عورت (بالفاظ دیگر امومت) کو کیا درجہ دیا ہے۔ اقبال کے حسب ذیل خیالات سے ظاہر ہوگا ؎

پوشش عریانیِ مرداں زن ست
حسن دل جو عشق را پیراہن ست
آنکہ ناز د بر وجودش کائنات
ذکر او فرمود با طیب و صلوٰۃ
ملت از تکریم ارحام ست و بس
ورنہ کار زندگی خام ست و بس
بر دمد ایں لالہ زارِ ممکنات
از خیابانِ ریاضِ اُمہات
حافظ رمز اخوت مادراں
قوتِ قرآن و ملت مادراں

اقبال نے نساءِ اسلام کے لئے سیدۃ النساءؑ کو "اسوہ کاملہ" قرار دیا ہے ؎

نورِ چشم رحمۃ للعالمین
آں امامِ اوّلین و آخریں

بانوئے آں تاجدارِ ھَل اَتیٰ
مرتضیٰ مشکل کشا شیرِ خدا

مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق
مادرِ آں کارواں سالارِ عشق

مزرعِ تسلیم را حاصل بتول
مادراں را اسوۂ کامل بتول

آں ادب پروردۂ صبر و رضا
آسیا گرداں و لب قرآں سرا

مثنوی کے اس حصّے کو اقبال نے انتہائے جوشِ عقیدت سے لکھا ہے جس کے ایک ایک حرف سے والہانہ شیفتگی کا اظہار ہوتا ہے موجودہ زمانہ میں تہذیب و شائستگی کے نام سے اس پیکرِ ناموس و عفت کے ساتھ جیسا کچھ سلوک روا رکھا جا رہا ہے، اقبال نے اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے ؎

اے ردایت پردۂ ناموسِ ما
تابِ تو سرمایۂ فانوسِ ما

اے امینِ نعمتِ آئینِ حق
در نفسہائے تو سوزِ دینِ حق

دورِ حاضر تر فروش و پرفن ست
کاروانش نقدِ دیں را رہزن ست

کورویزداں ناشناسِ ادراکِ او
ناکساں زنجیرِ پیچاکِ او

چشمِ او بیباک و ناپرواستے
پنجۂ مژگانِ او گیراستے

ہوشیار از دستبردِ روزگار
گیر فرزندانِ خود را در کنار

ایں چمن زاداں کہ پر نکشادہ اند
ز آشیانِ خویش دور افتادہ اند

فطرتِ تو جذبہ ہا دارد بلند
چشمِ ہوش از اسوۂ زہرا بلند

تا حسینے شاخِ تو بر آورد
موسمِ پیشیں بہ گلزار آورد

خاتمۂ مثنوی پر اقبال نے سورۂ اخلاص (قل ھو اللہ) کی تفسیر دی ہے اور اُسے "خلاصۂ مطالب مثنوی" قرار دیا ہے "ھو اللہ احد" کا پیغام حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے زبان مبارک سے یوں دیا ہے ؎

آں کہ نامِ تو مسلماں کردہ است
از دوئی سوئے یکی آوردہ است

خویشتن را ترک و افغاں خواندۂ
وائے بر تو آنچہ بودی ماندۂ

صد ملل از ملتے انگیختی

بر حصارِ خویش شبخوں ریختی
یک شود توحید را مشہود کن
غائبش را از عمل موجود کن

اِسی طور پر دیگر آیات شریفہ کی ترجمانی کی ہے ؎

گر بہ اللہُ الصمد دل بستۂ
از حدِ اسباب بیروں جستۂ
بندۂ حق بندۂ اسباب نیست
زندگانی گردشِ دولاب نیست
راہ دشوار ست ساماں کم بگیر
در جہاں آزاد زی آزاد میر
خود بخود گردد درِ میخانہ باز
بر تہی پیمانگانِ بے نیاز

فارغ از ابؑ و ام و اعمام باش
ہمچو سلماں زادۂ اِسلام باش
گر نسب را جزوِ ملت کردۂ
رخنہ در کارِ اخوت کردۂ
رشتۂ ما یک تولّایش بس ست
چشمِ ما را کیف صہبائے بس ست
ہر کہ پا دربندِ اقلیم وجد ست
بے خبر از "لم یلد لم یولد" ست

رشتۂ "با لحریکن" باید قوی
تا تو در اقوام بے ہمتا شوی

آں کہ ذاتش واحدست و لاشریک
بندہ اش ہم در نہ سازد با شریک

مومن بالائے ہر بالا ترے
غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

خوار از مہجوری قرآں شدی
شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی

آخر میں اقبال نے "رَحْمَةً لِّلْعَالَمِيْن" کے حضور میں "عرض حال" کیا ہے ؎

اے ظہورِ تو شباب زندگی
جلوہ اَت تعبیر خواب زندگی

در جہاں شمع حیات اَفروختی
بندگاں را خواجگی آموختی

مسلم از سرِّ نبی بیگانہ شد
باز ایں بیت الحرام بت خانہ شد

از منات و لات و عزائے و ہبل
ہر یکے دارد بتے اندر بغل

اے کہ از احسانِ تو ناکس کس ست
یک دعایت مُزد گفتارم بس ست

عرض کن پیشِ خدائے عز و جل
عشق من گردد ہم آغوش عمل

ہست شان رحمت گیتی نواز
آرزو دارم کہ میرم در حجاز

تا بیا ساید دلِ بے تاب من
بستگی پیدا کند سیماب من

با فلک گریم کہ آرامم نگر
دیدۂ آغاز انجامم نگر

خانصاحب محمد مشتاق
علیخاں

نظمِ اقبال پر اک اجمالی تنقید

اقبال کی نظم نہ شاعری ہے۔ نہ بصیغۂ مبالغہ ساحری جس کا زیر و بم ایک ہنگامی تلاطم کے سوا کچھ بھی نہیں۔ بلکہ اقوام عالم کے لئے ایک پیام زندگی ہے جسے بانگ سروش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ "شمع اور شاعر" کے مکالمہ میں اقبال خود کہتا ہے:۔

کہہ گئے ہیں شاعری جزویست از پیغمبری
ہاں سُنا دے محفلِ ملت کو پیغام سروش

اقبال کی شاعری کو تین حصوں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دَور مشق سخن کا زمانہ ہے۔ جس میں رنگا رنگ دلاویزیاں موجود ہیں۔ مگر یہاں بھی زندگی اور زندہ دلی کا عنصر غالب اور خودی و خودداری کا رنگ نمایاں ہے۔ لیکن جس چیز نے اقبال کو بین الاقوامی شہرت بخشی۔ وہ اسکی

فارسی مثنوی ہے۔ جس میں وہ ایک ہادیٔ برحق اور رہبر کامل کی صورت میں جلوہ گر ہوا ہے۔

ابتداء میں ایک ہی مثنوی مدنظر تھی۔ جس کے متعلق ۱۹۲۰ء میں علامہ مرحوم نے خود فرمایا تھا۔ کہ اس کی تکمیل کے بعد میں یہ سمجھونگا۔ کہ میرا مقصد زندگی ختم ہوچکا۔ مگر کارفرمائے قضا و قدر کو اقبال سے بہت کام لینا منظور تھا۔ اِس لئے بجائے ایک کے دو مثنویاں عالم وجود میں آئیں اور "اسرار خودی" و "رموز بیخودی" کے بعد ہی "پیام مشرق" بھی طلوع ہوا۔ علاوہ ازیں اور بھی کئی کتابیں عالم وجود میں آئیں۔ جو ایک دوسری سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔

"اسرار خودی" اور "رموز بیخودی" کا اقبال ایک پختہ کار شاعر، نبض شناس حکیم اور رہبر کامل کے لباس میں جلوہ نما ہوا ہے۔ اسے اس کی شاعری کا دوسرا دَور تصور کرنا چاہیئے۔ لیکن "پیام مشرق" سے تیسرے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جس میں وہ تمام ممالک مشرقی کی نمایندگی کرتا ہے۔ اور ازاں بعد منازل ارتقاطے کرتا کرتا اُس مقام محمود پر پہنچ جاتا ہے۔ جہاں سے تمام اجزائے کائنات ایک کُل کی صورت میں نظر آتے ہیں۔

"پیام مشرق" کی اشاعت پر پروفیسر آرنلڈ کا ایک ناقدانہ مضمون کسی انگریزی اخبار میں میری نظر سے گزرا تھا۔ جس میں "پیام مشرق" پر ایک عالمانہ تنقید کی گئی تھی۔ اور بعض اشعار کو انگریزی کا جامہ پہنایا گیا تھا اس وقت یہ شعر مجھے بہت پسند آیا تھا ؎

اے برادر من ترا از زندگی دادم نشاں
خواب را مرگ سبک دوں۔ مرگ را خواب گراں

یعنی خواب کیا ہے۔ ایک ہلکی سی موت! اور مرگ کیا ہے۔ ایک گہرا خواب!!

اس کے علاوہ پروفیسر صاحب نے ان دو شعروں کو بھی اپنی زبان میں نظم کیا تھا ؎

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا
نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و با موجش در آویز
حیات جاوداں اندر ستیز است

اِن اشعار کی شان نزول یہ ہے۔ کہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں جبکہ تحریکِ خلافت اور کانگریس اپنے شباب پر تھی۔ کلکتہ کے ایک انگریزی اخبار "جان بل" میں ایک کارٹون شائع ہوا جس میں ایک حسین عورت کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اُسے "مادرِ ہند" کے نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ اس کے آگے دوسری تصویر تھی جس پر "مسٹر گاندھی" لکھا تھا۔ یہ عورت آنکھیں بند کئے گاندھی جی کے پیچھے تھی۔ اور گاندھی سے آگے سمندر اور چٹان تھی۔ تصور یہ پیش کیا گیا تھا کہ بھارت ماتا اندھا دھند مہاتما گاندھی جی کے پیچھے لگی ہوئی ہے جس کا لازمی نتیجہ یہی ہونا ہے۔ کہ یا تو وہ سمندر میں غرق ہو جائے۔ یا چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جائے۔

اخبار "زمیندار" کے ایک رکنِ ادارہ نے یہ تصویر علامہ مرحوم کو دکھائی اسے دیکھ کر آپ نے مذکورۂ بالا دو شعر موزوں کئے۔ اور فرمایا کہ اسی تصویر کے ساتھ انھیں "زمیندار" میں شائع کر دو۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اَرباب ذوق سمجھ سکتے ہیں کہ مضمون کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ مگر اُس وقت ہم

سمجھے تھے کہ ان شعروں میں صرف ایک ہنگامی کیفیت ہے۔ لیکن جب پروفیسر آرنلڈ کی نظر انتخاب نے انھیں اپنی تنقید کے لئے منتخب کیا۔ تو مجھے اِس "ہردم تازہ" کلام کی اہمیت محسوس ہوئی۔ اور آج بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ویسا ہی محرک و موثر ہے۔

اقبال کی تازہ ترین مطبوعات "بال جبریل" اور "ضرب کلیم" ہیں جو تیسرے دور کی پختگی کا پتہ دیتی ہیں۔ جس کی ابتداء "پیام مشرق" سے ہوئی۔ اب اقبال شاعری یا پیغمبری نہیں بلکہ تیراندازی کرتا ہے۔ اور جو کچھ کہتا ہے۔ بالکل اسی طرح کہہ جاتا ہے۔ جس طرح کہ وہ خود محسوس کرتا ہے گویا ایک واردات قلب ہے۔ اور قال نہیں۔ بلکہ حال ہے۔ یا یوں کہیئے کہ زبان و قلب کا وصل ہو چکا ہے۔ اِس لئے جو بات نکلتی ہے۔ وہ جذبات کو بھڑکانے اور روح کو گرمانے والی ہے۔ جس میں نہ کوئی تمہید ہے نہ تکلف و تصنع۔ سیدھی بات سیدھے تیر کی طرح دل میں اُتر جاتی ہے۔ اور اب اس کا روئے سخن تمام دنیا اور کل بنی نوع انسان کی طرف ہے۔

"بال جبریل" اور "ضرب کلیم" میں اقبال نے زندگی اور لوازم زندگی، رازِ حیات اور فلسفہ مرگ کے مسائل حل کئے ہیں، اقوام عالم سے خطاب کیا ہے، نوجوانوں کو درس زندگی دیا ہے۔ طالب علم اور مسلم دونوں کے لئے مشعل ہدایت تیار کی ہے، درویشی و تونگری، فقر و سلطنت اور سرمایہ داری و مزدوری کی کیفیت کو بے نقاب کیا ہے۔ جمہوریت کی عقدہ کشائی کی ہے۔ اور معرکۂ عشق و عقل سے زمینِ شعر کو گلرنگ کیا ہے۔ غرض کوئی شے نہیں جو یہاں حاضر نہ ہو۔

طالب علموں اور نوجوانوں کے لئے اقبال کی دعا ہے ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کردے

ایک جگہ نوجوانوں کی رگ ہمت و تدبیر کو یہ کہکر بھڑکایا ہے ؎

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے اُن کو اپنی منزل آسمانوں میں

یعنی اگر نوجواں آزادیٔ فکر و ضمیر سے ہمکنار ہو جائیں۔ تو نظرِ ہمت اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ آسمان کو اپنی زمین تصور کریں۔

موجودہ مدارس و مکاتب کے خود فراموش اثرات کا رونا ان الفاظ میں رویا ہے ؎

یہ بتانِ عصرِ حاضر، کہ بنے ہیں مدرسوں میں
نہ ادائے کافرانہ نہ تراشِ آذرانہ

یعنی اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یہاں خدا پرستی کی بجائے بت پرستی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مگر رونا اس بات کا ہے کہ بتوں کی تراش نہ آذری ہے نہ برہمنی۔ بلکہ صرف حکام پرستی اور خود فراموشی کے بت گھڑے جاتے ہیں۔ جو نوجوانوں کو گھر اور گھاٹ دونوں سے کھو دیتے ہیں۔

ایک جگہ اِرشاد ہوا ہے ؎

شکایت ہے مجھے یا رب! خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

"خداوندانِ مکتب" میں مدرس، معلم، انسپکٹر، ڈائرکٹر اور

منتشر سبھی شامل ہیں۔ اقبال کو ان سب سے یہی شکایت ہے کہ اولادِ آدم کو مفلوج و محکوم بنا دینے کی تعلیم دیتے ہیں۔ حالانکہ انسان کے بچے تمام عالم کو مسخر کرنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ بھلا یہ کیا انصاف و دیانت ہے کہ شاہین و عقاب کے بچوں کو زمین پر رینگنا سکھایا جائے اور انسان کے بچوں کو ہر باطل قوت کے آگے سر جھکانے کی تعلیم دی جائے۔

پھر کہتا ہے۔ بلکہ تنبیہ کرتا ہے ؎

وہ فریب خوردہ شاہیں کہ پلا ہو کرگسوں میں

اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسمِ شاہبازی

یعنی وہ بچہ شاہین جو گدھوں میں پرورش پاکر بڑا ہوا ہو۔ اُسے شاہبازی کے طریقوں سے کیا واقفیت ہو سکتی ہے۔ پس یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ جن نوجوانوں نے مدرسہ میں غلامی اور محکومی پر قناعت کرنے کی تعلیم پائی ہے اُن سے جہانبانی اور کارفرمائی کی توقع کی جائے!

مسلم ہندی یا بالفاظ صحیح تر قوم مغل کے لئے اقبال کا فتویٰ یہ ہے ؎

نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کے لئے

وہ قوم جس نے گنوایا ہو تاجِ تیموری

یہ فطرت انسانی ہے کہ اگر کسی کی حقیر سے حقیر شئے بھی کوئی بزور قوت لینا چاہے۔ تو وہ اس کی حفاظت میں اپنی جان لڑا دیتا ہے۔ بلکہ پہلے سے تدابیر تحفظ کر لیتا ہے۔ لیکن اگر وہ اس کی حفاظت و نگہداشت ہی نہ کر سکے تو اس پر قابض و متصرف رہنے کا اہل نہیں۔ اور نا اہل شخص یا افراد قوم ہرگز درخورِ اعتبار نہیں۔ اِس لئے جو قوم تاج و تخت تیموری جیسی بیش بہا دولت کی حفاظت نہیں کر سکی۔ اس کا کوئی دعویٰ صحیح نہیں ہو سکتا۔ پس اگر

یہ قوم یا کوئی فرد قوم امارت کا دعویٰ کرے تو اسے بھی تسلیم نہ کرو۔ اور فقر کی دعویٰ دار ہو تو اسے بھی جھٹلا دو۔ کیونکہ درویشی کی اہل بھی وہی قوم ہو سکتی ہے، جو سلطنت کی اہل ہو۔

"خواجگی" کے عنوان سے اقبال نے چند نہایت بلیغ شعر قلمبند کئے ہیں ؎

دورِ حاضر ہے حقیقت میں وہی عہدِ قدیم
اہلِ سجادہ ہیں یا اہلِ سیاست ہیں امام

اس میں پیری کی کرامت ہے نہ میری کا ہے زور
سینکڑوں صدیوں سے خوگر ہیں غلامی کے عوام

خواجگی میں کوئی مشکل نہیں رہتی باقی
پختہ ہو جاتے ہیں جب خوئے غلامی میں غلام

یعنی دورِ حاضر اور عہدِ قدیم میں کوئی فرق نہیں۔ کیونکہ اب بھی چند مذہبی اجارہ دار اور چند سیاسی ٹھیکیدار تمام دنیا پر مسلط ہیں۔ اور انسانی ہمت و تدبیر کو نشوونما سے روکے ہوئے ہیں۔ مگر اس میں سیاست کے دعویٰ داروں یا خرقہ پوشوں کی قابلیت کو مطلق دخل نہیں۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ بندگانِ خدا کا، اَثر غلامی قبول کرنا فطرت ثانیہ بن گئی ہے۔ اس لئے پیروں کو مرید اور صاحب اقتدار لوگوں کو فرماں بردار بندے خود بخود مل جاتے ہیں۔ اور کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ یہ اندر سے ٹھوس ہیں۔ یا کھوکھلے۔ پس جس طرح زمانۂ قدیم میں خود ساختہ معبودوں اور مفروضہ خالقوں کی پرستش ہوتی تھی۔ اسی طرح اب اکابر و عناصر کی پرستش کی طرف رجحان ہے۔ گویا عوام الناس بلکہ خواص تک کی خوئے غلامی اتنی پختہ ہو گئی ہے کہ اب اس میں نہ پیر کی کرامت کو دخل ہے

نہ ہیر کی سیاست دانی کو۔ بلکہ لوگ از خود ان کی طرف جھکے چلے آتے ہیں۔ پس زمانۂ جاہلیت اور زمانہ حال میں کوئی فرق باقی نہیں رہا۔

"ہنرورانِ ہند" کے عنوان سے چار شعر اس طرح لکھے ہیں:۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل اُن کا
اُن کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار

موت کی نقش گری اُن کے صنم خانوں میں
زندگی سے ہنر اِن برہمنوں کا بیزار

چشمِ آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہی سوار

ایک فاضل علوم مشرقی و مغربی اب سے پندرہ بیس سال پیشتر مجھ سے فرمانے لگے۔ کہ جب شیکسپیر سے لوگوں نے کہا کہ تم یاس انگیز افسانوں پر اپنا زور طبیعت کیوں نہیں دکھاتے تو اس نے جواب دیا کہ میں اس طرز تحریر سے اس لئے گریز کرتا ہوں کہ اسے ایکٹر سٹیج پر نبھا نہیں سکتے۔ شکسپیر کا یہ قول دہرانے کے بعد وہ صاحب کہنے لگے کہ اگر یاس انگیز افسانوں کا سٹیج پر ادا کرنا دشوار ہے تو ان کا لکھنا دشوار تر ہے پھر یہ کیا بد مذاقی ہے کہ ہندوستانی افسانہ نویس بد انجام افسانے ہی لکھتا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ شیکسپیر اور انگلستان کے متعلق تو یہ قول درست ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ہندوستانی فسانہ نگار نیک انجام افسانے لکھیں تو وہ اس حد تک بھی کامیاب نہیں

ہو سکتے۔ جس حد تک کہ بدانجام انسانوں میں کامیاب ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہر ہندوستانی کی زندگی بجائے خود ایک داستان درد ہے۔ اور وہ اپنے حسب حال ہی بہتر لکھ سکتا ہے۔ دوسرے غلامی اور محکومی نے بقول اقبال اُسے زن مزاج بنا رکھا ہے۔

اقبال کا یہ شکوہ بالکل بجا ہے کہ ہندوستانی سنگروں، شاعروں، مصوروں اور ریاست دانوں تک کے اعصاب پر عورت سوار ہے! اور سب کے سب تابوت بردوش ہی نظر آتے ہیں۔

"نوبل پرائز" حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر ٹیگور، جاپان بھی گئے تھے وہاں آپ ایک مجمع میں اپنی ویدانت بیان کر رہے تھے۔ تو اس وقت ایک جاپانی نے کہا کہ "ٹیگور تمہارا فلسفہ ایک مفتوح قوم کا فلسفہ ہے۔ جسے سننے کے لئے ہم ہرگز تیار نہیں"۔

اقبال اِس مجہولیت سے نہ صرف ہر ہندوستانی کو بلکہ ہر اِنسان کو بچانا چاہتا ہے۔ اور فکر انسانی کو عقابی پرواز میں دیکھنا چاہتا ہے۔

غلامی اور محکومی سے بچنے کے لئے اقبال یہ نسخہ تجویز کرتا ہے:۔

خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں، غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو اِستغنا ر

انسان کی بیشتر مصیبتیں اور تمام ترکمزوریاں غرض پرستی کے تحت میں آتی ہیں۔ اِنسان کیوں مادی اور فانی طاقتوں کے آگے جھکتا ہے؟ اس لئے کہ اس کی غرض مندیاں اُسے مجبور کرتی ہیں۔ ایک انسان کیوں دوسرے انسان سے ڈرتا ہے؟ اس لئے کہ اس کی طمع نفسانی قوت مردانگی

کو سلب کر دیتی ہے ؎

آنچہ شیراں را کند روبہ مزاج
احتیاج است، احتیاج است احتیاج

اگر انسان حقیر خواہشاتِ نفسانی کو ترک کر دے، تو کسی دنیاوی طاقت سے مرعوب نہیں ہو سکتا۔ اور پھر اُسے نہ ڈرنے کی نوبت آئے۔ نہ ڈرانے کی ضرورت باقی رہے۔ اور جب اس کی نیک نیتی میں بے خوفی کا بھی اضافہ ہو جائے تو اس کا محکوم و مجبور رہنا غیر ممکن ہے۔ پس اپنے دل کو پاک رکھو۔ اور لذت و شہوات کے غلام نہ بنو۔ پھر کوئی دنیاوی طاقت تمھیں غلام نہیں بنا سکتی۔

خدائی اور بندگی کا موازنہ اس طرح کیا ہے:۔

خدائی اہتمام خشک و تر ہے
خداوندا خدائی دردِ سر ہے
ولیکن بندگی! استغفر اللہ
یہ دردِ سر نہیں دردِ جگر ہے

کسی کام کی ذمہ داری اگر احساس فرض کے ساتھ لی جائے۔ تو وہ ایک بڑی مصیبت اور دردِ سری ہے۔ اور جتنی بڑی ذمہ داری ہو گی اِتنی ہی وبالِ جان ہو گی۔ اس لئے سب سے بڑی دردِ سری تمام امورِ کائنات کی ذمہ داری ہے اور یہ ایسا دردِ سر ہے کہ خداوند عالم ہی اسے گوارا کر سکتا ہے۔ میں تو اس خدائی اور کار فرمائی کے نام سے بھی کانپتا ہوں اور اِسے دردِ سر سے کم نہیں سمجھتا۔ لیکن بندگی اور اطاعت ایک

نہایت خوفناک مصیبت ہے۔ جو اس درد سر کے مقابلہ میں درد جگر سے کم نہیں۔ اور بہر حال درد جگر پر درد سر کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ایک اجرائے حکم اور دوسرا تعمیل حکم ہے۔

غالب کا شعر ہے:۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے

مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

یعنی ایمان رکوع و سجود میں نہیں بلکہ وفاداری کے عہد صادق کا نام ایمان ہے۔ اس لئے جس برہمن نے تادمِ زیست بُت پرستی کی ہو اور بت کے قدموں ہی پر جان دیدی ہو۔ وہ اس بات کا مستحق ہے کہ مرنے کے بعد اچھے سے اچھا مقام حاصل کرے۔

مگر اقبال کہتا ہے:۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی

نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

یعنی اگر تپش عشق سے غیر مسلم کا دل بھی متاثر ہو تو وہ صاحب ایمان ہے۔ لیکن اگر مرد مسلمان ہزار سجدے کرنے کے باوجود بھی تنگ دل اور تیرہ باطن رہے تو وہ ایمان سے محروم ہے۔ مطلب یہ کہ ایمان صفائی قلب میں ہے ورنہ خالی آرائشِ گفتار اور زینتِ لباس تو دکھاوا ہے اور سب سے بڑی بے ایمانی ہے۔

پھر کہا ہے:۔

علم کی حد سے پرے بندہ مومن کیلئے لذت شوق بھی ہے نعمت دیدار بھی ہے

یعنی بندۂ مومن کے لئے علم ظاہر ہی کافی نہیں۔ جو بسا اوقات عقلِ انسانی کا سب سے بڑا پردہ بن جاتا ہے۔ اور قوت عمل کو بھی سلب کر دیتا ہے۔ بلکہ اس میں عشق کی حرارت بھی ہونی چاہیئے۔ اور منزل عشق مُقام علم سے بہت آگے ہے۔ اگر بندہ مومن وہاں پہنچ جائے تو لذتِ شوق اور نعمتِ دیدار دونوں سے شادکام رہتا ہے۔ حالانکہ عام قاعدہ کے مطابق نعمت دیدار کے بعد لذت شوق فنا ہو جاتی ہے۔

جب علم و عقل کسی کام سے عاجز آجاتے ہیں تو وہاں عشق ہی رہنمائی اور دستگیری کرتا ہے۔ چنانچہ دنیا کی بڑی بڑی مہمیں اسی کی بدولت سر ہوئی ہیں۔ ورنہ عقل بے چاری تو سرنگوں ہو چکی تھی۔ اقبال نے کہا ہے:۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

مخلوق خدا کی مصیبتوں کو خالق ارض و سما کی جناب میں یوں بیان کیا ہے:۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

جب سب اراکین سلطنت اور عہدیدار و اہلکار عیار ہوں۔ اور خلقِ خدا ان سے تنگ آکر یہ فیصلہ کرلے کہ ان دنیا داروں کو چھوڑ کر معرفت کے دعویداروں ہی سے داروئے دل طلب کی جائے۔ تو یہاں بھی یہ کیفیت نظر آتی ہے کہ شیخ و برہمن اور صوفی و ملا سب عیار و مکار ہیں۔

اور اب پتہ چلتا ہے کہ شیطان ہر لباس میں جلوہ گر ہے۔ غرض دیر و حرم سب میں اندھیرا ہے۔ ایسی حالت میں دنیا کا کیا حال ہو۔ اور خلق خدا کو کون سنبھالے۔

پھر کہا ہے:-

رہ و رسم حرم نا محرمانہ — کلیسا کی ادا سوداگرانہ
تبرک ہے مرا پیراہن چاک — نہیں اہل جنوں کا یہ زمانہ

اور بھی سنیئے:-

حق را بسجودے صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو

یعنی یہ دین کے ٹھیکیدار جب خدا کے سامنے جاتے ہیں تو سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ اور جب بتوں سے دوچار ہوتے ہیں تو ڈنڈوت کرنے لگتے ہیں۔ غرض کارساز حقیقی اور معبود خیالی دونوں سے مکر و فریب کرتے ہیں۔ اور جب یہ خدا سے نہیں چوکتے تو انسان بیچارہ کو تو کیا بخشتے۔ اور چونکہ مساجد و منادر اور کلیسا و کنشت ہی ان کی شر انگیزیوں اور فتنہ پردازیوں کے اڈے ہیں۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ مسجد اور مندر سب کا تعزیہ ٹھنڈا کر دیا جائے۔

" ملا اور بہشت " کے عنوان سے چند لطیف اشعار قلمبند کئے ہیں۔

اس قطعہ کا آخری شعر یہ ہے:-

ہے بد آموزئ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت

یعنی ملا کی تو زندگی اور دل لگی ہی بد آموزئ اقوام و ملل اور بدگوئی

خلق خدا میں ہے۔ اور اس عیب جوئی و نکتہ چینی کے بہترین اڈے آج کل کی عبادت گاہیں ہیں۔ پس اگر تو نے اسے بہشت میں داخل کر دیا تو اس کی زندگی حرام ہو جائے گی۔ کیونکہ وہاں نہ تو مسجد ہے۔ جہاں اڈا جما کر یہ سب کو برا بھلا کہہ سکے۔ اور نہ کلیسا و کنشت ہیں۔ جنھیں مد مقابل اور حریف قرار دیکر یہ اپنے دل کا بخار نکال سکے پس بہتر یہی ہے کہ اسے جنت سے دور رکھا جائے۔

اقبال نے آزادی و فکر و عمل اور خودی بمعنی خودداری پر کثرت سے اظہار خیال کیا ہے۔ ایک شعر یہ ہے:۔

نہ میں اعجمی نہ ہندی نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی

وہ اپنے آپ کو کسی ملک و ملت اور کسی قوم و فرقہ سے منسوب کرنا نہیں چاہتا۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہ سب ایسی پابندیاں ہیں کہ جذبات خودی و آزادی کو پرورش نہیں ہونے دیتیں۔ نیز ان کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان سے نفرت کر رہا ہے۔ اور اولاد آدم وسعتِ فکر و نظر سے محروم ہوتی چلی جا رہی ہے۔

ایک اور شعر ملاحظہ ہو:۔

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

اُسے دینی یا دنیاوی کوئی پابندی گوارا نہیں۔ بلکہ دنیا و عقبیٰ۔ دونوں سے بے نیازی اس کا مسلک آزادی ہے۔

سائنس کی جدید تحقیقات یہ ہے کہ نظر آنے والے ثوابت و سیّارے اوپر اِسی
قسم کے اور بھی چاند ستارے اور کرّے موجود ہیں۔

غالب کہتا ہے:۔

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے
عرش سے اُدھر ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

یعنی اگر عرش سے دوسری طرف ہمارا مکان ہوتا تو کیا اچھی بات تھی
چونکہ اس صورت میں ہمارا منظر بلندی ایک اور آسمان اور ثوابت و سیّارہ ہوتے
اور نظر آنے والا آسمان ہماری زمین قرار پاتا۔ غالب اگرچہ اور بلندیوں کا تو
قائل ہے۔ مگر وہاں تک پہنچنے کے لئے صرف دستِ دُعا بلند کرنے پر اکتفاء
کرتا ہے لیکن اِقبال کہتا ہے:۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے اِمتحاں اور بھی ہیں
قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر
چمن اور بھی، آشیاں اور بھی ہیں
تو شاہین ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں

یعنی ستاروں سے آگے یقیناً اور جہاں بھی ہیں۔ اور تلاش و تحقیق
کے دروازے کھول کر وہاں تک پہنچ جانا ایسا فرض انسانی ہے۔ جو ابھی
تشنۂ تکمیل ہے۔ جس عالم رنگ و بو میں تم آباد ہو۔ مت سمجھو کہ دائرہ کائنات
یہیں ختم ہو گیا بلکہ اس طرح کے بہت سے عالم موجود ہیں۔ جنہیں آباد کیا جا سکتا ہے۔
اور چونکہ تم بنی نوع انسان اور اشرف المخلوقات ہو اس لئے تلاش و تحقیق اور

عمل و مصروفیت تمہارا فرض انسانی ہے اگر تم ایک دفعہ احساسِ فرض کے ساتھ مصروف عمل ہو جاؤ تو نئی زمینوں اور نئے آسمانوں کا ابدی سلسلہ قائم ہو سکتا ہے۔

پھر کہتا ہے:۔

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات۔۔ ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں

یعنی جتنے معلوم مقامات ہیں اُن سب سے آگے غیر معلوم مقامات بھی ہیں۔ جن کا نہ صرف سراغ لگانا بلکہ وہاں تک پہنچ جانا تیرا فرض ہے۔ اور حیات صرف اسی چیز کا نام ہے کہ ہر ساعتِ زندگی میں آگے ہی قدم بڑھتا رہے۔

اقبال بحرِ تصوف کا بھی ایسا غواص ہے کہ زمین کی تہ تک نکال لاتا ہے ذیل کے دو معرکتہ الآرا شعر دیکھنے سے اربابِ ذوق و نظر پر روشن ہو سکتا ہے کہ ترجمانِ حقیقت شاعر کس مقام بلند پر متمکن ہے:۔

وہی اصل مکان ولامکاں ہے
مکاں کیا شئے ہے؟ اندازِ بیاں ہے
خضر کیونکر بتائے۔ کیا بتائے؟
اگر ماہی کہے۔ دریا کہاں ہے؟

یعنی سوائے ذات احدیت کے کوئی چیز فی الحقیقت موجود نہیں ہے یہ زمین و آسمان اور مکان ولامکان محض اندازِ بیان اور مرگ و زیست صرف حسن ادا ہے۔ جن کا وجود اسی وقت تک محسوس ہوتا ہے۔ جب تک

تو خود فراموشی میں مبتلا ہے۔ لیکن اگر تیرا قلب حساس اور دل درد آشنا ہو۔ تو راز حقیقت تجھ پر منکشف ہو سکتا ہے۔ مگر یہ راز سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آتا بلکہ اس کی گرہ کشا تیری تخلیق خودی ہی ہو سکتی ہے۔ اور خودی تیرے اندر اور تو اصل ذات کے اندر موجود ہے۔ لیکن پھر بھی تو پوچھے۔ کہ کہاں ہے۔ تو یہ ایسی ہی بات ہے۔ جیسے ماہی خضرؑ سے سمندر کا پتہ دریافت کرے حالانکہ وہ ہر وقت سمندر ہی میں رہتی ہے۔

اقبال ایک مومن خالص کی نظر سے تمام دنیا کو دیکھتا ہے۔ وہ غریبوں اور بیکسوں کو فائز المرام اور مسکینوں محتاجوں کو شادکام دیکھنے کے لئے بیتاب ہے۔ بندگانِ خدا کی محکومی وغلامی سے اس کا دل تڑپ اُٹھتا ہے۔ بنی نوع اِنسان کی مظلومی ومجبوری سے اس کے سینہ میں داغ لگ جاتا ہے۔ اور خلق اللہ کی اَبتری وبیکسی پر اس کے جگر میں ناسُور پڑ جاتے ہیں۔ وہ ایک ایسی حقیقی مساوات کا علمبردار ہے جس میں نہ کوئی حاجت مند ہو۔ نہ حاجت روا۔ اور نہ کوئی ڈرنے والا باقی رہے نہ ڈرانے والا۔ اس شریف جذبۂ اِنسانیت سے متاثر ہو کر اس نے "فرمانِ خدا" بنام فرشتگان میں اپنے اِحساس قلب کا یوں اِظہار کیا ہے:۔

اُٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو — کاخِ امرا کے در و دیوار ہلا دو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے — کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
کیوں خالق ومخلوق میں حائل رہیں پردے — پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو
حق را بسجودے صنماں را بطوافے — بہتر ہے چراغ حرم و دیر بجھا دو

میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے — میرے لئے مٹی کا حرم اور بنا دو

اقبال کس مقام پر ہے اور کس غزل کی اُسے تلاش ہے، شیخ اور صوفی وملا اس کی نظر میں کون ہیں، عشق وعلم کی حقیقت کیا ہے۔ اس کے متعلق ایک غزل کے چند بصیرت افروز شعر پیش کر کے میں اپنا مضمون ختم کرتا ہوں۔

لا پھر اک بار وہی بادہ وجام اے ساقی — ہاتھ آجائے مرے میرا مقام اے ساقی
تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند — اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی
میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی — شیخ کہتا ہے کہ "ہے یہ بھی حرام" اے ساقی
شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی — رہ گئے صوفی وملا کے غلام اے ساقی
عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے — علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

ڈاکٹر سید عبداللہ ایم۔اے
ڈی لٹ، لیکچرار یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

تشریحِ اقبال

تنقیدی مطالعہ کی ابتدا یورپ میں

علامۂ اقبال کے افکار کا تنقیدی مطالعہ ان کی زندگی ہی میں شروع ہو چکا تھا، ۱۹۱۹ء میں ڈاکٹر نکلسن نے ان کی مثنوی اسرارِ خودی کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا، جس کے ذریعہ غالباً پہلی مرتبہ مغربی دنیا اقبال کے فکر سے آگاہ ہوئی، اس کے بعد بہت سے انگریز اہلِ علم نے اقبال کی طرف توجہ کی، مثلاً ڈکنسن نے "نیشن ویکلی" (The Nation Weekly) میں اسرارِ خودی پر تبصرہ کیا، اسی طرح فارسٹر (E. M. Forester.) نے رسالہ "اتھینیم" (Athenium) میں ریویو کرتے ہوئے فلسفۂ اقبال کا تجزیہ کیا۔

علمائے مغرب کے مطالعہ اقبال کی اس کوشش سے ایک بہت بڑا

فائدہ یہ ہوا کہ ایک ہندی مشرقی فلسفی کے خیالات و معتقداتِ حدود ہند سے نکل کر انگریزی جاننے والی دنیا میں پھیل گئے، اور ولایت کی تحسین و اعتراف کی مہر ثبت ہو جانے کی وجہ سے ہندوستان کے مغرب پسندوں کے لئے " فکر اقبال " کچھ پہلے سے زیادہ جاذب توجہ ہونے لگا، مگر یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ علامہ اقبال نے ان مبصرین کی تشریح و توضیح کو پسند نہیں کیا، چنانچہ انھوں نے ایک خط میں جو ڈاکٹر نکلسن کے نام تھا۔ ان تبصروں کا مدلل جواب دیا جس میں اپنے نصب العین اور مسلک پیش نہاد کی توضیح اور تشریح کی کوشش کی تھی؛

ہندوستان میں مطالعہ اقبال کی ابتداء

گو اقبال کو ابتدا ہی سے بے حد قبولِ عام حاصل ہو چکا تھا اور ہندوستان کا ہر پڑھا لکھا فرد نغمۂ اقبال کی شیرینی اور پیام اقبال کے سوز و گداز کا دلدادہ اور معترف تھا، مگر افسوس ہے کہ مطالعہ اقبال کی حقیقی کوشش بہت دیر میں ظہور میں آئی۔ انجمن حمایت اسلام کے وہ عظیم الشان اجتماع کسے یاد نہ ہونگے، جن میں علامہ اقبال اپنی قومی نظموں سے مجلسوں کو گرماتے، اور دلوں کو تڑپایا کرتے تھے، وہ دن کتنے مبارک تھے، جب قوم کا شاعر اعظم اپنے عزلت کدے سے نکل کر قومی انجمن کے اسٹیج کو مشرف کیا کرتا تھا۔ یہ مجلسیں اتنی پر لطف اور پر اثر ہوا کرتی تھیں کہ ہفتوں بلکہ مہینوں اِن کے تذکرے رہا کرتے تھے، مگر باوجود اِس قبول عام کے جو اقبال کو نصیب ہوا، فکر اقبال کے گہرے اور تنقیدی مطالعے کی طرف پوری توجہ نہیں کی گئی، یہ صحیح ہے کہ اس صورت حال کے چند در چند اسباب تھے، لیکن اس واقعہ سے بطور واقعہ انکار نہیں کیا جا سکتا،

مطالعۂ اقبال کی مخلصانہ کوشش

غالباً ۱۹۲۶ء یا ۱۹۲۸ء میں اہل ملک کو اس ضرورت کا کچھ احساس ہوا، اس وقت تک علامہ کی بہت سی تصانیف شایع ہو چکی تھیں، تحریک خلافت کے ہنگامے سرد ہو چکے تھے، پیکار اور آویزش کے ولولے ہٹ چکے تھے، عدم تعاون اور ہندو مسلم اتحاد کی ناکامی نے سوچنے والے دماغوں اور محسوس کرنے والے دلوں کو سوچنے اور فکر کرنے پر مجبور کر دیا تھا، ہندو اور مسلمان اپنے اپنے مطمح نظر کے صواب و خطا پر غور کرنے لگے تھے، اس ذہنی خلفشار کے زمانے میں پیغام اقبال کی جانب کچھ سنجیدگی کے ساتھ توجہ ہونے لگی، چنانچہ تھوڑے عرصے میں کچھ کتابیں، کچھ رسالے، کچھ مضامین، فکر اقبال کی تنقید میں شائع ہو گئے، پہلا یوم اقبال ۱۹۳۲ء میں لاہور میں منایا گیا، جس کی ایک تقریب میں خود علامہ نے بھی شرکت فرمائی، اس کے بعد اور ایک دو قابل قدر کتابیں شائع ہوئیں، جو علامہ کی نظر سے بھی گزریں۔

آخری دَور میں علامہ اقبال کی مایوسی

مگر علامہ کی زندگی میں ان کی حکمت کے مطالعہ کے سلسلہ میں جو کچھ ہوا علامہ اس سے بالکل مطمئن نہ تھے، نوجوانان ملک سے اُنھیں جو توقعات تھیں، وہ پوری نہ ہوئیں، فکر اسلامی کے احیاء ثانی کے سلسلہ میں اُن کے جس قدر ارادے تھے، ایک ایک کر کے ناکام رہے، مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کی آرزوئیں قوت سے فعل میں نہ آئیں، سب سے زیادہ یہ کہ علوم اسلامیہ کی تجدید کے متعلق اُن کے سارے خیالات طلسم باطل ہو کر رہ گئے، یہی وجہ ہے کہ "ارمغان حجاز" کی اکثر رباعیاں تنہائی کے احساس سے معمور نظر آتی ہیں، جن میں "ہمرہان سست عناصر" کے شکوے ہیں، اور

رنیقان کوتاہ پا" کے گلے" "ہم نفسان خام" کی کورذوقی کا ماتم ہے، اور مفلسان شعر" کی بے نوائی کا نوحہ۔

اقبال کو سب سے زیادہ گلہ ان ناشناس تحسین گذاروں کا تھا جو انھیں محض غزل خواں اور ان کی حکمت کو نوائے شاعری سمجھتے رہے اُن کے ماحول کی بے بصیرتی اور اُن کی ناکامی کا گہرا اثر اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال اپنے زمانہ اور اپنے ماحول سے مایوس ہو کر اپنے کو مستقبل کا "پیام آور" کہنے لگے، ارمغان صد ۱۳۲ میں فرماتے ہیں:-

نخستین لالہ صبح بہارم ۔۔۔ بپاے سوزم از داغے کہ دارم

بچشم کم مبیں تنہائیم را ۔۔۔ کہ من صد کاروان گل در کنارم

اس سے یہ بات بخوبی ظاہر ہوتی ہے کہ علامہ مرحوم قوم میں جس قسم کا جذبۂ انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے اپنی زندگی میں اس کا دیکھنا ان کو نصیب نہ ہوا۔

۱۹۳۸ء میں جب علامہ اقبال کا انتقال ہو گیا، اس وقت آسودگی پسند قوم کو اس متاع گراں مایہ کے لٹ جانے کا کچھ احساس ہوا، ماتمی جلسے ہوئے مرثیے لکھے گئے، اخبارات نے ماتمی ایڈیشن شایع کئے، رسالوں نے خاص نمبر نکالے، غرض ہر شخص نے اپنے اپنے ذوق اور اپنے اپنے طریقے سے اس حکیم الامت کے اُٹھ جانے پر اپنے دلی درد اور افسوس کا اظہار کیا، غم و اندوہ کی یہ فضا علمی لحاظ سے کسی حد تک مفید ثابت ہوئی اور اشکبار آنکھوں نے دلوں اور دماغوں کو پیام اقبال پر گہری فکر و نظر کا اشارہ کیا، چنانچہ اس حادثے کے زیر اثر تین چار سال تک افکار اور کلام اقبال کی تنقید و تشریح کی طرف خاص توجہ ہوئی، گو اس تحریک میں سیاسی حالات بھی کسی حد تک

ممد و معاون ثابت ہوئے، اور بعض صورتوں میں محض تجارتی اغراض نے بھی کارفرمائی کی، مگر بالعموم اس عرصے میں مطالعہ اقبال کی تحریک کو بہت فروغ ہوا اور اس کے متعلق بعض مفید اور وقیع کتابیں لکھی گئیں۔

گو کلام اقبال کے متعلق متفرق مضامین کی فہرست بظاہر طویل ہے لیکن اس کی عظمت اور بلندی کی نسبت سے اب بھی بہت تشنہ اور مختصر ہے اگر ہم سچ مچ اقبال کو اپنی ذہنی تاریخ میں وہی درجہ دیتے ہیں، جو انگریزوں اور جرمنوں نے شیکسپیر اور گوئٹے کو دے رکھا ہے، تو ہم ان کے ساتھ اپنی محبت اور ان کے اعتراف کے بارہ میں شرمندہ ہونے پر مجبور ہوں گے انگریزی اور مغربی ادب کے واقف کاروں سے وہ طویل و ضخیم اسماء الکتب (Bibliographies) پوشیدہ نہیں ہیں، جن میں شیکسپیر اور گوئٹے کے متعلق کتابیں شامل ہیں مثال کے طور پر (Dr. Episck and Schucking) کی (Bibliography Shakespeare)

پر نظر ڈالئے، جو بڑے سائز کے تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے، اس کے مندرجات پر غور فرمایئے اور بتلایئے کہ کیا شیکسپیر کی زندگی، ذہن، کلام، آرٹ اور شخصیت کا کوئی ایسا گوشہ ہے جو اس کے محبوں کی غائر اور بصیر نظروں سے اوجھل رہا ہو، اسٹرافورڈ کی بستی کا وہ گھر جس میں شیکسپیر رہا کرتا تھا، آج بھی ایک زیارتگاہ بنا ہوا ہے بلکہ اس کا سامان نوشت و خواند، اس کی دوات اور قلم اور اس کے قلم کے تراشے تک یادگار کے طور پر محفوظ موجود ہیں۔

مطالعۂ اقبال کی تحریک کی کمزوری کے اسباب بہت سے ہیں، مرحوم کی وفات کے بعد بعض ارباب سیاست نے قدردانی اور سرپرستی کے پردے میں

مگر اقبال کو جس رنگ میں پیش کیا، اور ان کے فلسفہ و حکمت کو جس طرح اغراض خارجی کے لئے استعمال کیا، اس سے علامہ مرحوم کے مشن کو شدید نقصان پہنچا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انقلاب کا پیغام جمود کی دعوت بن کر رہ گیا، اور عمل کا خروش جرس نغمۂ خواب آور ثابت ہوا۔

دقّت اور دشواریاں

دوسرا سبب کلام اقبال کی دشواری اور دقّت ہے جس کی وجہ سے اس کا بڑا حصہ نہ صرف عوام بلکہ متوسط گروہ کے لئے بھی تقریباً ناقابل فہم ہے، غلام آباد ہند کی گلوگرفتہ سیاسی فضا میں مرغان چمن کے لئے آزادی کے گیت گانا بیحد دشوار رہے، اس پر طرّہ یہ کہ اقبال جس گروہ کو مخاطب کرنا چاہتے تھے۔ اس کی خامکاری اور پست ہمتی کا ان کو پورا اندازہ تھا، اس لئے وہ اپنے دل کی بات صاف صاف کہہ دینے کے بجائے رمز و کنایہ کے پیرایہ میں کہنے پر مجبور رہتے، خود کہتے ہیں:—

وقتِ برہنہ گفتن است من بہ کنایہ گفتہ ام
خود تو بگو کجا برم ہمنفسانِ خام را

شعر اور پیغام

شعر اور آرٹ کی خوبی بڑی حد تک اس کے ایجاز اور ایمائیت پر موقوف ہے، اِس لئے شعر کے قالب میں وہ پیغام مشکل سے سما سکتا ہے، جو عوام اور متوسط طبقوں کے لئے ہونے کے باعث صراحت چاہتا ہو، خصوصاً جبکہ شاعر کے ذہن و فکر پر دوسری خارجی پابندیاں بھی عائد ہوں، فلسفہ اور شعر علامہ کے خیال میں خود گریز کے بہانے ہیں، جن کے ذریعہ شاعر واشگاف اظہارِ حقیقت سے بچنے کے لئے اشاروں اور کنایوں سے کام لیتا ہے۔

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا
حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

فارسی زبان ذریعۂ اظہارِ خیال

چوتھا سبب یہ ہے کہ علاّمہ اقبال نے اپنے فکر کے اظہار کے لئے بیشتر فارسی زبان کو استعمال کیا ہے، ہندوستان میں ادبیات فارسی کا ذوق اب اس درجہ کم ہو رہا ہے کہ لوگ آہستہ آہستہ فارسی شعر و شاعری کے حقیقی لطف سے محروم ہوتے جا رہے ہیں، کالجوں کی "دم بریدہ" تعلیم فارسی ادب کا صحیح ذوق نہیں پیدا کر سکتی، اور وہ طلبہ بھی جو فارسی کے اچھے طالبعلم سمجھے جاتے ہیں، فارسی شاعری کے اجزاء ترکیبی سے بے خبر ہونے کے باعث اپنے قدیم شعراء کو لغو گو اور ان کی شاعری کو بیہودہ قرار دیتے ہیں، انھیں یہ گلہ ہے کہ رومی، حافظ، سعدی، نظیری، اور غالب نے شیکسپیر، براؤننگ شیلے اور کیٹس کی طرح کیوں نہیں کہا؟ جو فارسی ادبیات کے ذوق سے ان کی محرومی کا نتیجہ ہے۔

حکیمانہ اصطلاحات اور تراکیب

اقبال کی زبان حکیمانہ اصطلاحوں اور ترکیبوں سے پُر ہے، عام خصوصیات کے اعتبار سے اقبال پر حافظ، فغانی، جلال اسیر، علی قلی سلیم، سالک یزدی، رضی دانش، ابوطالب کلیم، طالب وغیرہ کی زبان کا بڑا اثر ہے، لیکن حکیمانہ مضامین کے لئے انھوں نے رومی، خاقانی، بیدل، اور غالب کی زبان استعمال کی ہے، غزل کی زبان شیریں ہے، لیکن حکیمانہ مضامین کے لئے جو الفاظ اور ترکیبیں انھوں نے استعمال کی ہیں، وہ بیشتر تشریح طلب اور دقیق ہیں، جس کی بنا پر متوسط درجے کے تعلیم یافتہ اشخاص کیلئے

کلام اقبال بڑی حد تک ناقابل فہم ہوگیا ہے، میں نے "شعرائے فارسی اور علامۂ اقبال" کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا ہے، جس میں اس قسم کے تمام مباحث پر مفصل تبصرہ کیا ہے، یہاں صرف اس قدر عرض کرنا کافی ہوگا کہ اقبال اکابر شعرائے فارسی کے وارث اور صوفیہ اور حکمائے اسلام کے سلسلے کی ایک کڑی تھے، اس لئے ان کے کلام کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے کے لئے فارسی زبان اور ادب سے کامل واقفیت کی ضرورت ہے۔

مضمون اور معنی کی دشواریاں

مطالعۂ اقبال کے سلسلہ میں زبان اور الفاظ کی دشواریوں سے کہیں زیادہ مضمون اور معانی کی دقتیں ہیں، اقبال حکیم تھے، "ساز سخن" تو حرفِ آرزو کے اظہار کے لئے ایک بہانہ تھا، جو لوگ ان کی نوائے پریشاں کو محض شاعری سمجھتے ہیں، وہ کلام اقبال کی عظمت کے محرم نہیں، وہ محض غزلخوانی کے لئے نہیں پیدا کئے گئے تھے، بلکہ "محرم رازِ درون میخانہ" تھے، قدرت نے انھیں تجدید اور انقلاب کے لئے پیدا کیا تھا، وہ مفکرین اسلام کے کاروان مقدس کے ایک ممتاز فرد تھے، ان کا کلام اسلام اور اسلامیات کے گہرے اور وسیع مطالعہ کا آئینہ دار ہے، ان کے اشعار میں کلام مجید، احادیث نبوی، اسلامی فلسفہ، و حکمت کے جواہر ریزے، متکلمین اور حکماء کے شہ پارے صوفیہ اور ائمہ کے بلند خیالات، اہل عرفان اور ارباب کشف کے مقامات واحوال کی طرف جا بجا اشارے ہیں، گذشتہ تیرہ سو سال میں اسلام کے آغوش میں پلنے والی مذہبی، علمی، سیاسی اور ذہنی تحریکوں کی تاریخ، اقوام عالم کے قدیم و جدید ہیجانات، ملل و مذاہب جدیدہ کا ارتقاء، خلافت، سلطنت اور ملوکیت کا عروج و زوال، مغرب اور حکمائے مغرب کے

نظریئے اور تصورات، غرض انسانی تہذیب و تمدن کے تمام اہم پہلوؤں پر فلسفیانہ تبصرے کلام اقبال میں ملحضاً وتلمیحاً موجود ہیں، جن سے واقفیت کلام اقبال کے حقیقی مقصود تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے، چونکہ مسلمان اب عموماً علوم اسلامیہ اور تاریخ اسلام سے بے خبر اور ناواقف ہو چکے ہیں اس لئے اس شبہہ کے پورے پورے امکانات موجود ہیں کہ ہم ابھی تک علامۂ اقبال کی تعلیمات کے عمیق اور اصلی مفہوم سے شاید بہت دور ہیں، علاّ اقبال کا نام سن کر یا ان کا شعر پڑھکر بہت سے لوگ سر دھننے لگتے ہیں اور بعض پر تو وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو قابل مسرت اور لائق مبارکباد ضرور ہے، لیکن یہ جذب و سُرور اور قبول عام محض سیاسی قسم کا ہے، اس کی مذہبی اور علمی بنیاد بہت کمزور ہے، اور علامہ کے مقصد حیات کے ادراک و فہم سے شاید اسے دور کا واسطہ بھی نہیں، اسی بے خبری کا ایک نتیجہ ہے کہ اس وقت ہماری قوم کے بعض تنگ نظروں کے نزدیک علامۂ اقبال کی ساری تعلیم صرف "مخالفت وطنیت" اور "عنادِ ملائیت" سے عبارت ہے، حالانکہ تعلیمات اقبال کے وسیع سمندر میں یہ دو اُمور قطرے کی نسبت رکھتے ہیں، اور ان کا بھی وہ مفہوم و مقصد نہیں جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے، ان کے علاوہ کلام اقبال میں بیشمار انمول موتی موجود ہیں، جن کو نگاہ میں رکھنے کے بعد اقبال کو محض "وطن اور ملا" کا قاتل قرار دینا مولانا شبلی کے اس شعر کی یاد کو تازہ کرتا ہے۔

تمھیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا
کہ عالمگیر ہندو کش تھا، ظالم تھا، ستمگر تھا

مطالعۂ اقبال کی ان کمزوریوں کو دیکھکر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ

کیا واقعی اقبال ابھی تک ایک رازِ سربستہ ہے اور تعلیم یافتہ حضرات کا مدعیانہ جوش و خروش محض بے بنیاد اور نمائشی ہے، میرے خیال میں کلامِ اقبال کے قدردانوں کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ مطالعۂ اقبال کی دشواریوں کو رفع کرنے کے لئے کوئی موثر قدم اٹھائیں اور پیامِ اقبال کو سہل اور آسان تر بنا کر ہر ہر بچے جوان اور بوڑھے تک پہنچائیں، مطالعۂ اقبال کے مہمات اُمور جن کی طرف خاص توجہ کرنے کی ضرورت ہے، یہ ہیں:۔

(۱) فرہنگ مشکلات اقبال۔

(۲) مبادی اقبال کی تشریح۔

(۳) اقبال کے ماخذ اور اطراف کا مطالعہ اور تجزیہ۔

(۴) مسائلِ عظیمۂ اقبال کی تشریح۔

(۵) مطالعہ اقبال کی نہایات و غایات۔

(۶) دائرۃ المعارف اقبال۔

وہ اُمور جو میرے نزدیک مبادئی اقبال کا درجہ رکھتے ہیں، یہ ہیں۔

(۱) اقبال کی شخصیتیں۔

(۲) اقبال کی تلمیحات اور اصطلاحات علمی۔

(۳) اقبال کی تضمینیں۔

(۴) اقبال کے اِستعارے، فرضی نام اور نشانات۔

(۵) جغرافیائی نام۔

(۶) اقبال کے سرچشمہ ہائے فیض یا ماخذ۔

(۷) اقبال کے اہم مسائلِ علمی کی تمہیدی واقفیت۔

اقبال کی شخصیتیں

اقبال کے کلام میں عہد قدیم اور عہد جدید کی بہت سی شخصیتوں کا ذکر آتا ہے، ان میں سے بعض علمی اور روحانی ناموروں کا تذکرہ ماخذ اقبال کے ذکر میں آئے گا، لیکن اُن کے علاوہ اقبال کے "ہیروز" اور بھی ہیں، جن کی یاد کو اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے، ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کی سیرت کی عظمت سے اقبال متاثر ہیں، مگر بعض ایسے بھی ہیں جن کی سیرت عبرت پذیری اور نصیحت آموزی کے لئے ہمارے سامنے پیش کی گئی ہے۔

اقبال کی شخصیتوں کا دائرہ بہت وسیع ہے، ان میں انبیاء علیہم السلام بھی ہیں اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم بھی، بادشاہ بھی ہیں اور سیاست دان بھی، اربابِ رزم بھی ہیں اور اصحابِ بزم بھی، مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی، خدا شناس بھی ہیں اور طاغوت پرست بھی، صلحا بھی ہیں اور فساق بھی، غرض قدیم و جدید تاریخ عالم کی بیشتر نمایاں شخصیتیں کلام اقبال کے ضمن میں زیر بحث آئی ہیں۔ مطالعہ اقبال کے سلسلہ میں ان مشاہیر کا مجمل تعارف ازبس ضروری ہے۔ تاکہ عام مطالعہ کرنے والے حضرات ان ناموروں کے خاص اوصاف و خصائص پر غور کر سکیں جن کی خاطر اقبال نے ان کا تذکرہ اپنے اشعار میں کیا ہے۔

مثال کے طور پر جاوید نامہ کے بعض اشخاص کو لیجئے، مثلاً شرف النساء، صادق اور جعفر اور سید جمال الدین افغانی وغیرہ۔

اقبال کی تضمینات

اقبال کے کلام میں تضمینات بھی بہ کثرت ہیں۔ بانگ درا، پیام مشرق، جاوید نامہ، ضرب کلیم

زبور عجم، اور بال جبریل میں شعراء کے اشعار کی بہت سی تضمینیں ملتی ہیں۔ جن میں سے بعض مشہور و معروف ہونے کی وجہ سے محتاج تعارف نہیں مگر بعض ایسی بھی ہیں، جن کا مجمل علم اقبال کے مطالعہ کرنے والے کے لئے بے حد ضروری ہے۔ مثلاً انیسی شاملو، ملا عرشی، فیضی، رضی، دانش، ملک قمی، صائب، غنی، مرزا مظہر جانجاناں وغیرہ کی تضمینات۔

تضمینوں کے سلسلہ میں یہ بھی بتانا ضروری ہوگا کہ کسی خاص شاعر کو اقبال نے کیوں پسند کیا، اور جس شعر کو تضمین کے لئے انتخاب کیا گیا ہے اس میں کیا خاص خوبی ہے، یا اس کو ان کے موضوع بحث سے کیا تعلق ہے۔

میں نے اس بحث کو اپنے ایک مضمون "اقبال کے محبوب فارسی شاعر" میں قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس موقع پر میں صرف ایک مثال پر اکتفاء کروں گا۔

مندرجۂ بالا فہرست شعراء میں ایک شاعر رضی دانش بھی ہے، اقبال نے اس کے ایک شعر کی تضمین کی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کو رضی کے اس شعر کی شوخی سے دلچسپی پیدا ہوئی۔

تاک را سرسبز کن اے ابر نیساں در بہار
قطرۂ تا مے تواند شد چرا گوہر شود

اس شعر کے جواب میں دارا شکوہ نے یہ شعر لکھا تھا۔

سلطنت سہل است خود را آشنائے فقر کن
قطرہ تا دریا تواند شد چرا گوہر شود

ان شعراء کے حالات معلوم ہونے کے بعد یہ سمجھنا نسبتہً آسان ہو جائیگا۔

کہ ان کی سیرت اور شاعری میں اقبال کے لئے کیا خاص وجہ کشش تھی، ان تضمینوں کا جائزہ لینا اس اعتبار سے بھی ہمارے لئے مفید ہے کہ ہم ان کے ذریعہ اقبال کی محبوب کتابوں اور مطالعۂ کتب کے سلسلے میں ان کے طریقوں سے بھی واقفیت حاصل کر سکتے ہیں۔

اقبال کی تلمیحات اور کتابوں کے حوالوں کی تشریح بھی اسی ضمن میں آتی ہے، تلمیحات کا ایک حصہ فرہنگ اقبال میں شامل ہونا چاہیئے، لیکن بعض تلمیحات ایسی بھی ہوں گی، جو اس میں شامل نہیں کیجا سکتیں، ان کی تشریح کے لئے شارح کو الگ انتظام کرنا ہوگا، کلام اقبال میں بہت سی کتابوں کا ذکر آیا ہے، وہ بھی اسی قبیل سے ہیں، ایک عام مطالعہ کرنے والا بسا اوقات ان اجنبی اور نامانوس ناموں سے گھبرا اٹھتا ہے، اور اقبال سے شیفتگی کے باوجود مطالعہ کلام کو ترک کر دیتا ہے۔

اقبال کے پسندیدہ اَمکنہ و مقامات

عقائد و خیالات اگرچہ روحانی حقائق کا درجہ رکھتے ہیں، اور ان کو کسی خاص مکان اور مقام کے ساتھ محدود اور وابستہ نہیں کیا جا سکتا تاہم اقوام کی تاریخ میں مکان اور مقام کو ہمیشہ سے بڑی اہمیت حاصل رہی ہے، قید مقام سے آزاد ہونے کے باوجود، اقوام اپنے ماضی کی محسوس یادگاروں کو زندہ رکھنا چاہتی ہیں، اور ان کے لئے اپنے دل میں اس درجہ محبت رکھتی ہیں کہ اُن کا تذکرہ سوئی ہوئی عصبیتوں کو جگا سکتا ہے اور مردہ حیات کی بیداری کا ذریعہ بن جاتا ہے، اقبال کے کلام میں اسلامی دور کے بعض شہروں کا تذکرہ بار بار آتا ہے، یہ وہ شہر ہیں جو کسی زمانہ میں اسلامی عظمت اور تہذیب کے مرکز تھے، ان کے درودیوار سے علم اور تمدن کے

سرچشمے جاری تھے، اور ان کے گلی کوچوں میں شرفِ انسانیت کا نور برسا کرتا تھا۔ اقبال کی شاعری تہذیب اور ثقافت کے ان کھنڈروں کی مرثیہ خوان ہے، اگر ہم ان محبوب بستیوں کے ساتھ اقبال کی دلبستگی کے وجوہ سے واقف ہو جائیں گے تو یقیناً ہم پیغام اقبال کی گہرائیوں تک پہنچ سکیں گے۔ جہاں آباد دہلی، کابل، تبریز، روم، قرطبہ، شیراز، رود کاویری، وادی الکبیر، وادی لولاب کیطرح بے شمار شہر اور مقام ہیں، جن کی خصوصیات کا جاننا ہمارے ابتدائی فرائض میں سے ہے۔

اقبال کے اہم علمی مسائل کی تشریح

مطالعہ اقبال سے پہلے بطور تمہید، مقدمے یا دیباچے کی صورت میں ان اہم علمی مسائل کا مختصر اور سادہ تجزیہ ہونا چاہیئے، جن سے پیام مشرق، زبور عجم، جاوید نامہ بلکہ سب کتابیں لبریز ہیں حکمائے مشرق کی طرح اقبال نے حکمائے مغرب سے بھی بہت زیادہ استفادہ کیا ہے، اس لئے کلام اقبال میں جابجا مشرقی اور مغربی حکمت کے بعض مسائل کی طرف اشارات ہیں، بعض اشعار میں کسی اسلامی یا مغربی حکیم کی پوری حکمت کا خلاصہ بیان ہوا ہے، کہیں کہیں خاص علمی اصطلاحات ہیں، عام مطالعہ کرنے والے عموماً صرف لطف زبان سے لذت گیر ہو کر آگے چل دیتے ہیں، اور شعر کے اصلی مفہوم سے ناواقف رہتے ہیں، اس لئے اس قسم کی علمی اصطلاحوں اور فلسفہ و حکمت کے مسائل و نکات کی آسان تشریح ابتدائی لوازم میں سے ہے، اس کی تشریح کے لئے دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ اقبال نے پیام مشرق کے باب "نقش فرنگ" میں "صحبت رفتگان" کے عنوان سے ایک مکالمہ لکھا ہے جس میں بعض حکمائے جدید و قدیم نے اپنے اپنے مسائل کا تذکرہ ایک ایک

دو دو شعروں میں کیا ہے، ان میں سب سے پہلے ٹالسٹائے، پھر کارل مارکس پھر ہیگل، پھر مزدک، اور اس کے بعد کوہکن لب کشا ہو کر اپنا فلسفہ بیان کرتے ہیں۔ ہیگل کہتا ہے:۔

جلوہ دہد باغ و زاغ معنی مستور را
عینِ حقیقت نگر حنظل و انگور را
فطرتِ اضداد خیز لذتِ پیکار داد
خواجۂ و مزدور را آمر و مامور را

اِن اشعار کے ساتھ ہیگل کے مخصوص فلسفۂ جدل و پیکار کی شرح کس قدر ضروری ہو جاتی ہے، اسی طرح ذیل کے اشعار میں برگسان کی حکمت کا جو خلاصہ موجود ہے، اس کو نمایاں اور متعین کرنے کی ضرورت ہے۔

پیغام برگسان کے عنوان سے یہ اشعار پیام مشرق ہیں۔

تا بر تو آشکار شود راز زندگی
خود را جدا ز شعلۂ مثالِ شرر مکن
ہر نظارہ جز نگہ آشنا میار
در مرز و بوم خود چو غریبان گذر مکن
نقشے کہ بستۂ، ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رسان کہ ادب خوردۂ دل است

آخری مصرع میں برگسان کا فلسفہ الہام و تجلی بیان ہوا ہے، اس کے سمجھنے کے لئے برگسان کے خیالات کا ایک خلاصہ کتاب میں ہونا ضروری ہے پیام مشرق ہی میں ایک دوسرے مقام پر حکمائے مغرب کی حکمت کا بیان ایک ایک شعر میں ہوا ہے:۔

لاک | ساغرش را سحر از بادۂ خورشید افروخت
ورنہ در محفلِ گل لالہ تہی جام آمد

کانٹ | فطرتش ذوق مئے آئینہ فامے آورد
از شبستانِ ازل کوکب جامے آورد

برگساں | نہ مئے از ازل آورد، نہ فامے آورد
لالہ از داغِ جگر سوز دوامے آورد

اس کے بعد بعض شعراء کے پیغام کی خصوصیت اِن اشعار میں بیان ہوئی ہے:-

براؤننگ | بے پشت بود بادۂ سر جوشِ زندگی
آب از خضر بگیرم و در ساغر افگنم

بائرن | از منتِ خضر نتواں کرد سینہ داغ
آب از جگرم بگیرم و در ساغر افگنم

غالب | تا بادۂ تلخ تر شود و سینہ ریش تر
بگداز م آبگینہ و در ساغر افگنم

رومی | آمیزشے کجا گہرِ پاکِ او کجا
از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم

ان اشعار میں ہر شاعر کی شاعری کا لب لباب موجود ہے، جس کو مبتدی رہنمائی کے بغیر سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔

اس کے علاوہ حکمت، فلسفہ، سیاسیات، اجتماعیات، مذہب اور روحانیت سے متعلق بیسیوں اشارے کلام اقبال میں اس انداز سے آجاتے ہیں کہ ان کی ماہیت معلوم کئے بغیر، مطالعہ کرنے والا آگے نہیں بڑھ سکتا، مثلاً خودی کا سرسری مفہوم، جہاد اور کش مکش کا ابتدائی تصور، فقر اور اس کی عارفانہ تشریح، عشق، جمال اور جلال کی تعبیر، تقدیر اور توحید کے معانی، جمہوریت، آمریت اور اشتراکیت کی مجمل تعریف، فلاسفہ یورپ کے خیالات کا خلاصہ، ان تمام امور و مسائل کے تمہیدی پہلوؤں سے واقف ہونا ضروری ہے، ورنہ اصحاب علم و نظر کے علاوہ، عام مطالعہ کرنے والوں کے بیشتر طبقات کلام اقبال کے متعلق غلط فہمیوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ اس لئے کہ فکر اقبال درحقیقت خواص اور علماء کے غور و فکر کے لئے ہے، عوام تشریح و تعبیر کے بغیر اس سے متمتع نہیں ہو سکتے۔

میں اس سلسلے میں ناظرین کرام کو خودی کے تصور کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں، تصوف نے آج تک "خود" کو مٹانے اور خودی کو فنا کرنے کی تلقین کی ہے حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر فرماتے ہیں:-

با ما بہ نشین و باخود منشین

لسان الغیب حافظ فرماتے ہیں:-

میان عاشق و معشوق ہیچ حائل نیست
تو خود حجاب خودی حافظ از میان برخیز

ہمام تبریزی بھی اس قسم کا خیال ظاہر کرتے ہیں:-

در میانِ من و محبوب حجاب است ہمام

باشد آن روز کہ آن ہم زمیان برخیزد

نفی خودی تصوف کا بنیادی عقیدہ ہے، کیونکہ خودی کا احساس صوفیہ کے نزدیک ایک گناہ ہے:

وَجُودُكَ ذَنبٌ لَا يُقَاسُ بِهٖ ذَنبٌ

اس عقیدے کی بنیاد اِس خیال پر قائم ہے کہ انسان دراصل گلشنِ قدس کا ایک پھول تھا، اور ذاتِ باری کا جزو، خداوند تعالیٰ کے شوقِ ظہور نے دُنیا کو پیدا کیا، اور انسان کو اس نئی بستی کا حاکم اور مالک بنایا، گویا کل نے جزو کو عارضی طور پر اپنے آپ سے الگ کر دیا، اب یہ جزو کل سے ملنے کے لئے بیقرار ہے، جب تک حجابِ جسمانی موجود ہے، یہ جزو کل سے ہم کنار نہیں ہو سکتا، لہٰذا صوفیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ خود کو مٹانا ہی تمام مسرتوں کا سرچشمہ اور راحتوں کا منتہا ہے، اس خیال کو تمام صوفی شعراء بڑی قوت اور بڑے جوش کے ساتھ ظاہر کرتے آئے ہیں:

خواجہ حافظ فرماتے ہیں:-

من ملک بودم و فردوس بریں جایم بود

آدم آورد دریں دیر خراب آبادم

نظیری کی پہلی غزل بھی اسی مضمون کی حامل ہے:

در آن گلشن ہوا بودم کہ ہستی زاد از نرگس

در آں مجلس صفا بودم کہ عشق از حسن شد پیدا

بزحمت اتصال اُفتد چو پیوندے برید از ہم

کہ بفرصت قطرہ دریا می شود چوں قطرہ شد دریا

رومی کی مثنوی کے ابتدائی اشعار کا مضمون بھی یہی ہے۔

از نیستان تا مرا ببریدہ اند — از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

سینہ دارم شرحہ شرحہ از فراق — من چہ گویم شرح درد اشتیاق

تصوف کے اس عقیدے کا اثر اس قدر گہرا اور ہمہ گیر ہے کہ خود علامہ اقبال نے اپنی ابتدائی نظموں میں یہ رنگ قبول کیا، اور یہی صوفیانہ لے نکالی، چنانچہ ایک نظم میں فرماتے ہیں:

مجھ سے خبر نہ پوچھ حجاب وجود کی
شام فراق صبح تھی میری نمود کی
وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا
زیب درخت طور میرا آشیانہ تھا (وغیرہ)

اس سے یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ خودی کو جو کل و جزو میں تفریق کا سبب ہے مٹانا تصوف کے مسائلِ مہمہ میں سے ہے، اس کے برعکس اقبال نے خودی اور بیخودی کا ایک نیا تصور ہمارے سامنے رکھا ہے، جس کا مفہوم معاشیاتی، نفسیاتی، سیاسی یا عمرانی ہے، اسرار خودی سے لیکر ارمغان حجاز تک سب کتابوں میں یہ تصور روح رواں کا درجہ رکھتا ہے، جس طرح گوشت کو ناخن سے جدا نہیں کیا جا سکتا اسی طرح تصور خودی کو اقبال کے نظام فکر سے الگ نہیں کیا جا سکتا، خودی کا یہ تصور بظاہر تصوف کے عقیدۂ خودی، کے بالکل ضد ہے، اگر صوفی خود کو مٹا کر کمال کی معراج پر پہنچنے اور پہونچانے کا مدعی ہے، تو اقبال خودی کی تربیت کے ذریعے شرف انسانیت کو اعلیٰ مدارج سے روشناس کرانے کا دعویٰ دار، ایک کے نزدیک خودی کی موت میں حیات ہے، اور دوسرے کے نزدیک خودی کی تربیت میں زندگی اور اس کی موت میں ممات ہے، یہ ایک تضاد ہے، اور بہت بڑا

تضاد ہے جس کو رفع اور دونوں مسائل کا ابتدائی تجزیہ کرنا مطالعہ اقبال کی تسہیل کے لئے ضروری مبادی میں سے ہے؛

مندرجۂ بالا تصریحات سے ایک اور ضروری سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ اقبال تصوف کو کس نظر سے دیکھتے ہیں، کلام اقبال کے ناقص مطالعہ کی وجہ سے ایک خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے کہ اقبال تصوف کے مخالف تھے، لیکن کیا یہ خیال صحیح ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ مروجہ تصوف کے بعض بیمار اور ناقص پہلوؤں سے قطع نظر ہماری تہذیب اور ہمارے علوم بہت بڑی حد تک صوفیوں کے اثراتِ حسنہ کے رہینِ منت ہیں، یہاں تک کہ علمائے ظاہر نے مذہب اور دین کی جتنی خدمت کی ہے صوفیائے کرام نے کسی طرح اس سے کم خدمت انجام نہیں دی، اونھوں نے لوگوں کو ایمان وایقان کی دولت سے بہرہ ور کیا ہے، یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ امام ابن تیمیہ جو تصوّف کے بڑے مخالف خیال کئے جاتے ہیں، وہ بھی علامہ ابن قیم کے بقول تصوف کی روح کے منکر نہ تھے، (ملاحظہ ہو اغاثۃ اللھفان اور مدارج السالکین)

پھر کیا علامہ اقبال اس تصوف کے مخالف ہو سکتے ہیں؟ میرے خیال میں اقبال کے متعلق یہ رائے قائم کر لینا کسی طرح بھی درست نہیں، لیکن مسائل اقبال کی تنقیدی تشریح کے بغیر اس قسم کی بیسیوں غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے۔

علامہ اقبال تمام برگزیدہ صوفیوں کے مداح تھے، اور ان میں بعضوں کی خدمت میں نذرانۂ عقیدت بھی پیش کیا ہے جو اُن کے کلام میں موجود ہے لیکن آخری عمر میں منصور حلاج کی نسبت اُن کا جذبۂ تحسین بہت بڑھ گیا تھا۔ اس کی کتاب "کتاب الطواسین" اقبال کی محبوب کتابوں میں سے تھی، یہ امر بھی

دوسرے بہت سے مسائل کی طرح قابل تشریح ہے، کہ اقبال اپنی شخصیتوں میں منصور کو اتنا اہم درجہ کیوں دیتے ہیں؟

میں نے اقبال کے مسائل مبہمہ کی تشریح کے سوال کو اس لئے زیادہ اہمیت دی ہے کہ ان کے صحیح اور معین تصور کے بغیر فکر اقبال مبہم ہو کر رہ جاتا ہے، اور مطالعہ کرنے والے سب کچھ پڑھ چکنے کے بعد بھی کہتے ہیں:

ع حیرت اندر حیرت است و مشکل اندر مشکل است

اقبال کے سرچشمہ ہائے فیض

علامۂ اقبال نے جن ماخذ سے فائدہ اُٹھایا ہے، ان کی فہرست طویل ہے ان ماخذ میں کلام اللہ اور سنت رسول اللہؐ کے علاوہ بہت سے قدیم و جدید اسلامی و مغربی مفکرین کی کتابیں بھی شامل ہیں، مگر اس وسیع استفادے کے باوجود یہ کہنا غلط نہ ہوگا، کہ اقبال نے اپنی حکمت کی اساس اسلام کے عقائد اُصولیہ اور حکمائے اسلام کی حکمت عالیہ پر رکھی ہے!

Humphry trevelyan نے اپنی کتاب
"Popular Back Ground to Goethes Hellenism."
For Good Orill میں گوئٹے کے متعلق لکھا ہے:-

"Goethe could not get away from the Greeks."
(Introduction, IX)

حقیقت یہ ہے کہ گوئٹے کو حکمائے یونان سے جو وابستگی تھی، اس سے ہزاروں درجہ زیادہ دلبستگی اقبال کو فکر اسلامی سے تھی، اونھوں نے ۱۹۲۶ء میں علوم اسلامیہ کے نصاب کے متعلق صاحبزادہ آفتاب احمد خاں مرحوم

کے نام جو خط لکھا تھا، اوس سے ایک طرف ان کی اس محبت اور شیفتگی کا پتہ چلتا ہے، جو اُنھیں علوم اسلامیہ سے تھی، اور دوسری طرف اس ذہنی اور مذہبی نصب العین کی تعیین ہوتی ہے، جو علامہ کے پیش نظر تھا، وہ چاہتے تھے کہ اسلامی تمدن اور موجودہ علوم کے درمیان حیاتِ دماغی کے تسلسل کو قائم رکھا جائے، اور دماغی اور ذہنی کاوش کو ایک نئی وادی کی طرف مہمیز کیا جائے، اور ایک نئے دینیات وکلام اور حکمت کی تعمیر و تشکیل میں اس کو برسرکار لایا جائے، اس غرض کے لیے اُونھوں نے جن جن شعبوں کے قیام کی تجویز پیش کی ہے اور جن جن کتابوں کے نام گنائے ہیں، اُن سے علامہ کی پسند و ناپسند کا بخوبی پتہ چلتا ہے، علامہ کے خیال میں ان علوم کے بغیر نہ ملت کی روحانی ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں، نہ نئی نسلوں کا ذہنی اور روحانی مطمح نظر ہی معین ہوسکتا ہے، اور نہ کسی خالص اسلامی تہذیب اور نظام فکر کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے، علامہ نے اپنی زندگی میں اس نصب العین کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کی، اُن کے افکار اور کلام میں علوم اسلامیہ کا بہترین خلاصہ موجود ہے، جو شاعرانہ زبان میں ہونے کی وجہ سے اگرچہ تلمیحی اور ایمائی حیثیت رکھتا ہے، لیکن ارباب فکر ان اشارات وکنایات کو کسی قدر کوشش کے ساتھ پوری طرح پھیلا سکتے ہیں، میری رائے میں ان علوم سے ابتدائی واقفیت کے علاوہ ہمارے لئے ان حکمائے اسلام اور صوفیائے کرام کے عقائد کا جاننا بھی ضروری ہے، جن کے سرچشمۂ فیض سے فکر اقبال سیراب ہوتا رہا۔

رومی ان میں سب سے پہلا نام مولانائے روم کا ہے، فکر اقبال کے مآخذ میں رومی کو سنگ بنیاد کی حیثیت حاصل ہے اقبال رومی کو اپنا

ہادی اور پیشوا خیال کرتے ہیں، اور بار بار اعلان کرتے ہیں، کہ میرے میکدے کی شراب دراصل پیر روم کے خمستان کی حاصل کردہ ہے، اقبال زندگی کے اسرار کی نقاب کشائی کرتے ہیں، مگر اس انکشاف کا سہرا اپنے مرشد رومی کے سر باندھتے ہیں، یہی رومی جاوید نامہ کے زندہ رود کے لئے خضر راہ بنتے اور اُسے آسمانی دنیا کی طلسماتی فضا کی سیر کراتے ہیں، اور جب حکیم مشرق زندگی کے کام کی تکمیل کر چکنے کے بعد اقوام شرق کو آخری پیغام دیتا ہے تو اس وقت اسی حکیم کی روح ندائے سروش بن کر مژدۂ انقلاب لاتی ہے، یہ مولانا جلال الدین الرومی ہی ہیں جو اقبال کی نظر میں کلیم بھی ہیں، اور حکیم بھی، مجدد بھی ہیں اور مصلح بھی، شاعر بھی ہیں اور ساحر بھی ہیں، ولی بھی ہیں اور مجذوب بھی، طریقت کے دشوار گذار راستوں کے راہ بر بھی ہیں، اور حقیقت کے مرحلوں کے ہادی بھی، شریعت کے غوامض کے عقدہ کشا بھی ہیں، اور حکمت کے دقائق کے شارح بھی، غرض اقبال کے نزدیک ہماری موجودہ "کرم خوردہ" ملت کے تمام روحانی اور ذہنی امراض کو شفا بخشنے والا رومی ہے، جس کی تعلیمات کو اقبال نے اپنے افکار میں دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی ہے، اور یہ استغراق اس درجہ ہے کہ اقبال اپنے آپ کو "مثیل رومی" قرار دیتے ہیں، اُن کے نزدیک عہد قدیم میں رومی ملت کے لئے پیغام حیات لائے تھے، اور اس پر آشوب دور حاضر میں وہ خود اس کے مبلغ اور داعی ہیں:

اقبال کے نزدیک رومی کی زندگی اور ان کی حکمت کو جو اہمیت حاصل ہے، اس کے پیش نظر فکر رومی کی تدوین اور تشریح کرنا ہمارے لئے حد درجہ ضروری ہے، تاکہ اقبال کا مطالعہ کرنے والوں کو رومی کی صحیح

عظمت کا احساس ہو سکے، رومی کے فلسفے کی ممتاز خصوصیات سے دنیا کو روشناس کرائیں، اُن کے امتیازات اور دورِ جدید پر اس کے اثرات دکھانے کی کوشش کریں، اس سلسلہ میں سب سے پہلے رومی کے اُن اشعار کی تشریح کی ضرورت ہے جو علامہ کی تصنیفات میں بڑی کثرت کے ساتھ آئے ہیں تاکہ علامہ کے خیال کا سیاق و سباق سمجھ میں آسکے، مبتدیوں کے لئے اگرچہ اتنا ہی کافی ہے، لیکن اہل علم کا کام اس پر ختم نہیں ہو جاتا، اس سے رومی کے عمیق مطالعہ کی وسیع شاہراہیں ہمارے سامنے کھلتی ہیں، جو مطالعۂ اقبال کی نہایات میں سے ہے۔ خود علامہ نے بار بار ہمیں فکر رومی کی گہرائیوں میں ڈوب جانے کی ترغیب دی ہے:

گسستہ تار ہے تری خودی کا راز ابتک
کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز ابتک

اب تک جس قدر مضامین لکھے جا چکے ہیں، ان میں اقبال اور رومی کے مشترکہ خیالات پر بہت کم روشنی ڈالی گئی ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے، شاید ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم ہی ایک ایسے شخص ہیں، جنھوں نے اپنے مضمون "رومی نطشے اور اقبال" میں واضح طور پر ان خاص تصورات کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے، جو اقبال نے رومی سے اخذ کئے ہیں، اسی طرح چند اور بزرگوں نے بھی اشارۃً اور ضمناً اس بنیادی مسئلے کی طرف توجہ کی ہے، لیکن اس مہتم بالشان بحث کے متعلق یہ اختصار بالکل ناکافی ہے، کیونکہ فکر رومی کی تجدید و ترویج ہی علامہ اقبال کے مقاصد زندگی میں تھی، ایسی حالت میں کیا شارحین اقبال کا سب سے ضروری فریضہ نہیں کہ وہ فکر اقبال کے طالبین کو حکمت رومی کے امتیازات

سے روشناس کریں تاکہ وہ اس کی روشنی میں علامہ اقبال کے افکار سے پوری طور سے آگاہ ہوسکیں، مشرق میں مولانائے روم کی مثنوی کو ابتداء سے اس قدر تقدس حاصل رہا ہے کہ عقیدت مندوں نے اُسے "قرآن در زبان پہلوی" کا خطاب دیکر آنکھوں اور دلوں میں جگہ دی، ایران، ترکی، عرب، اور ہندوستان میں مثنوی کی بیسیوں شرحیں لکھی گئیں، علی الخصوص ہندوستان میں مطالعہ رومی کی طرف جتنی توجہ ہوئی اس کے مقابلہ میں شاید ہی کسی اور کتاب کو پیش کیا جاسکے۔ عبداللطیف عباسی کی لطائف المعنوی، نواب شکراللہ خاں خاکسار کی شرح، ملا ایوب پارسا لاہوری، ملا سعید، محمد عابد اور مولانا محمد افضل الہ آبادی کی شرحیں اور بالآخر ملا بحرالعلوم کی تفسیر مثنوی اُن چند ممتاز شرحوں میں سے ہیں۔ جو مثنوی رومی کے مطالعہ کے سلسلہ میں تحریر میں آئیں، مثنوی رومی کے مطالعہ کی طرف سب سے زیادہ توجہ ہندوستان میں اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں ہوئی، نواب عاقل خاں رازی میر عسکری کو اسرار مثنوی کے حل کرنے میں خاص مہارت حاصل تھی، اس امیر کے زیر اثر مطالعہ رومی کے شوق وذوق کو بڑی ترقی ہوئی، عہد عالمگیری جیسا کہ باخبر حضرات سے پوشیدہ نہیں، شدید سیاسی کشمکش کا زمانہ تھا۔ جس میں ہندوستانیوں کے طبائع شورش اور روحانی آشوب کی مخالفتوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے کسی نوشدارو کی جستجو میں تھے، ہیجان واضطراب کے ان ایام میں شاید مطالعۂ رومی ہی وہ نوشدارو تھا، جس کے استعمال سے عہد عالمگیری کے لوگ اطمینان قلب حاصل کرتے تھے۔

پس علامہ اقبال نے ارشاد وہدایت کے لئے جس برگزیدہ ہستی کو

کو منتخب کیا ہے، وہ اس امر کا بجا استحقاق رکھتی ہے، کہ عالم انسانیت، آفات و فتن کے اس نئے دور میں بھی اس کے تجویز کردہ نسخۂ شفا سے اپنے روحانی عوارض کا علاج کرے، موجودہ دور اپنے نتائج کے اعتبار سے ملت اسلامی اور مسلمانوں کے حق میں تاتاری دور سے کسی طرح کم نہیں، جس کی دشواریوں اور پرپیچ مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لئے علامہ اقبال نے مرشد رومی کے دامن سے تمسک کرنے کی ضرورت محسوس کی، رومی کی حکمت "عقلیت" کی دشمن ہے اور ادبستان دل کی طرف رہنمائی کرتی ہے، مانا کہ ہم کو رومی کے صفحات میں تجاذب اجسام اور تجدد امثال جیسے دقیق سائنٹفک مسائل بھی ملتے ہیں، لیکن اہل کشف و شہود کی بارگاہ میں ان ادنیٰ حقیقتوں کا علم کوئی خاص پایہ نہیں رکھتا، رومی کا سب سے بڑا امتیاز "عشق" کا جذب و سرور پیدا کرنا ہے، اور دور حاضر کے لئے سب سے زیادہ اسی کی ضرورت ہے۔

رومی کے متعلق بہت کچھ کہہ چکا اس سے زیادہ اس بحث کو طول دینے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، آخر میں پھر اسی کا اعادہ کرونگا کہ اقبال کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے رومی کو نہ صرف سمجھنا چاہیئے، بلکہ اس کو مقبول عام بنانا چاہیئے، اور حکمت رومی کے ایسے دبستان قائم کرنے چاہئیں، جن میں اسلامی حکمت و تصوف کے ماہرین فکر رومی کے قلزم زخار کی غواصی کریں اور جو کچھ اس تلاش و جستجو سے حاصل ہو اسے دنیا کے سامنے پیش کریں۔

سنائی اور عطار اقبال نے عطار اور سنائی سے بھی استفادہ کیا ہے سنائی سے زیادہ اور عطار سے کم۔ بال جبریل میں

وہ قطعہ آپ کی نظر سے گزرا ہوگا جو حکیم سنائیؒ غزنوی کے مزار پر لکھا گیا تھا۔ اور جو حکیم علیہ الرحمۃ کے ایک قصیدہ کے تتبع میں ہے، اس قطعے میں کتنا جوش، کتنا سرور اور کتنا سوز ہے، ہر ہر شعر سے جذبات کے طوفان امنڈ رہے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر مشرق جب حکیم سنائیؒ کے مزار پر پہنچتا ہے تو سنائیؒ کی عظمت اس کے پہنائے قلب پر چھا جاتی ہے اور رومی کا یہ مصرع بیساختہ اس کی زبان پر جاری ہو جاتا ہے کہ

ع ما از پے سنائیؒ و عطار آمدیم

"مسافر" میں بھی وہ نظم موجود ہے جس میں حکیم موصوف سے استصواب کرتے ہیں۔

حکیم سنائیؒ سے علامہ اقبال کی عقیدت کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ حکیم علیہ الرحمۃ بھی سلسلہ رومی سے تعلق رکھتے ہیں، یہ وہ بزرگ ہیں جن سے کسب فیض کا رومی کو خود اعتراف ہے، بلکہ ان کے ہم سلسلہ ہونے پر فخر کا اظہار کیا ہے۔ حکیم سنائیؒ کی زندگی کے واقعات نفحات الانس وغیرہ میں بہ تفصیل موجود ہیں، جن سے حکیم علیہ الرحمۃ کے صاحب عرفان ہونیکا پورا پورا پتہ چلتا ہے، ان کی کتابیں حدیقۃ الحقیقۃ اور طریقۃ الحقیقۃ فارسی کی صوفیانہ شاعری کے لئے (Classics) اور بنیادی کتابوں کا درجہ رکھتی ہیں، خود شیخ عطار اور مولانا روم ان سے بے حد متاثر ہوئے۔ مجھے یونیورسٹی لائبریری کی سابق ملازمت کے سلسلہ میں اس کا پورا علم ہے کہ علامہ اقبال اکثر حدیقہ اور اس کی شرحوں سے استفادہ کیا کرتے تھے بلکہ ان کا ارشاد تھا کہ حدیقہ کی تعلیم کو ہمارے نظام تربیت میں خاص جگہ ملنی چاہیئے۔

حدیقہ کیا ہے؟ اس میں کیا خاص اہم علمی و حکمی مسائل زیر بحث آئے ہیں؟ اور وہ کون سے نکات ہیں، جو جدید علوم کی توسیع کے بعد حدیقہ کے ذریعہ زیادہ روشن اور واضح ہو سکتے ہیں؟ علامہ اقبال کو سنائی سے کیوں اس قدر دلچسپی تھی؟ یہ وہ باتیں ہیں جن کا جاننا ہر محب اقبال کے لئے ضروری ہے۔

سنائی کی طرح علامہ کو عطار سے بھی دلچسپی ہے، لیکن بہت زیادہ نہیں جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ عطار کی تصانیف بے شمار ہیں، اور کسی حد تک غیر دلچسپ، یونیورسٹی لائبریری میں مثنویات عطار کا جو قدیم نسخہ ہے اس میں ان کی کم و بیش چوبیس تصانیف نظم موجود ہیں، اس نسخے کی ضخامت سات سو صفحات کے قریب ہے، مزید یہ کہ بہت سی مثنویاں عطار کی طرف غلط طور پر منسوب ہیں، اس کے علاوہ یہ سبب بھی ہے کہ سنائی اور عطار دونوں رومی کے سلسلۂ اساتذہ میں ہیں، اور ان کے خیالات کا بیشتر حصہ رومی نے اپنی مثنوی میں لے لیا ہے۔

تاہم عطار چونکہ اقبال کے اساتذۂ روحانی میں سے ہیں، اس لئے انکی سوانح حیات، تصانیف اور افکار سے واقف ہونا خالی از فائدہ نہیں!

سعد الدین محمود شبستری | زبور عجم کا "گلشن راز جدید" شبستری کے گلشن راز کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ شیخ شبستری تاتاری انقلاب کے زمانہ کے بزرگ ہیں، اس دور میں خاک ایران نے جو بلند پایہ ہستیاں پیدا کیں ان میں سے ایک صاحب گلشن راز بھی ہیں، گلشن راز تصوف کی دقیق کتابوں میں سے ہے، علامہ نے اس کا بڑا گہرا مطالعہ کیا ہے پھر اس کے پیغام کو نئے لباس میں ملبوس کرتے ہوئے گلشن راز جدید کی صورت میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے!

اقبال اور شبستری کے فکر کے مقاماتِ اتصال کیا ہیں؟ اور وجوہ اختلاف کون سے ہیں؟ اقبال اور شبستری دونوں کا سطحِ نظر کیا ہے؟ اور ان میں سے ہر ایک کس نئے انقلاب کا مدعی ہے؟ اِن سب سوالات کا جواب مطالعۂ اقبال کے سلسلے میں ضروری ہے، میں نے اپنے ایک مضمون "اِقبال اور شعرائے فارسی" میں ان سوالات کے جواب دینے کی کوشش کی ہے لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں گلشن راز کے بہت سے مسائل سمجھنے سے قاصر رہا؛

میں نے اِس مضمون میں اختصار کے ساتھ اِقبال کے اِسلامی مآخذ کا ذکر کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن یہ بحث اِس درجہ دقیق اور پراز مسائل ہے کہ اس مختصر سے مضمون میں اس کے مبادی تک کا بھی تذکرہ نہیں ہوسکتا تاہم اس سے اِتنا واضح ہوگیا ہوگا کہ حکمتِ اِقبال کے اجزائے ترکیبی میں مسلمان صوفیوں اور حکماء کی حکمت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ اپنے دور کے حکیم اور عارف اقبال کی حکمت کا صحیح تجزیہ کرسکیں تو ہمیں علوم اِسلامیہ اور خاص کر اُس چمن فکر کی سیر کرنی چاہیئے، جس کے گلہائے رنگا رنگ سے گلشن اقبال کو یہ رونق حاصل ہوئی۔

حکمائے مشرق کی طرح اقبال نے حکمائے مغرب سے بھی بے حد استفادہ کیا ہے، مطالعۂ اقبال کے اس پہلو کے متعلق کچھ کام ہوچکا ہے لیکن ابھی وہ ناکافی ہے، اس کے لئے فلسفۂ جدید سے عمومی واقفیت اور بعض بڑے بڑے فلسفیوں کے خصوصی اور نمایاں پہلوؤں سے واقف ہونا ضروری ہے، مثلاً نطشے، برگساں، ولیم بلیک، کانٹ، الیگزینڈر میک ٹیگرٹ وغیرہ۔

شاہد حسین رزاقی
ایم۔ اے (عثمانیہ)

اقبال اور وطنیت

نرالا سارے جہاں سے اسکو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

عہد حاضر کے عظیم ترین انسان اور شاعر اعظم حضرت علامہ اقبال مرحوم نوع انسانی کی عالمگیر تنظیم اور فلاح و نجات انسانی کی تحریک کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسی تمام تحریکوں اور نظریوں کی شدید مخالفت کی ہے جو وحدت انسانی کے حصول میں رکاوٹ پیدا کرتے ہیں اور جن کی ترویج تمام انسانوں، بالخصوص مسلمانوں کے حق میں ایک لعنت ثابت ہوئی ہے۔ چونکہ اس قسم کے نظریات میں وطنیت اور جغرافی اور نسلی قومیت کے تصورات سب سے زیادہ تباہ کن ہیں اس لئے اقبال نے ان کی شدید تر مخالفت کی اور ان کے بجائے اسلامی اصولوں پر عمل پیرا

ہونے کی تعلیم دی کیونکہ رنگ و نسل کے امتیازات اور قوم و وطن کے تعصبات کو ختم کرنے کے کامیاب ترین اصول اسلام نے پیش کئے ہیں اور وحدت انسانی کے حصول کی تمام توقعات اُمت مسلمہ ہی سے وابستہ ہیں۔

بعض کم فہم اشخاص جو اقبال کی اعلیٰ تعلیمات کی حقیقت کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے اقبال پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اُن کے مخاطب صرف مسلمان ہیں اور چونکہ ان کی شاعری کی اساس فرقہ وارانہ رجحانات ہیں اس لئے وہ قومیت اور وطنیت کے مخالف ہیں۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس ضمن میں یہ بات ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ صرف مسلمانوں کی ترقی وفلاح اور تنظیم واصلاح کی کوششوں کو فرقہ داریت قرار دینے والے اشخاص اپنی تنگ نظری اور اسلامی تعلیمات کے بنیادی اُصولوں سے لاعلمی کا ثبوت دیتے ہیں کیونکہ مسلمان کسی اعتبار سے بھی کسی قوم کا فرقہ نہیں بن سکتے۔ اس لئے کہ وہ ایک مستقل اور جداگانہ وحدت ہیں اور ان کی وحدت دوسری تمام وحدتوں سے اس قدر مختلف، وسیع تر، بین الاقوامی اور عالمگیر ہے کہ اس کے مقابلہ میں قومیت کے دوسرے تمام تصورات وہی حیثیت رکھتے ہیں جو جدید قومیت کے مقابلہ میں قرونِ وسطیٰ کی قبیلہ بندی کو حاصل ہے اس کے علاوہ جیسا کہ خود اقبال مرحوم نے لکھا ہے یہ اعتراض اس اعتبار سے بھی بے بنیاد ہے کہ شاعری اور فلسفہ میں انسانی نصب العین ہمیشہ عالمگیر رکھا جاتا ہے لیکن اس نصب العین کی تحصیل جب عملی زندگی میں کی جائے گی تو لامحالہ اس کا اندازہ کسی خاص جماعت سے وابستہ ہوگا جو اپنا ایک مستقل اور مخصوص موضوع رکھتی ہو اور جس کے حدود میں اشاعت عملی ولسانی وسیع پیمانے پر ہو سکتی ہو۔ اقبال کے عقیدے میں یہ جماعت اسلام ہے کیونکہ نسلی امتیاز جو اقوام کے اتحاد اور

اشتراکی عمل کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے اس کی کامیاب ترین مخالفت اسلام نے کی ہے اسلام اور نسلی و قومی امتیازات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہ اصول نہ صرف اسلام بلکہ تمام عالم انسانیت کے سب سے بڑے دشمن ہیں اور جب اقبال نے یہ دیکھا کہ مسلمان بھی اپنے نصب العین کو چھوڑ کر قومیت اور وطنیت کے جال میں گرفتار ہو رہے ہیں تو بہ حیثیت ایک مسلمان اور محب بنی نوع انسان کے انھوں نے اپنا یہ فرض سمجھا کہ ارتقاء انسانیت میں مسلمانوں کو اُن کے اصل فرائض یاد دلائیں۔

اسلامی نظام کی تلقین اور وطنیت کی مخالفت کا درحقیقت یہی سبب ہے ورنہ جہاں تک کہ حب وطن کا تعلق ہے اقبال کو ہندوستان کے ہر ایک انقلابی اور قوم پرست شاعر سے بدرجہا زیادہ ہندوستان کی فلاح و بہبود اور اس کی آزادی سے محبت ہے اور اس کا بہترین ثبوت ان کی متعدد نظمیں ہیں۔ اس ضمن میں ان کے بے مثل شاہکار "جاوید نامہ" کا وہ حصہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں انھوں نے قلزم خونیں، روح ہندوستان اور اس کے نالہ و فریاد کا نقشہ پیش کیا ہے اور ملک و ملت کے غدار میر جعفر اور میر صادق کو ننگ آدم، ننگ دین، ننگ وطن قرار دے کر ان کی روحوں کو اس قدر ذلیل تصور کیا ہے کہ دوزخ نے بھی اُن کو قبول کرنا گوارا نہ کیا اور وہ ایک قلزم خونیں میں مبتلائے عذاب ہیں۔

علامہ اقبال کی شاعری کے ابتدائی دور میں قومیت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے لیکن جب ان کی فکر و نظر میں زیادہ وسعت ہوئی اور انھیں اس حقیقت کا علم ہوا کہ مغربی تفکر کا صدف گہر سے خالی ہے اور اس کے سب اصنام محض خیالی ہیں تو انھوں نے قومیت کی پستی سے نکل کر انسانیت کی بلندی

تک پہونچنے اور تمام نوع انسانی و انسانیت کی فلاح و نجات کو اپنے پیغام کا موضوع بنایا۔ اِس مقصد کی تکمیل کے لئے اِقبال نے اسلامی اصولوں کی تلقین کو اس لئے اپنا نصب العین قرار دیا کہ اسلام تمام نوعِ اِنسانی کو واحد اِجتماعی تنظیم کے تحت منظم کرنے والا عالمگیر نظام ہے جو اِنسانیت کو رنگ و نسل اور قوم و وطن کی آلودگیوں سے پاک کر کے انسانی وحدت کی راہ ہموار کرتا ہے۔ لیکن تمام انسانوں کو اسلامی تنظیم میں داخل کرنا ایک ایسا زبردست کام ہے جس کی تکمیل کے لئے ایک مدت درکار ہے۔ چنانچہ اسلام نے اپنے نصب العین کی تکمیل تک صرف مسلم اور غیر مسلم کی تفریق روا رکھی ہے یعنے ایک وہ گروہ جو اِسلامی نظام کا تابع ہے اور دوسرا وہ گروہ جو اس نظام سے باہر ہے۔ درحقیقت یہی ایک ایسی تقسیم ہے جو عالم بشریت کو انسانی وحدت سے قریب ترین حد تک لے آتی ہے اور اس کے علاوہ نوع انسانی کی ہر تقسیم اسلام نے یکسر ختم کر دی ہے کیونکہ تفریق و تقسیم کے دوسرے تمام تصورات انسانوں کو منتشر کر کے انسانی وحدت کے حصول کو بعید تر کر دیتے ہیں۔ اِسلامی نظام کا تابع گروہ یعنے ملت اِسلامیہ یا امت مسلمہ تمام دنیا کے مسلمانوں کی واحد اِجتماعی تنظیم ہے اور اسے اِس اِعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ رنگ و نسل یا قوم و وطن کے ادنیٰ تعصبات کے بجائے تمام نوعِ اِنسانی کی اعلیٰ ترین اجتماعی تنظیم کے اُصول اس کی اساس ہیں اور اِنسانی وحدت کے حصول کا صرف یہی ایک عملی ذریعہ ہے۔ ملت یا امت کا تصور دوسرے تصورات سے اس اِعتبار سے ممیز و ممتاز ہے کہ اس تنظیم کا مرکز اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کا آئین قرآن پاک ہے۔ اس کا رہنما خاتم المرسلین ؐ ہے اور اس کا دائرۂ عمل سارا جہاں ہے۔ اور اس طرح اس تنظیم کو نہ صرف حیات دَوام

حاصل ہو جاتی ہے بلکہ حریت، مساوات اور اخوت کے تصورات بھی اسی تنظیم میں رو بہ عمل لائے جا سکتے ہیں۔ چونکہ ملت محمدیہ کی اساس توحید و رسالت ہے اس لئے وہ قید مکانی سے آزاد ہے اور اقبال نے یہ خیال پیش کیا ہے کہ

جوہر ما با مقامے بستہ نیست — بادۂ تندش بہ جامے بستہ نیست
مسلم استی دل بہ اقلیمے مبند — گم مشو اندر جہان چون و چند
می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم — در دل او یاوہ گردد شام و روم

ملت کی اس امتیازی حیثیت سے مسلمانوں کو باخبر کرنے کے لئے اقبال نے یہ کہا ہے کہ:۔

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمیؐ
اُن کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

چونکہ وطنیت اور اس پر مبنی قومیت کا تصور اسلامی تعلیمات کے برعکس ہے اس لئے اقبال وطنیت کو مذہب کا کفن اور غارت گر کاشانۂ دین نبویؐ قرار دے کر مسلمانوں کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ:۔

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانہ کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

اور وطنیت کی اس قدر مخالفت کا حقیقی سبب صرف یہی ہے کہ:۔

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اِس سے + قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

علامہ اقبال مرحوم نے وطنیت کے بارے میں اپنے خیالات ایک مضمون میں تفصیل سے بیان کئے ہیں جو انھوں نے وطن کو ملت کی اساس قرار دینے والے اور مقام محمدی سے بے خبر ایک گمراہ عالم کے اعتراضات کے جواب میں لکھا تھا۔ اس مضمون میں اقبال نے ان تیرہ بخت مسلمانوں کی ذہنیت کا تجزیہ کیا ہے جو روحانی جذام میں گرفتار ہیں اور انھیں فریب وطنیت سے محفوظ رکھنے کے لئے یہ صراحت فرمائی ہے کہ وطن ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک اصول ہے اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے چونکہ اسلام بھی ہیئت اجتماعیہ کا ایک قانون ہے اس لئے جب لفظ وطن ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کی حیثیت سے اسلام ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر قسم کا دستور العمل جو غیر اسلامی ہو نامعقول و مردود ہے۔ اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص اسلامی ضمیر کی تخلیق کرے اسلام ہی نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی ہے اور نہ انفرادی یا خانگی بلکہ خالصتاً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشری کو متحد و منظم کرنا ہے، ایسا دستور العمل قوم و نسل پر مبنی نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کو خانگی کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف معتقدات پر ہی مبنی کیا جا سکتا ہے صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی د

ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک امت کی تشکیل اور اُس کی بقاء کے لئے ضروری ہے اور اس سے علیحدہ رہکر جو راہ اختیار کی جائے گی وہ راہ لادینی کی ہو گی اور شرف انسانی کے خلاف ہو گی۔ چنانچہ یورپ کا تجربہ ہمارے سامنے ہے کہ جب یورپ کی وحدت دینی پارہ پارہ ہو گئی اور مسیحیت قومی زندگی کی اساس بننے کے لئے موزوں نہ ثابت ہوئی تو اس کی اساس وطن کے تصور میں تلاش کی گئی اور یہ ظاہر ہے کہ اس اساس کا کیا انجام ہوا اور کیا ہو رہا ہے۔ جو مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بہ حیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں اُن کو اقبال نے اس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو لادینی ہو گی اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اِجتماعی نظام سے بے پروائی ہو گی۔ وطنیت کا یہ تصور چند گمراہیاں بھی پیدا کر دیتا ہے۔ ایک تو یہ کہ بنی نوع انسان، اقوام میں اسی طرح بٹے ہوئے ہیں کہ ان کا نوعی اتحاد امکان سے خارج ہے دوسرے یہ کہ ہر ملک کا دین اسی ملک کیلئے ہے اور دوسری اقوام کے طبائع کے موافق نہیں۔ ان کے علاوہ یہ تباہ کن گمراہی بھی پیدا ہو جاتی ہے کہ وطنیت کا نظریہ امت مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھول دیتا ہے۔

اقبال نے نظریہ وطنیت کی تردید اس وقت شروع کی تھی جب دنیائے اِسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا ہی نہ تھا۔ کیونکہ یوروپین مصنفوں کی تحریروں سے ان کو ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ عالم اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریۂ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔ چنانچہ

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم کے بعد اسلامی ممالک میں اس شدت کے ساتھ نظریہ وطنیت کی اشاعت کی گئی کہ دنیائے اسلام کی وحدت ملی پر شدید ضرب لگی اور مسلمان بھی وطنیت اور قومیت کی لعنت میں گرفتار ہونے لگے۔ مسلمانوں کو اس تباہی سے محفوظ رکھنے کے لئے اقبال نے اُنھیں فریب وطنیت کی حقیقت سے آگاہ کیا اور خود یورپ کی مثال دیکر یہ ثابت کیا کہ قومی وحدت ہرگز قائم و دائم نہیں ہے۔ وحدت صرف ایک ہی معتبر ہے اور وہ بنی نوع انسان کی وحدت ہے جو نسل، زبان، رنگ اور قوم سے بالاتر ہے اور اس وحدت کے حصول کا واحد ذریعہ صرف اسلامی اُصول ہیں جب تک کہ جغرافیائی وطن اور رنگ و نسل کا امتیاز کاملاً نہ مٹ جائے گا اور اس ناپاک قوم پرستی کے بت کو پاش پاش نہ کر دیا جائیگا انسان اس دنیا میں فوز و کامرانی کی زندگی بسر نہ کر سکے گا۔ وطنیت کا ناپاک تصور مسلمانوں کی وحدت ملی کو شکست کر کے ان کی تباہی کا ذریعہ بن رہا ہے اور اقبال نے مسلمانوں کو اس اہم حقیقت سے آگاہ کر دیا ہے کہ ؎

بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکہ دین و وطن

اور اب دیکھنا یہ ہے کہ ؎

اس زمانہ میں کوئی حیدرؓ کرار بھی ہے

علامۂ اقبال

اقبال اور معاشیات

اقبال کی اوّلین کتاب "علم الاقتصاد" کا دیباچہ

علم الاقتصاد انسانی زندگی کے معمولی کاروبار پر بحث کرتا ہے اور اس کا مقصد اِس امر کا تحقیق کرنا ہے کہ لوگ اپنی آمدنی کس طرح حاصل کرتے ہیں۔ اور اس کا استعمال کس طرح کرتے ہیں۔ پس ایک اِعتبار سے تو اس کا موضوع دولت ہے اور دوسرے اِعتبار سے یہ اس وسیع علم کی ایک شاخ ہے جس کا موضوع خود انسان ہے۔ یہ امر مسلّم ہے کہ انسان کا معمولی کام کاج اس کے اوضاع و اطوار اور اس کے طرزِ زندگی پر بڑا اثر رکھتا ہے۔ بلکہ اُس کے دماغی قوائے بھی اس اَثر سے کامل طور پر محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تاریخِ انسانی کے سیلِ رواں میں اُصولِ مذہب بھی انتہا درجہ کا موثر ثابت ہوا ہے۔ مگر یہ بات بھی روزمرہ کے تجربے اور مشاہدے سے ثابت ہوتی ہے

کہ روزی کمانے کا دھندا ہر وقت اِنسان کے ساتھ ساتھ ہے اور چپکے چپکے اُسکے ظاہری اور باطنی قوائے کو اپنے سانچے میں ڈھالتا رہتا ہے۔ ذرا خیال کرو کہ غریبی یا یوں کہو کہ ضروریات زندگی کے کامل طور پر پورا نہ ہونے سے انسانی طرزِ عمل کہاں تک متاثر ہوتا ہے۔ غریبی قوائے انسانی پر بہت بڑا اثر ڈالتی ہے بلکہ بسا اوقات انسانی روح کے مجلا آئینہ کو اس قدر زنگ آلود کر دیتی ہے کہ اخلاقی اور تمدنی لحاظ سے اس کا وجود و عدم برابر ہو جاتا ہے۔ معلم اول یعنی حکیم اَرسطو سمجھتا تھا کہ غلامی تمدّن انسانی کے قیام کے لئے ایک ضروری جزو ہے۔ مگر مذہب اور زمانۂ حال کی تعلیم نے انسان کی جبلّی آزادی پر زور دیا اور رفتہ رفتہ مہذب قومیں محسوس کرنے لگیں کہ یہ وحشیانہ تفاوت مدارج بجائے اِس کے کہ قیام تمدّن کے لئے ایک ضروری جزو ہو اِس کی تخریب کرتا ہے اور انسانی زندگی کے ہر پہلو پر نہایت مذموم اثر ڈالتا ہے۔ اِس طرح اِس زمانے میں یہ سوال پیدا ہوا ہے کہ آیا مفلسی بھی نظم عالم میں ایک ضروری جزو ہے؟ کیا ممکن نہیں کہ ہر فرد مفلسی کے دُکھ سے آزاد ہو؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ گلی کوچوں میں چپکے چپکے کراہنے والوں کے دل خراش صدائیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جائیں اور ایک دردمند دل کو ہلا دینے والے اِفلاس کا دردناک نظارہ ہمیشہ کے لئے صفحۂ عالم سے حرفِ غلط کی طرح مٹ جائے؟ اِس سوال کا شافی جواب دینا علم الاقتصاد کا کام نہیں کیونکہ کسی حد تک اُس کے جواب کا انحصار اِنسانی فطرت کی اخلاقی قابلیتوں پر ہے جن کو معلوم کرنے کے لئے اس علم کے ماہرین کوئی خاص ذریعہ اپنے ہاتھ میں نہیں رکھتے۔ مگر چونکہ اِس جواب کا اِنحصار زیادہ تر اِن واقعات اور نتائج پر بھی ہے جو علم الاقتصاد کے دائرۂ تحقیق میں داخل ہیں

اِسواسطے یہ علم اِنسان کے لئے اِنتہا درجہ کی دلچسپی رکھتا ہے۔ اور اس کا مطالعہ قریباً قریباً ضروریاتِ زندگی میں سے ہے۔ بالخصوص اہلِ ہندوستان کے لئے تو اِس علم کا پڑھنا اور اس کے نتائج پر غور کرنا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ یہاں مفلسی کی عام شکایت ہو رہی ہے۔ ہمارا ملک کامل تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے اپنی کمزوریوں اور نیز ان تمدّنی اسباب سے بالکل ناواقف ہے جن کا جاننا قومی فلاح اور بہبودی کے لئے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ اِنسان کی تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جو قومیں اپنی تمدّنی اور اقتصادی حالات سے غافل رہی ہیں ان کا حشر کیا ہوا ہے۔ ابھی حال میں مہاراجہ بڑودہ نے اپنی ایک گراں بہا تقریر میں فرمایا تھا کہ اپنی موجودہ اقتصادی حالت کو سنوارنا ہماری تمام بیماریوں کا آخری نسخہ ہے۔ اور اگر یہ نسخہ اِستعمال نہ کیا گیا تو ہماری بربادی یقینی ہے۔ پس اگر اہلِ ہندوستان دفترِ اقوام میں اپنا نام قائم رکھنا چاہتے ہوں تو اُن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اِس اہم علم کے اصولوں سے آگاہی حاصل کر کے معلوم کریں کہ وہ کون سے اسباب ہیں جو ملکی عروج کے مانع ہو رہے ہیں۔ میری غرض اِن اوراق کی تحریر سے یہ ہے کہ عام فہم طور پر اس علم کے نہایت ضروری اصول واضح کروں۔ اور نیز بعض بعض جگہ اس بات پر بھی بحث کروں کہ یہ عام اصول کہاں تک ہندوستان کی موجودہ حالت پر صادق آتے ہیں۔ اگر ان سطور سے کسی فردِ واحد کو بھی اِن معاملات پر غور کرنے کی تحریک ہو گئی تو میں سمجھونگا کہ میری دماغ سوزی اکارت نہیں گئی۔

اِس دیباچے میں یہ واضح کر دینا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی خاص انگریزی کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ اُس کے مضامین

مختلف مشہور اور مستند کتب سے اخذ کئے گئے ہیں اور بعض جگہ میں نے اپنی ذاتی رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔ مگر صرف اُسی صورت میں جہاں مجھے اپنی رائے کی صحت پر پورا اعتماد تھا۔ زبان اور طرز عبارت کے متعلق صرف اس قدر عرض کر دینا کافی ہوگا کہ میں اہل زبان نہیں ہوں۔ جہاں تک مجھ سے ممکن ہوا ہے میں نے اقتصادی اصولوں کی حقیقی مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے اور اردو زبان میں اس متین طرز عبارت کی تقلید کرنے کی کوشش کی ہے جو انگریزی علمی کتابوں میں عام ہے۔ نئی علمی اصطلاحات کے وضع کرنے کے دقت کو ہر باذاق آدمی جانتا ہے۔ میں نے بعض اصطلاحات خود وضع کی ہیں اور بعض مصر کے عربی اخباروں سے لی ہیں جو زمانہ حال کی عربی زبان میں آج کل متداول ہیں۔ جہاں جہاں کسی اردو لفظ کو اپنی طرف سے کوئی نیا مفہوم دیا ہے ساتھ ہی اس کی تصریح بھی کر دی ہے۔ اس کتاب میں ایک آدھ جگہ انگریزی محاورہ کی تقلید میں میں نے اسم ذات کو اسم صفت کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے مثلاً سرمایہ سرمایہ داروں کی معنوں میں یا محنت محنتیوں کے معنوں میں۔ اگرچہ یہ محاورہ اردو پڑھنے والوں کو غیر مانوس معلوم ہوگا تاہم اس کے استعمال میں ایسی سہولت ہے جس کو باذاق لوگ خوب محسوس کر سکتے ہیں جہاں کئی فارسی محاورات کے لفظی تراجم اردو زبان میں مستعمل ہیں اگر اس لطیف محاورہ انگریزی کا ترجمہ بھی مستعمل کر لیا جائے تو کیا ہرج ہے۔

اصطلاحات کی نسبت ایک اور عرض یہ ہے کہ میں نے مانگ اور طلب و دستکاری اور محنت دستکار اور محنتی نفع اور منافع۔ ساہوکار اور سرمایہ دار مالک کارخانہ دار مرادف استعمال کئے ہیں۔ پیدائش اور پیداوار

کا اِستعمال ایک باریک فرق کو ظاہر کرتا ہے۔ یعنی پیدائش سے مراد فعل کی ہے اور پیداوار سے مراد نتیجہ فعل کی۔ علیٰ ہذا القیاس لفظ "تبادلہ" اُس جگہ اِستعمال کیا ہے جہاں مبادلہ اشیا و زرنقد کے وساطت سے کیا جائے اور لفظ "مبادلہ" اُس موقع پر استعمال کیا ہے جہاں ایک شئے دوسری شئے کے عوض میں دی جائے۔ عربی زبان میں "مبادلہ" کا یہ مفہوم لفظ "مقایضہ" سے ظاہر کیا جاتا ہے مگر چونکہ یہ لفظ عام فہم نہیں ہے اسواسطے میں نے اِس کے اِستعمال سے اِحتراز کیا ہے۔

اِس دیباچے کو ختم کرنے سے پیشتر میں اُستاذی المعظم حضرت قبلہ آرنلڈ صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے مجھے اس کتاب کے لکھنے کی تحریک کی اور جن کے فیضانِ صحبت کا نتیجہ یہ اوراق ہیں۔ میں اُستاذی جناب قبلہ لالہ جیارام صاحب ایم۔ اے پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور اور اپنے عزیز دوست اور ہم جماعت مسٹر فضل حسین بی۔ اے کنٹبٹ بیرسٹر ایٹ لا کا بھی مشکور ہوں جنھوں نے مجھے نہ صرف اپنے بیش قیمت کتب خانوں کی کتابیں ہی عنائت فرمائیں بلکہ بعض مسائل کے متعلق نہایت قابل قدر مشورات بھی دیئے۔ اِس کے علاوہ مخدوم و مکرم جناب قبلہ مولٰنا شبلی نعمانی مدظلہٗ بھی میرے شکریہ کے مستحق ہیں کہ اُنھوں نے اِس کتاب کے بعض حصوں میں زبان کے متعلق قابل قدر اِصلاح دی۔

علامہ اقبال

محفلِ میلادالنبیؐ اور اقبالؒ

میلادِ مبارک کی محفلوں کو ایک جماعت نے اپنے نادانشمندانہ غلو سے کام لیکر محض ایک مجموعۂ رسوم بنادیا ہے دوسری طرف اس کے مقابلہ میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوگئی ہے، جو سرے سے ان محفلوں ہی کو مٹا دینا چاہتی ہے۔ حضرت اقبال نے ایک موقع پر اس باب میں جو خیالات ظاہر فرمائے ہیں، وہ اتنی بڑی حد تک معقول و معتدل ہیں، کہ اُن کی تقریر کی رپورٹ کو "زمیندار" کے صفحات سے لیکر ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

(مُرتب)

زمانہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ انسانوں کی طبائع، اُن کے افکار اور ان کے نقطہائے نگاہ بھی زمانے کے ساتھ ہی بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا تیوہاروں کے

منانے کے طریقے اور مراسم بھی ہمیشہ متغیر ہوتے رہتے ہیں۔ اور اُن سے استفادہ کے طریق بھی بدلتے رہتے ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم بھی اپنے مقدس دنوں کے مراسم پر غور کریں اور جو تبدیلیاں افکار کے تغیرات سے ہونی لازم ہیں اُن کو مدنظر رکھیں۔

منجملہ اُن مقدس اَیام کے جو مسلمانوں کے لئے مخصوص کئے گئے ہیں، ایک میلاد النبیؐ کا مبارک دن بھی ہے۔ میرے نزدیک اِنسانوں کی دماغی اور قلبی تربیت کے لئے نہایت ضروری ہے کہ اُن کے عقیدے کی رو سے زندگی کا جو نمونہ بہترین ہو، وہ ہر وقت اُن کے سامنے رہے۔ چنانچہ مسلمانوں کے لئے اِسی وجہ سے ضروری ہے کہ وہ اُسوۂ رسولؐ کو مدنظر رکھیں۔ تاکہ جذبۂ تقلید اور جذبۂ عمل قائم رہے۔ اِن جذبات کو قائم رکھنے کے تین طریقے ہیں۔ پہلا طریق تو درود و صلوٰۃ ہے۔ جو مسلمانوں کی زندگی کا جزو لاینفک ہو چکا ہے۔ وہ ہر وقت درود پڑھنے کے موقع نکالتے ہیں۔ عرب کے متعلق میں نے سُنا کہ اگر کہیں بازار میں دو آدمی لڑ پڑتے ہیں۔ اور تیسرا بہ آواز بلند اللّٰہم صل علیٰ سیّدنا و بارک وسلم پڑھ دیتا ہے تو لڑائی فوراً رُک جاتی ہے۔ اور متخاصمین ایک دوسرے پر ہاتھ اُٹھانے سے فوراً باز آجاتے ہیں۔ یہ درود کا اثر ہے۔ اور لازم ہے کہ جس درود پڑھا جائے اُس کی یاد قلوب کے اندر اپنا اثر پیدا کرے۔

پہلا طریق اِنفرادی۔ دوسرا اجتماعی ہے۔ یعنی مسلمان کثیر تعداد میں جمع ہوں اور ایک شخص جو حضور آقائے دوجہاں صلعم کے سوانح حیات سے پوری طرح باخبر ہو، آپؐ کے سوانح زندگی بیان کرے تاکہ اُن کی تقلید کا ذوق شوق مسلمانوں کے قلوب میں پیدا ہو۔ اس طریق پر عمل پیرا ہونے کے لئے

ہم سب آج یہاں جمع ہوئے ہیں۔

تیسرا طریق اگرچہ مشکل ہے۔ لیکن بہر حال اس کا بیان کرنا نہایت ضروری ہے وہ طریقہ یہ ہے کہ یادِ رسولؐ اس کثرت سے اور ایسے انداز میں کی جائے کہ انسان کا قلب نبوت کے مختلف پہلوؤں کا خود مظہر ہو جائے یعنی آج سے تیرہ سو سال پہلے جو کیفیت حضور سرورِ عالمؐ کے وجود مقدس سے ہویدا تھی، وہ آج تمہارے قلوب کے اندر پیدا ہو جائے۔ حضرت مولانا روم فرماتے ہیں۔

آدمی دید است باقی پوست است

دید آنست آنکہ دید دوست است

یہ جوہر انسانی کا انتہائی کمال ہے، کہ اُسے دوست کے سوا اور کسی چیز کی دید سے مطلب نہ رہے۔ یہ طریقہ بہت مشکل ہے۔ کتابوں کے پڑھنے یا میری تقریر سننے سے نہیں آئے گا۔ اس کے لئے کچھ مدت نیکوں اور بزرگوں کی صحبت میں بیٹھ کر روحانی انوار حاصل کرنا ضروری ہے۔ اگر یہ میسر نہ ہو تو پھر ہمارے لئے یہی طریقہ غنیمت ہے جس پر ہم آج عمل پیرا ہیں۔

اَب سوال یہ ہے کہ اِس طریق پر عمل کرنے کے لئے کیا کیا جائے؟ پچاس سال سے شور برپا ہے کہ مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنی چاہیئے۔ لیکن جہانتک میں نے غور کیا ہے تعلیم سے زیادہ اس قوم کی تربیت ضروری ہے اور ملّی اعتبار سے یہ تربیت علماء کے ہاتھ میں ہے۔ اسلام ایک خالص تعلیمی تحریک ہے۔ صدر اسلام میں اِسکول نہ تھے۔ کالج نہ تھے۔ یونیورسٹیاں نہ تھیں لیکن تعلیم و تربیت اس کی ہر چیز میں ہے۔ خطبۂ جمعہ، خطبۂ عید،

بحج، وعظ، غرض تعلیم و تربیتِ عوام کے بیشمار مواقع اسلام نے ہم پہونچائے ہیں، لیکن افسوس کہ علماء کی تعلیم کا کوئی صحیح نظام قائم نہ رہا۔ اور اگر کوئی رہا بھی تو اس کا طریق عمل ایسا رہا کہ دین کی حقیقی روح نکل گئی، جھگڑے پیدا ہو گئے، اور علماء کے درمیان جنھیں پیغمبر علیہ السلام کی جانشینی کا فرض ادا کرنا تھا، سر پھٹول ہونے لگی۔ مصر، عرب، ایران، افغانستان ابھی تہذیب و تمدن میں ہم سے پیچھے ہیں لیکن وہاں علماء ایک دوسرے کا سر نہیں پھوڑتے۔ وجہ یہ ہے کہ اسلامی ممالک نے اخلاق کے اس معیارِ اعلیٰ کو پا لیا ہے۔ جس کی تکمیل کے لئے حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام مبعوث ہوئے تھے۔ اور ہم ابھی اس معیار سے بہت دُور ہیں۔

دنیا میں نبوت کا سب سے بڑا کام تکمیلِ اخلاق ہے۔ چنانچہ حضورؐ نے فرمایا۔ بعثت لاتمم مکارم الاخلاق یعنی میں نہایت اعلیٰ اخلاق کے اتمام کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ اِس لئے علما کا فرض ہے کہ وہ رسول اللہؐ کے اخلاق ہمارے سامنے پیش کیا کریں۔ تا کہ ہماری زندگی حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کی تقلید سے خوشگوار ہو جائے۔ اور اتباعِ سنت زندگی کی چھوٹی چھوٹی چیزوں تک جاری و ساری ہو جائے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمتہ اللہ علیہ کے سامنے خربوزہ لایا گیا تو آپ نے کھانے سے اِنکار کر دیا اور کہا کہ مجھے معلوم نہیں رسولؐ اللہ نے اس کو کس طرح کھایا ہے۔ مبادا ایس ترکِ سنت کا مرتکب ہو جاؤں ؎

کامل بسطام در تقلید فرد
اِجتناب از خوردن خربوزہ کرد

افسوس کہ ہم میں بعض چھوٹی چھوٹی باتیں بھی موجود نہیں ہیں جنسے ہماری

زندگی خوشگوار ہو اور ہم اخلاق کی فضا میں زندگی بسر کر کے ایک دوسرے کے لیے باعثِ رحمت ہو جائیں۔ اگلے زمانے کے مسلمانوں میں اِتباع سنت سے ایک اخلاقی ذوق اور ملکہ پیدا ہو جاتا تھا اور وہ ہر چیز کے متعلق خود ہی اندازہ کر لیا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رویہ اس چیز کے متعلق کیا ہوگا۔

حضرت مولانا رومؒ بازار میں جارہے تھے۔ آپ کو بچّوں سے بہت محبت تھی کچھ بچے کھیل رہے تھے، ان سب نے مولانا کو سلام کیا اور مولانا ایک ایک کا سلام الگ الگ قبول کرنے کے لئے دیر تک کھڑے رہے ایک بچہ کہیں دُور کھیل رہا تھا اُس نے وہیں سے پکار کر کہا کہ حضرت ابھی جائیے گا نہیں، میرا سلام لیتے جائیے، تو مولانا نے بچہ کی خاطر دیر تک توقف فرمایا اور اس کا سلام لیکر گئے۔ کسی نے پوچھا حضرت آپنے بچہ کے لئے اس قدر توقف کیا آپنے فرمایا کہ اگر رسول اللہ صلعم کو اس قسم کا واقعہ پیش آتا تو حضورؐ بھی یُونہی کرتے۔

گویا ان بزرگوں میں تقلیدِ رسولؐ اور اتباع سنت سے ایک خاص اخلاقی ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ اِس طرح کے بیشمار واقعات ہیں۔ علماء کو چاہیئے کہ اُن کو ہمارے سامنے پیش کریں۔ قرآن و حدیث کے غوامض بتانا بھی ضروری ہے، لیکن عوام کے دماغ ابھی اِن مطالب عالیہ کے متحمل نہیں۔ انھیں فی الحال صرف اخلاقِ نبوّی کی تعلیم دینی چاہیئے۔

مولوی نذیر الحق
میرٹھی

عقیدۂ توحید اور اقبال

ملت بیضا تن و جاں لا الٰہ ‏ ساز ما را پردہ گرداں لا الٰہ
لا الٰہ سرمایۂ اسرار ما ‏ پردہ بند از شعلۂ افکار ما

دین کے بنیادی اصول تین ہیں، انبیا علیہم السلام نے ان ہی اصولوں کی دعوت دی اور ان ہی اصولوں پر نوعِ انسان کی دینی و دنیوی بہتری، بھلائی، کامیابی، ترقی اور نجات کا دار و مدار رہے۔ قرآن پاک نے ان اصولوں کے متعلق جو تعلیم و روشنی دی ہے وہ اس قدر فطری، عقلی، کامل اور جامع ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب اس کی نظیر لانے سے قاصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اسلام کو دنیا کا آخری اور نجات دہندہ مذہب مانتے ہیں۔

دین کا پہلا اصلی اور بنیادی عقیدہ خدا پر ایمان لانا ہے، لیکن دنیا بھر کی قومیں اسی اصل میں صحیح راستے سے دور جا پڑی ہیں اور وہ خدا کی ذات و صفات کے متعلق اتنا گھٹیا درجہ کا تصور رکھتی ہیں کہ اس کا خلافِ عقل و فطرت

ہونا ہر سلیم الفطرت انسان بادنیٰ تامل معلوم کر سکتا ہے۔

اسلام سے پہلے انسان کا یہ حال تھا کہ وہ دنیا کے ذرہ ذرہ کو خدا سمجھتا تھا۔ تاریخ انسانی بتلاتی ہے کہ تمام نوع انسانی کے اندر ایک بلند و بالاتر ہستی کا اقرار و اعتراف تو موجود رہا کہ اس کا احساس وجدانی طور پر فطرت انسانی کے اندر موجود ہے لیکن گوناگون اسباب و اثرات فطرت انسانی پر قسم قسم کے پردے ڈالتے اور اُسے کچھ سے کچھ بنا دیتے رہے اور یہ فطری تصور اقوام و مذاہب نے قسم قسم کے پردوں اور لباسوں میں گم کر کے رکھ دیا اور خود ساختہ وخیالی معبودوں کے پجاری بن گئے۔

اس سلسلہ میں قرآن کریم نے جو اولین پیغام نوع انسانی کو دیا وہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے اس کلمہ کے دو حصے ہیں۔ ایک سلبی۔ یعنی اس امر کا یقین کہ دنیا میں کوئی طاقت ایسی نہیں جسے آقا، مالک، حکمران اور مربی تسلیم کیا جائے جس کی غلامی اختیار کی جائے اور جسے حاجات کا قبلۂ مقصود بنایا جائے۔ یہ نفی کا پہلو ہے۔ یعنی پہلے سے ذہن میں جو کچھ ہو اُسے مٹا دینا اور بھلا دینا چاہیئے جب ذہن یوں صاف ہو جائے تو پھر اس میں اللہ کا تصور بٹھایا جائے اور اعمال کی ایک نئی عمارت کھڑی کی جائے۔ یہ ایجابی پہلو ہے۔ کہ تمام قوتوں کے انکار کے بعد صرف معبودِ حقیقی کی غلامی اختیار کی جائے۔ تمام ذہنی فرضی، وہمی اور خیالی معبودوں اور قوتوں کو راستے سے ہٹا کر خدا اور بندے کا براہ راست تعلق پیدا کر دیا جائے۔

اس طرح جب ایک انسان عقل انسانی کے تراشے ہوئے خداؤں کی تخریب پر آمادہ ہو گیا۔ تو اس نے "لا" پر عمل اور راہ توحید پر قدم اُٹھا لیا مگر اب لغزش کا مقام آگیا۔ جہاں ممکن ہے کہ محسوسات کا خوگر انسان جھوٹ کو

پسِ فریب کو حقیقت اور باطل کو حق سمجھ بیٹھے، اپنی فطرت صالحہ کو مسخ کر لے اور حقیقت مجردہ کو خارجی پردوں اور لباسوں میں گم کر دے، دنیا کے تمام مذاہب و مسالک اس غلطی میں گرفتار ہیں اس مشکل مقام پر آکر "اِلاّ" ذہن انسانی کو گمراہی سے بچاتا اور محسوسات کے پردوں کو چاک کر کے حقائق حسن و عشق تک پہنچاتا ہے۔ اگر اس تخریب و تعمیر میں "لا" "اِلاّ" سے بیگانہ ہو جائے۔ یعنی آپ پتھر کے بتوں سے خدائی منصب چھین کر تقدس مآب انسانوں کو الوہیت کے مقام تک پہنچا دیں یا کسی فرعون کے ہاتھ سے زمام اقتدار چھین کر کسی کمزور کے ہاتھ میں دے دیں تو گویا آپ نے ایک باطل کو مٹا کر اس کی جگہ دوسرا باطل قائم کر دیا آج امت مسلمہ مذہبیات و سیاسیات کے اسی چکر میں پھنسی ہوئی ہے۔ حضرت اقبالؒ اس چیز کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

نہادِ زندگی میں ابتدا لا انتہا الاّ — پیام موت ہے جب لا ہوا الاّ سے بیگانہ
وہ ملت روح جس کی لا سے آگے بڑھ نہیں سکتی — یقین جانو ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ

ذرا غور فرمائیے علامہ مرحوم نے ان دو شعروں میں ذہن انسانی کو کہاں سے کہاں پہنچانا چاہا ہے۔ کیا ہماری قوم اسی لئے مرگ آور نیند کے مزے نہیں لوٹنے لگی کہ اس نے "لا" کو "اِلاّ" سے بیگانہ و بے تعلق کر دیا۔ نام نہاد مسلمان زبان سے لا اِلٰہ اِلاّ اللہ کہتے رہے اور دل کو صنم خانہ بنا لیا وہ بڑی سادگی کے ساتھ اس کلمہ کو پڑھ جاتے ہیں مگر اس بات کو محسوس تک نہیں کرتے کہ اس فیصلہ کن اقرار کا عقلی اقتضاء کیا ہے؟ اور اس جملہ کے مقتضیات و مطالبات کیا ہیں؟ یہی وجہ ہے کہ ؎

شرک پیدا ہو گیا توحید رخصت ہو گئی — بے زری نا طاقتی جز و طریقت ہو گئی

اقبال وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی فلسفیانہ شاعری میں معقول و مدلل اور دلنشین پیرایہ میں اِس کلمہ کے جملہ مقتضیات و مطالبات کو پیش کر کے امت مسلمہ کو ایک نئی زندگی کی دعوت دی ہے اور مسلمانوں کے دل و دماغ کو مسلمان بنانا چاہا ہے۔

اقبال کے نزدیک تعلق باللہ کی حقیقت تک پہنچنا گویا عروجِ انسانی کا کمال ہے اور خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنھوں نے اس گوہرِ مقصود کو پالیا۔ وہ کہتا ہے اِس متاعِ بے بہا کا حصول ہدایت آسمانی کی روشنی اور اتباعِ نبوت کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ حقیقت دیکھنے کی چیز ہے سمجھنے کی نہیں۔ قرآن حکیم نے ایمان بالغیب کے فلسفہ میں اِنسانی عقل و ادراک کی کمزوری و نارسائی کا اعلان کرتے ہوئے دنیا والوں کو بتلا دیا ہے کہ خداشناسی ذہنی وادراکی کیفیت کا نام نہیں بلکہ روحانی مشاہدے کی تعبیر ہے۔ چنانچہ مرید ہندی پیر رومی سے اس سلسلہ میں اِستفسار کرتے ہیں کہ انسانی اِرتقاء کا مقصد و منتہیٰ علم حقیقت ہے یا دیدارِ حقیقت؟

خاک تیرے نُور سے روشن بصر　　غایت آدمؑ خبر ہے یا نظر

اس کے جواب میں اِرشاد ہوتا ہے ؎

آدمی دیداست باقی پوست است　　دید آن باشد کہ دید دوست است

اِنسانی زندگی پر عقیدۂ توحید کا اثر

لا الٰہ الا اللہ کے اقرار سے انسان پر ایک وجد آور کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

اِس سلسلہ میں اقبالؒ نے سب سے پہلے اس چیز کو ذہن نشین کرایا ہے کہ اِسلام کی تعلیم میں ایمان باللہ سب سے اہم اور بنیادی چیز ہے۔ یہ اسلامی اعتقادات و احکام کا مرکز، اس کی جڑ اور اس کی قوت کا منبع ہے، اِسلام کے تمام قوانین اسی ایک بنیاد پر قائم ہیں اور سب کو اسی مرکز سے قوت پہنچتی ہے فرماتے ہیں ؎

دیں ازو حکمت ازو آئیں ازو　　زور ازو قوت ازو تمکیں ازو

یہ کلمہ انسان کو اس کے اصلی مقام سے واقف کرتا ہے، اس میں اِنتہا درجہ کی خودداری اور عزتِ نفس پیدا کر دیتا ہے، اِس لئے کہ اس پر اِعتقاد رکھنے والا جانتا ہے کہ انسان تمام مخلوقات کا آقا ہے، وہ تمام مخلوقات سے اشرف ہے، مخلوقات میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کو انسان اپنا خدا بنائے اور کسی کے آگے جھکے۔ صرف ایک خدا ہی تمام طاقتوں کا مالک ہے اُس کے سوا کوئی نفع و نقصان پہنچانے والا نہیں۔ موت و حیات، عزت و ذلت اور نفع و نقصان سب کچھ اللہ ہی کے ہاتھ ہے۔ پس اس کی گردن کسی مخلوق کے آگے نہیں جھک سکتی۔ فرماتے ہیں ؎

آنکہ ذاتش واحد است و لا شریک — بندہ اش ہم در نسازد با شریک

مومنِ بالائے ہر بالا ترے — غیرت او بر نتابد ہمسرے

ایک مومن کی شان یہ ہے کہ اس کا سر سوائے خدا کے اور کسی کے سامنے نہ جُھکے ؎

پیشِ فرعونے سرش افگندہ نیست — ما سوی اللہ را مسلمان بندہ نیست

اِس لئے کہ دنیا کی ہر چیز اس کے لئے ہے اور وہ کسی کے لئے نہیں۔ ؎

نہ تو زمین کے لئے ہے نہ آسمان کے لئے

جہان ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

متاعِ دنیا کے فلسفہ کا ایک پہلو یہ ہے کہ دنیا ایک متاع ہے۔ اب یا تو اس کی غلامی میں عمر بسر کی جائے۔ یا اُسے اپنے قبضہ و اختیار میں لے لیا جائے تاکہ دُنیا کے اِنسانوں کو انسانوں کی غلامی و بادشاہی سے نکال کر خدا کی حکومت و بادشاہی میں لے آیا جائے۔ اِقبال کہتا ہے ؎

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

عقیدۂ توحید انسان میں احساسِ خودداری اور عزتِ نفس کو کتنا اُبھارتا ہے ؎

مسلم استی بے نیاز از غیر شو | اہلِ عالم را سراپا خیر شو
پیشِ منعم شکوۂ گردوں مکن | دست خویش از آستیں بیروں مکن
چون علیؓ در ساز بانانِ شعیر | گردنِ مرحب شکن، خیبر بگیر
منت از اہلِ کرم بردن چرا | نشتر لا و نعم خوردن چرا
رزقِ خود را از کفِ دوناں مگیر | یوسف استی خویش را ارزاں مگیر

قرآن مجید کی رو سے موحد وہ ہے جو صرف ایک قادرِ مطلق عالم الغیب خدا پر ایمان رکھتا ہو اور اس کے سوا کسی کو اپنا خالق، مالک، حاکم، رازق، کفیل، کارساز، دستگیر، حافظ ناصر اور مستعان نہ سمجھتا ہو اور صرف اسی ایک کا ہو جائے ؎

چوں مقامِ عبدہٗ محکم شود | کاسۂ دریوزہ جامِ جم شود
قوم را اندیشہا باید یکے | در ضمیرش مدعا باید یکے

اگر مسلمانوں کی نظروں سے فکر و عمل کی یہ بلندی اُوجھل ہو جائے تو انکی زندگی سے موت اچھی ہے ؎

اے طائرِ لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

لا الٰہ الا اللہ کا اعتقاد سوائے خدائے واحد کے کسی کو حکومت کا حق نہیں دیتا۔ اُس اعتقاد کی رُو سے کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ بذاتِ خود انسانوں کا حکمران

بن جائے پس اس اعتقاد کی رُو سے خدا کے سوا کسی کی غلامی جائز نہیں ہے

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے   حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

یہی وجہ ہے کہ اقبال اِس ترقی اور آزادی کا طالب نہیں جو حکمران عطا کریں

خریدے نہ جس کو وہ اپنے لہو سے   مسلماں کو ہے ننگ وہ بادشاہی

وہ اِس آزادی کو آزادی نہیں سمجھتا جو ہر فردِ بشر کو شترِ بے مہار

بنا دے ہے

اس قوم کی ہے شوخیٔ اندیشہ خطرناک   جس قوم کے افراد ہوں ہر بند سے آزاد

اقبال کو محض وہ ترقی اور آزادی مطلوب ہے جو اسلام کے ذریعہ

حاصل کی جائے اور جس کی بنیاد اس اعتقاد پر ہو کہ " مسلم خدا کے سوا کسی

کا محکوم نہیں " ہے

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر

میری دانش ہے افرنگی میرا ایمان ہے زناری

پس اگر مسلمانوں کو ترقی اور آزادی مطلوب ہے تو انہیں چاہیئے

کہ اپنے اندر توحید کی روح پیدا کریں اور دنیا کے موجودہ شیطانی نظام کو

تہ و بالا کر دیں ہے

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام   دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

ہر نئی تہذیب کو لازم ہے تخریب تمام   ہے اسی میں مشکلاتِ زندگانی کی کشود

لا اِلٰہ الا اللہ سے مسلمانوں کو یہی سبق ملتا ہے کہ وہ دنیا سے غیر اللہ کی

حاکمیت و حکومت مٹا کر حکومت الٰہی کو قائم کریں ہے

صنم کدہ ہے جہاں آذر مردِ حق ہے خلیل   یہ نکتہ وہ ہے جو پوشیدہ لا اِلٰہ میں ہے

انقلابی کلمہ

اقبال جانتا ہے کہ صدیوں سے مسلمان اس چیز کو بھولے ہوئے ہیں کہ اسلام ایک انقلابی نظریہ و مسلک کا نام ہے اور دُنیا کے تمام ظالمانہ اور مفسدانہ نظامات کو ہٹا کر اُن کی جگہ اپنا ایک اصلاحی پروگرام نافذ کرنا چاہتا ہے اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا حقیقی مدعا و مقصود یہی ہے اس لئے وہ مسلمانوں کو یہی مقصود و مدعا سمجھاتا ہے. وہ یہ بھی جانتا ہے کہ خدا ان کی ہی مدد کیا کرتا ہے جو دست سوال نہیں بلکہ دست طلب بڑھائیں سروری و جہانبانی انہی کے لئے ہے جو جد وجہد اور سعی کرتے ہیں، جو جانی اور مالی قربانیاں کرنا اور پہاڑوں سے ٹکرا جانا جانتے ہیں جو زمانہ کی رو کے ساتھ ساتھ نہیں بہتے بلکہ نا مساعد حالات اور ناموافق ماحول کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں اسی لئے وہ کہتا ہے ؎

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز　　　زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

اس مقام پر پہنچ کر اقبال دیکھتا ہے کہ قریب قریب اسلام کے تمام نام نہاد مفکر اور کشتیٔ مسلم کے ناخدا اس چیز کو بھولے ہوئے ہیں کہ اسلام ایک انقلابی نظریہ و مسلک ہے اور وہ زمانہ سے جنگ آزما ہونے کے بجائے قوم کو یہ درس دے رہے ہیں "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" یہ دیکھکر اُس کے سینہ سے ایک آہ نکلتی ہے اور وہ چیخ اُٹھتا ہے ؎

چنیں دور آسماں کم دیدہ باشد　　　کہ جبریل امین را دل خراشد
چہ خوش دیرے بنا کردند آنجا　　　پرستد مومن و کافر تراشد

وہ اسلام کے رہنماؤں کو ایک لاہوتی ڈانٹ دیتا ہے ؎

فتاوی از مقام کبریائی　　　حضور دوں نہادال سر نہادی

سجودے آوری دارا و جم را　　　　کمن اے بے خبر رسوا حرم را

مسلمانوں کے جو زعماء انگریز کی گود میں سو جانا چاہتے ہیں، اُن سے کہتا ہے ؎

مبر پیش فرنگی حاجتِ خویش　　　　ز طاق دل فرو ریز ایں صنم را

اُن کے مقابلہ میں جو لوگ اپنے آپ کو کانگریس کے رحم و کرم پر چھوڑ رہے ہیں، اُن سے پوچھتا ہے ؎

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی　　　　مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

جب ان سیاسی قائدوں کا جائزہ لے کر وہ صوفی و ملا کی بارگاہِ عالی میں پہنچتا ہے تو اُسے نظر آتا ہے کہ اللہ والے عزلت و تنہائی کے گوشوں میں بیٹھے ہوئے نذر و نیاز کے سلسلہ میں مگن ہیں اور حال و قال و سماع و نغمہ کی محفلیں گرم ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی دنیا کی جد و جہد میں حصہ لینے سے روک رہے ہیں، زندگی کی کشمکش سے ڈرے بیٹھے ہیں اور ہاتھ پاؤں توڑ کر ایک جگہ بیٹھ رہنے کی تلقین کر رہے ہیں۔ جب وہ ان اللہ والوں میں بھی مردِ مومن کی نگاہ اور مسلم کا عزم و ہمت نہیں دیکھتا تو اِن سے بھی بیزار ہو جاتا ہے اور کہتا ہے ؎

نہ با صوفی نہ ملا نشینم　　　　تو میدانی کہ من آنم نہ اینم
نویس اللہ بر لوحِ دلِ من　　　　کہ ہم خود را ہم اورا فاش بینم

جو لوگ اِن مہدیوں کی عقیدت و ارادت کے چنگل میں پھنس کر اپنی دنیا اور آخرت برباد کر رہے ہیں، اُن کی آنکھیں کھولنے کے لئے کہتا ہے ؎

نماز و روزہ و قربانی و حج　　　　یہ سب باقی ہیں تُو باقی نہیں ہے

آہ! اسلام کی وہ روح حقیقت کہاں جس کا سبق لا الہٰ الا اللہ میں دیا گیا ہے۔ ؎

قلندر جز دو حرف "لا الہٰ" کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

پوری قوم کو اپنے مقام سے یوں گرا ہوا دیکھکر ہمارا شاعر مایوس نہیں ہوتا۔ بلکہ کہتا ہے ؎

اگر کوئی شعیب آئے میسّر
شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

وہ شعیب سے بھی کہتا ہے کہ راہی کی کم کوشی دیکھ کر مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ ؎

نومید نہ ہو ان سے اے رہبر فرزانہ
کم کوش تو ہیں لیکن بے ذوق نہیں راہی

بلند خیال اقبال راہی کی کم کوشی سے مطلق ہراساں نہیں ہوتا۔ کہتا ہے ؎

جہاں نو ہو رہا ہے پیدا وہ عالم پیر مر رہا ہے
جسے فرنگی مقامروں نے بنا دیا ہے قمار خانہ
ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں اندازِ خسروانہ

آہ! آج اقبال ہم میں نہیں جس نے ہمیں درس توحید دیکر ہماری ہمتوں کو یوں بلند کیا تھا اور صراطِ مستقیم سمجھائی تھی۔ ہاں دو چار ایسے مردان حق آگاہ ہماری قوم میں اب بھی موجود ہیں جو تند و تیز ہوا میں اپنے چراغ جلا رہے ہیں۔ اب اگر قوم کی فطری صلاحیتیں بالکل ہی مفقود نہیں ہو گئی ہیں تو وہ ان مردانِ کامل کو

ڈھونڈھ لے۔

خلاصہ ما فی الباب یہ کہ اقبال کے نزدیک سلمانوں کو لاالٰہ الا اللہ کی تفسیر کتابوں میں پڑھنے کی ضرورت نہیں، اُن کے نزدیک شہادت حسین اِس کلمۂ طیبہ کی زندہ تفسیر ہے۔ امام عالی مقام نے اپنے طرزِ عمل سے سلمانوں کو اس کلمۂ کے حقیقی معنی سے آگاہ کردیا اور وہ یہ ہیں:- کہ خدا کے سوا کسی کی اِطاعت نہ کرو، خدا کے سوا کسی سے مت ڈرو۔ جو تم کو خدا کی اِطاعت سے ہٹانا چاہے اس کا مقابلہ کرو اور جان تک دیدو۔ یہی توحید کے حقیقی معنے ہیں ؎

نقش الا اللہ بر صحرا نوشت　　　سطر عنوان نجاتِ ما نوشت

بس اِس میں سلمانوں کی عظمت کا راز مضمر ہے۔ اور یہی نجات اخروی کی کنجی ہے علامۂ اقبال رحنے اِس نکتہ کو دو لفظوں میں یوں سمجھا دیا ہے ؎

عاشقی توحید را بر دل زدن
وانگہے خود را بہر مشکل زدن

نیر الدین کاتب حیدرآبادی